فمنهم من قضى نحبه و منهم من ينتظر

تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے

(جلد دوم)

تالیف:

محمد طاہر جمال ندوی

ناشر:

دار البحوث و المناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلا دیش۔

چاٹگام، بنگلا دیش۔

کتاب	:	تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے جلد دوم۔
مؤلف	:	محمد طاہر جمال ندوی، فاضل دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، انڈیا۔
بار اول	:	دسمبر: ۲۰۲۳ء
بار دوم	:	۱۰ / ۰۶ / ۲۰۲۶
تعداد	:	۱۰۰۰ (ایک ہزار)
قیمت	:	۵۰۰ر ٹاکا، بنگلہ دیشی۔ ۳۰ر ریال سعودی
کمپوز	:	محمود العالم (اندر قلعہ، چاٹگام، بنگلا دیش)
ناشر	:	دار البحوث والمناصرة الاسلامية چاٹگام، بنگلا دیش
ملنے کے پتے	:	0088-01533091784
Email	:	tahernadwi@gmail.com

انتساب:

میں اپنی اس حقیر کاوش کو سرزمین ارکان کے مایۂ ناز فرزندِ ارجمند، قائدِ ملت وقوم اور مجددِ تحریکِ آزادیٔ ارکان محمد جعفر حبیب رحمۃ اللہ علیہ کے نام انتساب کرنے کو اپنی سعادت محسوس کر رہا ہوں، جن کی ان تھک کوشش و کاوش اور پیہم سعی و جستجو سے ارکان میں تحریکِ آزادی کی تجدید ہوئی اور آئے دن اس کی آبیاری ہوئی ہے، اللہ تعالی آپ رحمۃ اللہ علیہ کے درجات کو بلند فرمائے، آمین یارب العالمین۔



خاکسار:

محمد طاہر جمال ندوی

۲۲/نومبر/ ۱۹۲۳ء

چاٹگام، بنگلادیش۔

فہرست

تاریخ ارکان کے درخشان ستارے جلد۔(۲)

عرض ناشر

برادر محترم مولانا محمد طاہر جمال ندوی (فاضل جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ہند، وتلمیذ خاص مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت ہمارے دینی وروحانی ،علمی وثقافتی ،فکری وسیاسی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ،آپ ایک قابلِ القدر عالم دین ،معروف ادیب و قلم کار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نامور مفکر مورخ بھی ہیں ،جن کی چند تصانیف ماشاء اللہ چھپ کر منظر عام پر آچکی ہیں ،اور بہت ساری تصانیف اب تک زیرِ طبع وزیرِ نظر بھی ہیں۔

مولانا محمد طاہر جمال ندوی بن الحاج مولانا حافظ جمال الدین احمد کی ولادت ۵ / ۵ / ۱۹۶۶ء میں بستی باغگونہ علی چنگ ہوئی ، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری پرائمری اسکول سے پاکر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے ثانویہ تک کی تعلیم پاکر دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام میں ایک سال حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی اور حضرت مولانا فرقان اللہ خلیل صاحب سے پڑھا ،اس کے بعد جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں سے کلیۃ الادب العربی سے ماجستر کر کے ۱۹۹۱ء میں سند فراغت حاصل کی۔

مولانا محترم فراغت تعلیم کے معابعد بنگلا دیش آئے اور یہاں کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے ،جن میں دارالانصار چاٹگام قابل ذکر اور ناقابل فراموش درسگاہ ہے ، پھر چند سال پڑھانے بعد آپ نے حجاز مقدس کا سفر کیا ، جہاں آپ نے چند سال گزارے ،اس کے بعد دوبارہ بنگلا دیش آئے ہوئے ہیں ، حالیا تصنیف وتالیف میں مصروف اور سرگرم عمل ہیں ،الحمد للہ مولانا کی چند مطبوعہ اور غیر مطبوعہ گرانمایہ تصانیف ہیں ،جن میں سے کچھ یہ ہیں:

☆ سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں۔
☆ سازش کا طوفان عقلیت ومادیت کے روپ میں۔
☆ روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے۔

☆ تذکرۂ علامہ سید الامینؒ۔

☆ تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبد السلام ارکانیؒ۔

☆ روہنگیا مسلمان اور ان کی ہجرت کے اسباب۔

☆ ارکان کے عظیم شاعر علاول، حیات و کارنامے۔

☆ ارکان روہنگیا یونین، ماضی اور حال کے تناظر میں۔

☆ روہنگیا چیخ و پکار اور مطالبات (ترجمہ)۔

☆ وادیٔ پرخار کے گمنام مسافر۔

☆ سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ۔

☆ سرخیل کارواں۔

☆ جمعیت علمائے اسلام ارکان۔

☆ روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ۔

☆ روداد سخن۔

☆ نقوش خیال۔

☆ حیاتِ نور۔

☆ حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس۔

☆ برما میں خانہ جنگی کا دور دورہ۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۲)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۳)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۴)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۵)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۶)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۷)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۸)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۹)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۰)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۱)۔

☆ سرزمین ارکان کے درخشان ستارے (جلد ۱۲)۔

مولانا کی ان تمام تصانیف میں سے سب سے مقبول ترین تصنیف ''سرزمین ارکان کی تحریکِ آزادی تاریخی پس منظر میں'' جو دسمبر ۱۹۹۹ء میں پہلی مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی، اور دوسرا ایڈیشن زیر طبع ہے، جس کے متعلق مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ: ''فاضلِ عزیز مولوی محمد طاہر جمال ندوی شکر و سپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت و لیاقت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا، اپنے وطن کا حق ادا کیا، اور تاریخ کے خلا کو پر کیا، جو عرصہ سے پایا جاتا تھا''۔

مولانا کی زیر نظر تصنیف ''تاریخ ارکان کے درخشاں ستارے جلد دوم'' بھی ہمارے نزدیک ایک شاہکار تصنیف ہے، جسے آپ نے بڑی محنت، لیاقت اور عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے، اس میں کسی قسم کی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ نے اپنی دیگر تصانیف کی طرح اس سوانحی تصنیف کو بھی ایک ملی فریضہ اور قومی خدمت کے بطور اور بقول آپ کے ایک سعادت سمجھ کر لکھا ہے، اور اس کی تکمیل کی راہ میں آپ نے جو تکلیفیں، صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں ان کے اجر و معاوضے صرف اور صرف ذاتِ خداوندی کی طرف سے ممکن اور امید ہیں۔

تاہم اس قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ہم اپنی قوم کی طرف سے عصر حاضر کے ہمارے اس عظیم مصنف و قلم کار کو خراجِ تحسین و گل دستۂ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنی خاص رحمت اور فضل و عنایات سے مصنف کی زندگی اور قلمی کاوشوں کو مزید شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین یا رب العالمین

محمد طارق جمال

سکریٹری برائے نشر و اشاعت

دار البحوث والمناصرة الاسلامية

چاٹگام، بنگلا دیش۔

حرفِ آغاز

الحمد لله رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی آله وصحبه اجمعین، ولا عدوان الا علی الظالمین۔ اما بعد:

شک نہیں ہے کہ تاریخ قوم کا آئینہ ہے، آئینے میں جس طرح دیکھنے والوں کو اپنا عکس نظر آتا ہے، ٹھیک اسی طرح قوم اپنی تاریخ میں اپنی قومی زندگی کو دیکھ لیتی ہے، جس کے ذریعے وہ اپنی قومی زندگی کے حال اور مستقبل کو سنور لیتی اور لے سکتی ہے۔

ہمارے بعض لوگوں کا یہ خیال کبھی بھی سچائیت اور زمینی حقائق پر مبنی نہیں ہے کہ روہنگیا قوم کے بزرگوں نے اپنی قوم کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے، جیسا کہ بعض نادان ہمارے بزرگوں پر آئے دن الزام لگاتے پھرتے ہیں، دانشوران کے علی الرغم علمائے دین متین پر بطور خاص الزامات لگاتے نہیں تھکتے ہیں کہ انہوں نے صرف اور صرف دین اور دین داری کے بہانے لوگوں کو لوٹا ہے، مذہب کے لبادے میں اپنے عوام سے عموما اور نئی نسل سے خصوصا دھوکہ اور فریب کیا ہے، اگر یہ لوگ قوم کے لئے کچھ کئے ہوتے تو روہنگیا مسلمانوں کا حال آج ایسا نہیں ہوتا، جیسا آج ہم دیکھ رہے ہیں، اور ڈھنڈورا پیٹتے پھرتے ہیں کہ ہمارے آج کے علماء قومی خدمات کے حوالے کسی کام کے نہیں ہیں، اگر یہ کام کے ہوتے تو روہنگیا مسلمانوں کی تقدیر کب بدل گئی ہوتی۔

دراصل بات یہ ہے کہ نہ قومی خدمات کے حوالے سے ہمارے دانشوران غافل تھے اور نہ علمائے کرام بے خبر، کھلی آنکھ سے مطالعہ کیا جائے تو رات کے اندھیرے میں دیکھا جاسکتا ہے کہ نہ صرف قومی خدمات کے میدان میں ان دونوں طبقوں نے بساط بھر خدمات کیں بلکہ ہمارے روشن ضمیر عوام بھی کسی طرح پیچھے نہیں رہے تھے، اس حوالے سے ہماری خدمات کی تاریخ میں اور تو اور ۱۹۴۲ء کے

بعد سے آج تک دیکھا جاسکتا ہے، کہ ہماری اس طویل تاریخ میں علماء اور دانشوروں کے ساتھ ہمارے عوام نے بھی لازوال قومی خدمات انجام دی ہیں، اس حوالے سے ہزاروں نے جام شہادت پی کر جنت کے اعلی درجات کے مستحق بنے، کوئی غازی بن کر رہتی زندگی میں مزید خدمات انجام دیتے ہوئے راہی ملک بقاء ہوئے، جس کا روشن سلسلہ تا حال الحمد للہ جاری ہے، **فمنهم من قضى نحبه ومنهم من ينتظر وما بدلوا تبديلا۔**

اور اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ سرزمین اسلام ارکان علماء وصلحاء، درویش اور خدا رسیدہ بزرگوں کی سرزمین ہے، جس کے چپے چپے اور گوشے گوشے میں ہمارے ان بزرگوں کی ان گنت خواب گاہیں موجود ہیں، جنھوں نے اس سرزمین کو اسلام کی روشنی اور تابانی سے روشن اور تاباں کیا اور اس گلشن اسلام کی آبیاری اور پاسبانی کی، اور اس کار خیر کے لئے اپنی زندگیاں کھپائیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے تھے، ویسے ہم آج فخر سے سر بلند کر کے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف اور ان کی روشن اور گراں قدر خدمات اور ان کے انگنت کارنامے دنیا کی دیگر زندہ دل قوموں کے اسلاف اور ان کی گراں مایہ خدمات اور کارناموں سے کسی بھی معنی میں کم نہیں ہیں، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے ان کی زندگیاں اور ان کی تمام خدمات اور کارناموں کو شرفِ قبولیت بخشے، اور ان کی بال بال مغفرت کر کے انہیں جنت الخلد میں جگہ عطا فرمائے، پھر ہمیں اپنے ان زندہ دل اسلاف اور بزرگوں کے نقوش قدم پر چلتے ہوئے اسلام اور امتِ مسلمہ بشمول تمام بنی نوع انسان کی خدمات انجام دینے کی توفیق سے نوازے، آمین یارب العالمین۔

لیکن ہمارے لئے یہاں ایک افسوس اور حسرت کا مقام ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کے حالات چاہے اجمالی ہی سہی اپنی آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ نہیں رکھ سکے، آج کل جو حالات ہماری بھولی بسری تاریخ اور سوانحی دستاویزات میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں ان کے متعلق ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دراصل وہ سب ہمارے ان روشن ضمیر بزرگوں کی خدماتِ جلیلہ کا دسواں حصہ بھی نہیں ہیں، حقیقت یہ کہ ہمارے اسلاف سمیت ہماری ماضی کے بزرگانِ دین اتنے مخلص تھے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا، اللہ تعالی کی رضا جوئی اور خوش نودی کے لئے کیا، اور دکھاوے سے ان کے دل ودماغ کوسوں دور تھے، شاید ان کے نزدیک ان کی خدمات اور سرگرمیوں کو آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ رکھنے کی کوئی بھی

کوشش ان کے اخلاص وللہیت کی منافی تھی، اور شاید اس لئے بھی ہو کہ انہوں نے اپنی کسی بھی خدمات ،کارناموں اور سرگرمیوں کی کسی بھی روداد اپنی آنے والی نسلوں کے لئے کہیں بھی محفوظ نہیں رکھی، کہیں آنے والی نسلیں ان کی ریکارڈ کردہ چیزوں کو دیکھ کر یہ خیال نہ کرے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا اللہ تعالی کی خوش نودی اور رضا جوئی کے بجائے لوگوں کو دکھانے اور داد حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔

دراصل بات یہی ہے کہ ہمارے لوگوں کو چاہے ان کا تعلق ماضی سے ہو یا حال سے ریکارڈ رکھنے کی عادت ہی بہت کم ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اسلاف اور بزرگوں کے تاباں اور درخشاں کارناموں کے حوالے سے آج کل جتنی بھی چیزیں ملتی ہیں، ان کا تقریبا نوے فیصد حصہ میرے علم کے مطابق ہماری برادری ''روہنگیا'' کا نہیں بلکہ غیروں کا محفوظ کردہ ہے۔

الا یہ کہ سولہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں تک ہمارے اسلاف اور بزرگوں کی کچھ تحریں اور کچھ ریکارڈ کردہ دستاویزات برصغیر ہند کے بعض کتب خانوں میں محفوظ ہیں، جن میں کلکتہ نیشنل لائبریری میرے نزدیک ناقابلَ فراموش ہے، علاوہ ازیں شنید ہے کہ یہاں کے کتب خانوں کے علاوہ برطانیہ کے دیگر کتب خانوں میں ہماری اس نوعیت کی چیزیں محفوظ ہیں، یہ تو ظاہر ہے کہ برطانیہ سمیت یوروپ والے جن کو علم و ہنر کے حوالے سے ضروری چیزوں کو محفوظ رکھنے کی گویا لت لگی ہوئی ہے، مگر افسوس ہے کہ وہاں کی ساری چیزیں ہم جیسوں کی دسترس سے کوسوں دور اور باہر ہیں۔

بہر حال ۱۹۹۸ء کے دوران میں نے کلکتہ نیشنل لائبریری میں چند دن مطالعے و مراجعے میں گزارے، وہاں سے اپنی بساط بھر استفاہ کیا، اگر ہماری تاریخ، ثقافت اور تہذیب و تمدن کے حوالے سے وہاں پائی جانے والی چیزوں پر مزید مطالعہ کیا جائے (جو بہت اہم اور نہایت ضروری ہے) تو کام کی ایک بڑی بات ہوگی، اللہ کرے کہ ہمارے کسی اہل نظر لکھاری کو اس کی توفیق ہو جائے۔

بطور خاص ۱۹۹۲ء سے لے کر ۱۹۹۸ء تک پھر رہ رہ کر اس کے بعد کے عرصے میں سرزمین ارکان کی تاریخ اور ثقافت کے علاوہ اس علاقے کے حوالے سے دیگر ضروری موضوعات پر بساط بھر مطالعہ کی توفیق ہوئی تھی، اس طویل مطالعہ کے دوران کوشش کی گئی تھی کہ سرزمین ارکان بشمول دیگر علاقہ جات اور خطوں میں مدفون ہمارے اسلاف کی بھولی بسری زندگیاں اور ان کی خدمات و کارناموں کو کسی بھی

طریقے سے محفوظ کرلیا جائے، اس حوالے سے ابھی کوشش شروع کی تو اشہب قلم مسلسل آگے بڑھنے کی جگہ چند قدم چل کر رک سا گیا، اور آگے بڑھنے کے بجائے ہچکولے پر ہچکولے کھاتا رہا تھا، اس حالت میں اللہ تعالی کی طرف رجوع کیا گیا، الحمد للہ جس کی توفیق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نعلین کے صدقے پھر اساتذۂ کرام اور بزرگوں کی دعا اور نیک تمناؤں کی برکت سے اس پر کٹھن اور سنگلاخ میدان میں اگرچہ رک رک کر سہی قدم آگے بڑھنے لگا تھا، اور اپنی مستعار نجی زندگی کے کچھ نجی مصروفیات کے علی الرغم دیگر علمی و قلمی مشغولیات کے ساتھ ہی ساتھ چند سال گزرتے نہ گزرتے ''سرزمین ارکان کے درخشاں ستارے'' کے عنوان سے بارہ ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کام کی چیز مسودہ سے آگے بڑھ کر مبیضہ کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں ایک اور بات جو میرے نزدیک بہت اہم اور قابلِ تذکرہ ہے کہ ان مذکورہ بارہ مجلدات (جن میں ہمارے تقریبا ساڑھے چھ سو سے زائد اعیان کرام کی زندگیاں کسی کی اجمالی اور کسی کی تفصیلی شکل میں محفوظ ہو چکی ہیں) کے علاوہ اس سلسلے اور اسی موضوع کی کچھ اور کوششیں (جن میں سے کچھ چھپ کر منظرِ عام پر آچکی ہیں اور کچھ زیر طبع اور زیر نظر ہیں) ہو چکی ہیں، سرِ دست ان ساری کاوشوں پر کچھ لکھا جائے تو بات بڑی طویل ہونے کا شدید اندیشہ ہے، تاہم قدرے اجمال کچھ یوں ہے کہ؛

(۱) <u>تذکرۂ علامہ سید الامین رحمۃ اللہ علیہ</u>: یہ تصنیف تقریبا ساڑھے پانچ سو صفحات پر مشتمل خاکسار کی ایک ناچیز کوشش کا نتیجہ ہے، جو ۲۰۲۰ء میں ''دار البحوث والمناصرۃ الاسلامیہ چاٹگام، بنگلا دیش'' سے چھپ کر منظرِ عام پر آگئی اور ناظرین کرام کے ہاتھوں ہاتھ پہنچ کر بے حد مقبول ہو چکی ہے، الحمد للہ۔

(۲) <u>تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی رحمۃ اللہ علیہ</u>: یہ راقم کی گراں قدر تصنیف چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل الحمد للہ طبع ہو چکی ہے، ظاہر ہے کہ یہ حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی گودام فاروی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات ہے۔

(۳) <u>سالار کارواں</u>: میری یہ ناچیز کاوش بھی الحمد للہ طبع ہو چکی ہے، تقریبا چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل یہ ہمارے عظیم قائد حضرت محمد جعفر حبیب کجافوی، علی چنگی کا تذکرہ ہے۔

(۴) <u>سرِ خیل کارواں</u>: یہ ہمارے ایک مرد مجاہد (جن کا نام تا حال منظر عام پر لانا مناسب معلوم نہیں ہو رہا ہے) کا تذکرہ اور اس کی نسبت سے قائم زیر زمین کام کرنے والی ایک روہنگیا تنظیم کی حسین و جمیل

اور بڑی دلچسپ روداد ہے، زیر نظریہ کاوش بھی ساڑھے چارسو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔

پھر ایک بات یہ بھی قابلِ تذکرہ ہے کہ ہمارے یہاں دینی نظام تعلیم جسے عمومی طور پر درس نظامیہ کہا جاتا ہے، جو ہمارے مدارس دینیہ کا نظام تعلیم ہے، ہمارے یہاں برطانوی دور حکومت میں بعض مدارس میں عالیہ لائن (جن کی سرپرستی حکومت کرتی تھی اور مدرسہ عالیہ کلکتہ جن کا مرکز تصور کیا جاتا تھا) کے ساختہ پرداختہ کچھ علماء بھی درس دیا کرتے تھے، مگر بعد میں ہمارے ان مدارس میں دارالعلوم دیوبند کا چھاپ نمایاں ہوگیا، اور دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، جامعہ اشرفیہ لاہور، دارلعلوم کراچی، جامعہ اسلامیہ پٹیہ، مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری وغیرے کے مستند فارغین علماء درس دیا کرتے ہیں۔

لیکن دارالعلوم دیوبند کے بعد ولی اللہی مکتب فکر کی اور ایک شاخ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے بہت کم فضلاء ہمارے اس علاقے میں پائے گئے، بس گنے چنے چند بزرگ تھے، جن میں مولانا افلاطون ندوی، مولانا سکندر ندوی، مولانا محمد انور ندوی، مولانا رشید احمد ندوی اور مولانا مشتاق احمد ندوی جیسی قابل ذکر ہستیاں تھیں، اور مولانا رشید احمد ندوی کا جہاں تک تعلق ہے ان کی زندگی تقریبا پاکستان میں گزر گئی، اور مذکورہ تمام کی تمام ہستیاں اللہ کے پیارے ہوگئیں، پھر ہمارے معاصرین میں چند ندوی فضلاء ہیں، جن میں مولانا عتیق الرحمن ندوی، مولانا نورالہدی ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں، اللہ تعالی ان کو جوار رحمت میں جگہ عطا کرے۔

اور باقی راقم سطور سمیت اور چند ندوی فضلاء ہیں، جن میں میرے علم کے مطابق مولانا محمد امین ندوی، مولانا عبدالرحمن ندوی اور مولانا محمد ایوب ندوی حیات سے ہیں، ان میں سے جتنے حیات سے ہیں دعا ہے کہ اللہ تعالی ان ندوی فضلاء کی حیات میں برکت دے اور انہیں دین وملت اور قوم ووطن کی خدمات کے لئے قبول فرمائے، آمین۔

خاکسار:

محمد طاہر جمال ندوی

چاٹگام، بنگلادیش۔

۰۶/۱۰/۲۰۲۳ء

حضرت خیر اللہ شاہ صاحب مرنگناوی علی چنگی، بوسیدنگیؒ:

یہاں کے بزرگوں کی روایت کے مطابق حضرت خیر اللہ شاہ صاحب مرنگناویؒ کا اصلی تعلق شہر بلخ سے ہے، کہتے ہیں کہ آپ بلخ کے شہزادے تھے، دینی تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے کسی ایک بزرگ کے ہاتھ میں بیعت کی اور طویل ریاضت ومجاہدہ کے بعد آپ کو خرقۂ خلافت سے نوازا گیا، اور خلافت عطا ہونے کے بعد آپ کو اپنے شیخ نے ارکان کی سرزمین سپرد کی یوں آپ دعوت دین اور اشاعتِ اسلام کی خاطر ہندوستان ہوتے ہوئے ارکان پہنچے، اور علی چنگ کو اپنی دعوت کے لئے مستقر بنایا۔

یہاں والوں کی عام رویت کے مطابق آپ ساتویں صدی ہجری کے بزرگ ہیں، یہاں پہنچنے کے بعد آپ نے مسلسل چند سالوں تک دشت پیمائی کی، کبھی دیہاتوں اور جنگلوں میں پھرتے رہے، لیکن جہاں بھی گئے علم وعرفان کی شمعیں جلائیں، بالآخر مرنگنا (علی چنگ) میں بیٹھ گئے، اور عرصۂ دراز تک دعوتی سرگرمیاں کرنے کے بعد آپ نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بستی مرنگنا بستی باغکونہ کے جنوب میں مغرب سے مشرق کی طرف رینگتا ہوا ایک چھوٹے سے نہر کے دونوں کناروں پر صدیوں سے آباد ایک قدیمی مسلم بستی ہے، جس کے بالکل آخری مغربی سرا میں کوہِ مایو کے پر رونق اور سدا بہار ڈھلوان پر ایک ٹیلہ ہے، جس پر حضرت کا مزار پاک اب بھی مرجعِ خاص وعام ہے، یاد رہے کہ حضرت کا مزار اب بھی بستی سے دور واقع ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کبھی آپ نے یہاں پہنچنے کے بعد دشت پیمائی کی تھی۔

مقامی لوگوں کی روایت کے مطابق حضرت خیر اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بلند پایہ کے عالم دین حافظ قرآن کریم، داعی الی اللہ، مرشدِ کامل اور صاحب نسبت بزرگ تھے، آپ نے اپنے مرشد کے حکم کی تعمیل پر صرف اور صرف دعوتِ دین متین اور خلق خدا کی ہدایت ورشد کی خاطر ترک وطن کیا اور ارکان میں جلوہ افروز ہوئے، کہتے ہیں کہ آپ یہاں پہنچنے کے بعد پہلے پہلے بیعت وتلقین سے گریز کیا کرتے تھے، لیکن بعد میں بیعت وتلقین کا سلسلہ بڑی شان سے شروع کیا تھا۔

روایت ہے کہ حضرت خیر اللہ شاہ صاحبؒ پہلے پہلے ارشاد اور پند ونصیحت پر اکتفاء کیا کرتے تھے، لیکن اس دوران اللہ تعالی کی قدرت وکرشمہ سے حضرت شاہ صاحب سے یکے بعد دیگرے

چند کرامات اورخرق عادتیں صادر ہوئیں تو لوگ آپ کے پیچھے ہو گئے، اور آپ کے مرتبے اور شان کو جان کر آپ سے بیعت کے لئے اصرار پر اصرار کرنے لگے تھے، بالآخر آپ نے بیعت وارادت کا سلسلہ شروع کیا، اور لوگ پے در پے آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے لگے، روایت یہ بھی مشہور ہے کہ آپ کے حلقۂ ارادت میں انسانوں کے علاوہ جنات کی بھی ایک بڑی جماعت تھی، ویسے کہتے ہیں جنات اور ان کی اولاد اب بھی آپ کی زیارت کو آیا کرتی ہیں، اس حوالے سے بہت سے لوگوں نے اپنی اپنی عینی مشاہدات کے احوال بیان کئے ہیں، حتی کہ یہاں تک بتایا ہے کہ بطور خاص رات کو ڈھور ڈنگروں کی شکل میں جنات یہاں زیارت کو آتے ہیں، اس لئے رات یہاں اب بھی خاص مجاور کے سوا کسی انسان کا ٹھہرنا آسان نہیں ہے۔

دوسری ایک روایت یہ بھی ملی ہے کہ آپ جب ہندوستان سے ہو کر چاٹگام پہنچے تو وہاں کے چند دن کے قیام کے دوران آپ سے چند کرامات ظاہر ہوگئیں، جس کے بعد ایک بڑی جماعت نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس کے بعد آپ اپنے بہت سارے مریدین ومتعلقین سمیت ارکان آئے اور قصبہ علی چنگ کو اپنی دعوت وارشاد کا مرکز بنایا، پھر آپ کے بہت سے خلفاء یہاں سے آپ کے حکم پر ارشاد وتلقین کے لئے ارکان کے دیگر علاقہ جات میں پھیل گئے تھے۔

آپ نے بستی مرنگنا والے اس مذکورہ ٹیلے کو اپنے خانقاہ کا درجہ دیا اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک اسی خانقاہ میں بیٹھ کر دین ودعوت اور تبلیغ وارشاد کا کام کیا تھا، یہیں آپ کی وفات ہوئی اور اسی ٹیلے میں مدفون ہوئے، جو اب بھی زیارت گہ خاص وعام ہے۔

پتہ چلا کہ آپ ایک بلند مرتبہ کے صاحب نسبت اور صاحبِ کشف وکرامات بزرگ تھے، مقامی روایت کے مطابق آپ بڑے متواضع، منکسر المزاج، حکیم اور دانا بھی تھے، آپ ہر حال میں لوگوں کے دکھ درد میں شریک ہوا کرتے تھے، بڑے حق شناس، رحم دل، اور سخی بھی تھے، کہتے ہیں کہ آپ کے دربار سے کوئی بھی انسان خالی ہاتھ نہیں جاتے تھے، کسی بھی قیمت پر آپ لوگوں کو سہارا دیا کرتے تھے۔

اس سلسلے میں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ کسی بھی مصیبت اور آزمائش کے حالات میں آپ کے مزارِ پاک میں حاضری دیتے، آپ کے توسل سے خود بھی دعائیں کرتے اور دوسروں سے

دعائیں کراتے تھے، تاہم یہاں اس بات کا برملا اظہار کر دیتا ہوں کہ میں سر دست اس مسئلہ پر الجھنا نہیں چاہتا کہ آیا توسل کا مطلب کیا ہے، توسل کرنا جائز ہے یا نا جائز؟ یہاں اس مقام پر میں ایک راوی ہوں، لوگوں کے حالات من وعن بیان کرنے والا ہوں بس۔

یاد رہے کہ ہمارے علاقے میں ایک صاحب سرکاری پرائمری اسکول کے ماسٹر تھے، جو پاؤں کے معذور لیکن بڑے پائے کے بزرگ اور اعلی صفات والے منش تھے، وہ جہاں بھی جاتے حضرت شاہ خیر اللہ صاحبؒ کے تذکرے کرتے پھرتے تھے، میں نے ان ماسٹر صاحب کی زبانی حضرت شاہ صاحب کی بہت ساری کرامات اور خوارقِ عادات کی باتیں سن رکھی تھی، لیکن طوالت کے خوف سے یہاں نہیں لائی گئیں، اللہ تعالی ان ماسٹر صاحب کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

حضرت کرم علی شاہ صاحب بانگونوی علی چنگی، بوسیدنگیؒ:

مقامی لوگوں کی روایت کے مطابق سولہویں صدی عیسوی کے نامور علی چنگی بزرگ حضرت کرم علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے صاحب نسبت وصاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، جن کی جائے پیدائش کے حوالے سے یہاں تین روایات پائی جاتی ہیں:

۱۔ یہاں کے مقامی بعض لوگوں کے مطابق آپ کا خاندان اور آپ کی جائے پیدائش کیوکتو یا کیوکپر و تھی، آپ کا خاندان وہیں رہ گیا اور صرف خلق خدا کی رشد وہدایت کی خاطر آپ علی چنگ آئے اور آخر کار یہاں کی خاک کو اپنے مبارک سینے سے لگا لیا۔

۲۔ بعض مقامی لوگوں کے مطابق آپ کے خاندان کا اصلی تعلق علی چنگ ہی سے ہے، کسی زمانے میں آپ کے خاندان کے کچھ بزرگ نقل مکانی کر کے کیوکتو یا کیوکپر و گئے اور آپ وہیں پیدا ہوئے، اور بعد میں آپ نے اپنے اصلی آبائی علاقے کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا تھا۔

۳۔ لیکن مذکورہ دونوں روایات سے ہٹ کر بعض مقامی محققین کا کہنا ہے کہ آپ کے خاندان کا تعلق کیوکتو یا کیوکپر و سے تھا اور نہ آپ کی پیدائش وہیں ہوئی، بلکہ کبھی بھی آپ ان علاقہ جات کی طرف نہیں گئے تھے، غرض آپ اور آپ کے خاندان کا تعلق علی چنگ سے ہے، اور آپ کی پیدائش بھی یہیں ہوئی اور ظاہر ہے کہ آپ کا مدفن بھی یہیں ہے۔

مقامی محققین کے مطابق آپ کی تعلیم وتربیت علی چنگ میں ہوئی، شاید یہاں کی مقامی کسی بزرگ یا اپنے استاد کی تعلیم، تربیت اور توجہ کا اثر ہو کہ طالب علمی کے دوران آپ پر تصوف کا غلبہ ہوا اور آپ پر جذب ومستی کا حال طاری ہو گیا تھا، بعد میں اس میں کافی کمی آئی اور آپ نے دعوت وارشاد کی طرف توجہ دی تھی۔

بعض محققین کا کہنا یہ بھی ہے کہ آپ نے کچھ دینی تعلیم کے حصول کے بعد علاقے میں اس زمانے میں پائے جانے والے بہتوں بزرگان دین کے دربار میں حاضریاں دیں، بالآخر ایک بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کی اور خلافت کے بعد آپ دعوت وارشاد کے کاموں میں مگن ہو گئے تھے۔

کچھ مقامی لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ علاقے سے کچھ دینی تعلیم کے حصول کے بعد آپ نے مشرقی بنگال کا سفر کیا اور چاٹگام کی کسی خانقاہ سے مستفید ہو کر خرقۂ خلافت حاصل کر کے وطن واپس آئے اور

اپنے آبائی علاقے کو اپنی دعوت کا مرکز بنایا تھا۔

جہاں تک پتہ چلا کہ آپ پر زندگی کے آخری ایام تک کبھی کبھار جذب ومستی کا حال طاری ہوتا رہا تھا، ایسی حالت میں آپ اکیلے جنگل کو نکل جاتے تھے، پھر جبھی افاقہ ہوتا تو آپ دوبارہ اپنے مستقر میں لوٹ آتے اور رشد وہدایت کے کاموں میں مگن ہو جاتے تھے۔

جو کچھ بھی ہو کہ یہ حقیقت ظاہر ہے کہ آپ نے خلق خدا کی رشد وہدایت کے لئے محلہ مورا فارہ بانگو نہ کو مرکز بنایا تھا اور اسی بستی کے تھوڑے فاصلے پر جانبِ مغرب نہر ''کیتا کیا'' کے قریب کسی قدر ایک ویران جگہ میں آپ نے اپنی خانقاہ تعمیر کی، اور زندگی کے آخری ایام تک اسی میں بیٹھے خلق خدا کی ہدایت ورشد کا سلسلہ جاری رکھا اور آخر کار یہیں وفات پائی اور یہیں کی خاک کو اپنے مبارک سینے سے لگا لیا۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں کو بیعت کے ذریعے اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے تھے، کہتے ہیں کہ آپ کے بہت سارے خلفائے کرام ارکان کے دیگر علاقہ جات میں پھیل گئے اور ان ساروں نے رشد وہدایت کے ذریعے دینی وروحانی فریضے انجام دیئے تھے۔

روایت جہاں تک سنی گئی اس کے مطابق حضرت کرم علی شاہ صاحب ایک قابل قدر شیخ طریقت اور صاحب کشف وکرامات بزرگ تھے، اس حوالے سے میں نے بہت ساری کہانیاں سن رکھی تھیں، لیکن طوالت کے خوف سے یہاں درج کرنے سے قاصر ہوں۔

بہر حال آپ کے مزار پاک یہاں اب بھی جوں کا توں موجود ہے، نہ صرف علاقے کے لوگ بلکہ دور دراز کے علاقہ جات سے بھی لوگ آپ کی زیارت کو آتے رہتے ہیں۔

حضرت کرم علی شاہ صاحب کے خاندان اب بھی اس بستی میں موجود ہے، جس میں سے چند نامور علمائے دین متین ہمارے زمانے میں بھی موجود تھے، یہاں جتنی باتیں درج کی گئی ہیں سب کے سب ان علمائے کرام کی زبانی ملی ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت اور حضرت کے خاندان کے تمام علمائے کرام کو مزید دین کی خدمات کے لئے قبول فرمائے، آمین۔

حضرت شاہ عبداللطیف حجازی صاحب کجافوی علی چنگی، بوسیدنگیؒ:

حضرت قائد قوم محمد جعفر حبیب رحمۃ اللہ علیہ کی خاندانی روایت کے مطابق حضرت شاہ عبداللطیف حجازیؒ کی پیدائش عرب کی سرزمین مقدس حجاز پاک میں ہوئی، نشوونما اور دینی تعلیم بھی وہیں ہوئی، کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے خاندان یا گھرانے کو لے کر حجاز مقدس سے یمن آئے، پھر یہاں سے تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کی نیت سے بذریعۂ بحری جہاز مشرقی بنگال کے معروف علاقہ چاٹگام پہنچے، اور جنوبی چاٹگام کی بستی بیولا فارہ میں چند سال سکونت پذیر رہے، کہتے ہیں کہ یہاں آپ نے تبلیغ دین کے ذریعے انسانوں کی ایک بڑی تعداد کو راہِ راست پر لا یا تھا۔

پھر آپ نے تبلیغ دین اور اشاعتِ اسلام کی نسبت سے چاٹگام سے ارکان جانے کا فیصلہ کیا، یوں اپنے پورے خاندان کو لے کر شہر بوسیدنگ کے جنوب میں واقع علاقہ علی چنگ کی بستی کجافہ آئے، اس بستی کو آپ نے اپنی سابقہ سکونت بیولا فارہ کی یاد پر ''بیولا فارہ'' رکھا، آج بھی یہ بستی اسی نام سے معروف ہے۔

کہتے ہیں کہ حضرت شاہ عبداللطیف حجازیؒ ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم المرتبت داعیٔ الی اللہ تھے، اور صاحب دل درویش اور صاحب کشف وکرامات بزرگ بھی، آپ نے بیولا فارہ میں سکونت پذیر ہوکے اس علاقے میں دعوتِ دین کے حوالے سے وہ کام سرانجام دیئے جو ایک عالم دین داعی اور خدا رسیدہ بزرگ سے ہی ممکن ہے، آپ نے اس علاقے میں دعوتِ دین کے تہ بتہ اسلامی تعلیم کے فروغ کے لئے بہت سارے مدرسے قائم کئے اور خانقاہی روایت کو فروغ دیتے ہوئے خانقاہی نظام کا جال پھیلا دیا تھا، جس کی وجہ سے یہاں کے باشندوں کو دینی، روحانی، علمی، ثقافتی، تعلیمی اور تدریسی اعتبار سے بہت ہی فائدے پہنچے تھے، جن کے اثرات آج بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔

اللہ تعالی نے حضرت حجازی کی اولاد میں بڑی برکت دی، آپ کی اولاد میں آپ کی طرح بڑے بڑے علماء، صلحاء، خدارسیدہ درویشان، اولیاء اللہ، دعاۃ ومرشدین قوم اور خدامانِ وطن پیدا ہوئے، کہتے ہیں کہ حضرت حجازی نے بھرپور عمر پائی تھی اور بیولا فارہ میں وفات پاکر اسی خاک میں مدفون

ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت حجازی کے دو صاحب زادے تھے، ایک کا نام محسن علی جب کہ دوسرے کا نام صمد علی تھا۔

<u>محسن علی مرحوم اور ان کی اولاد واخفاد:</u>

خاندانی روایت کے مطابق حضرت محسن علی بڑے درجہ کے درویش اور خدا رسیدہ بزرگ تھے، بعض حضرات کا کہنا ہے کہ آپ نے اپنے بزرگ والد حضرت شاہ عبداللطیف حجازیؒ سے دینی تعلیم کے علاوہ سلوک وطریقت کی منازل بھی طے کی تھیں، بہر حال جو کچھ بھی ہو لیکن یہ بات طے ہے کہ حضرت محسن علی نے اپنے والد بزرگوار کی طرح اس علاقے میں دین وملت اور قوم کی بڑی بڑی خدمات کیں، آپ نے مدارس، مساجد اور خانقاہوں کے علاوہ علماء وصلحاء اور عام مسلمانوں کی خدمات انجام دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، آپ نے اپنے والد کی طرح بھرپور عمر پائی اور بیولا فارہ میں وفات پاکر یہاں کی قبرستان میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت محسن علی کے دو بیٹے تھے، ایک کا نام غلام علی جب کہ دوسرے کا نام کرم علی تھا۔

☆ <u>غلام علی صاحب مرحوم</u>: غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی ایک بڑے پائے کے عالم دین تھے اور ساتھ ساتھ ایک داعیٔ الی اللہ بھی، جن کی اولاد میں صرف ایک بیٹا معروف ہے، جس کا نام علیم الدین تھا، اور اسی علیم الدین کی اولاد درج ذیل ہیں:

۱۔ حضرت مولانا شاہ عبدالباری معروف بہ بڑے مولوی صاحب، جن کا اجمالی تذکرہ انشاء اللہ اگلی سطور میں آئے گا۔

۲۔ جناب عبدالعزیز مرحوم، ان کی اولاد میں حضرت مولانا مفضل احمد صاحبؒ ایک جلیل القدر اور ناقابلِ فراموش عالم دین گزرے ہیں، ان کا تذکرہ بھی خدا کرے تو اگلی سطور میں آئے گا۔

۳۔ عبدالرشید مرحوم۔

۴۔ عبدالخالق مرحوم۔

۵۔ عبدالروؤف مرحوم۔

۶۔ میمونہ خاتون مرحومہ: یہی میمونہ خاتون بنت علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف

حجازی سندی فرانگ والے عظیم ونامور شیخ طریقت حضرت مولانا شاہ عبیداللہ صاحب سندی فرانگیؒ کی اہلیہ تھی، یوں شاہ صاحب کا تذکرہ بھی اس خاندانِ رشید کے نامور داماد ہونے کے ناطے اگلی سطور میں آئے گا، اگر چاہے خدا کرے۔

۷۔ حمیرہ خاتون مرحومہ۔

۸۔ رمیزہ خاتون مرحومہ۔

۹۔ فیڑان خاتون مرحومہ۔

☆ <u>کرم علی صاحب مرحوم</u>: کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کا جہاں تک پتہ چلا کہ آپ ضابطے کے عالم دین تو نہ تھے، لیکن علماء وصلحاء سے خاصی شفقت اور لگاؤ رکھنے والے بزرگ تھے، ساتھ ہی ساتھ بڑے صاحب ثروت و دولت انسان بھی، آپ نے اپنی دولت و ثروت کو علم دین اور علماء وصلحاء کے لئے صرف کیا تھا، کہتے ہیں کہ آپ بڑے سخی اور فراغ دل انسان تھے، آپ کی اولاد درج ذیل ہیں:

۱۔ انور علی مرحوم: انور علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی بڑے زمیندار اور علماء وصلحاء دوست بزرگ تھے، جو حضرت محمد جعفر حبیب کے پردادا ہیں۔

۲۔ مشرف علی مرحوم۔

۳۔ عالیہ خاتون مرحومہ۔

۴۔ لطیفہ خاتون مرحومہ۔

انور علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کی اولاد یہ ہیں:

۱۔ ابوالحسین مرحوم۔

۲۔ ابوالبشر مرحوم۔

۳۔ ابوالفضل مرحوم۔

۴۔ ابوالخیر مرحوم: بڑے زمیندار اور صاحب اقتدار جناب ابوالخیر مرحوم حضرت محمد جعفر حبیب کا دادا جان ہیں، جو علاقے میں ''ابوالخیر بلی'' کے نام سے معروف اور مشہور تھے۔

۵۔ میمونہ خاتون: یہ خاتون حضرت مولانا شاہ حافظ مخلص الرحمن کجافوی علی چنگی بوسیدنگی کی اہلیہ ہے، حضرت حافظ صاحب کا اجمالی تذکرہ اگلی سطور میں ان تحریروں کی زینت بنے گا، اور یاد رہے کہ حضرت کا تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبدالباری معرف بہ بڑے مولوی صاحب کے تذکرہ کی طرح اس علاقے کے دین وملت کے حوالے سے نہایت ضروری اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

مشرف علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی بھی اس خاندان کے ایک صاحب ثروت واقتدار بزرگ تھے، علماء وصلحاء سے نہایت محبت وشفقت رکھتے تھے، اور طالبان علوم دین کے خاصے معاون بھی، ان کی اولاد یہ ہیں:

۱۔ عبدالسلام مرحوم معروف بہ لتا یار باپ۔

۲۔ ٹھنڈا میاں مرحوم۔

۳۔ باسا میاں مرحوم۔

۴۔ عابدہ خاتون مرحومہ۔

۵۔ گلزار خاتون مرحومہ۔

۶۔ گل مہر مرحومہ۔

۷۔ گل سحر مرحومہ۔

مرحوم عبدالسلام بن مشرف علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کے چار بیٹے تھے:

۱۔ محمد امین مرحوم۔

۲۔ حبیب الرحمن مرحوم۔

۳۔ شفیع الرحمن مرحوم۔

۴۔ ابوطیب مرحوم۔

پھر محمد امین بن عبدالسلام بن مشرف علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کے پانچ بیٹے تھے

۱۔ عبدالغفار مرحوم: یہ اپنے زمانے میں بوسیدنگ شہر کے پوسٹ مین تھے۔

۲۔ ابوالفیاض مرحوم۔

۳۔ محمد الیاس مرحوم۔

۴۔ محمد ناصر الدین مرحوم۔

۵۔ لالومیاں مرحوم۔

ابوالخیر (بلی) صاحب مرحوم:

ابوالخیر بن انور علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی صاحب اپنے زمانے میں بہت بڑے مالدار، زمیندار اور با اثر ورسوخ انسان تھے، جو حضرت محمد جعفر حبیب کے دادا ہیں، یہاں کے حالات پر عبور رکھنے والے جانتے ہیں کہ علی چنگ کی بستی کجافہ (بیولا فارہ) میں صدیوں پرانا ایک بازار تھا (یاد رہے کہ یہ بازار شہر بوسیدنگ کے بسنے سے پہلے بڑا بارونق تھا، جو درمیان میں اگرچہ ختم ہو گیا تھا لیکن آج کل شنید ہے کہ اسے دوبارہ بسایا گیا ہے) اس کی دیکھ بال کے علاوہ اس کے محاصل اپنے زمانے میں ابوالخیر صاحب اٹھایا کرتے تھے، جن کی اولاد یہ ہیں:

۱۔ اشرف الزمان چوہدری صاحب مرحوم: یہ صاحب حضرت محمد جعفر حبیب کا تایا اور سسر ہیں۔

۲۔ حبیب الزمان چوہدری صاحب مرحوم: یہ حضرت قائد محمد جعفر حبیب کے والد بزرگوار ہیں.

۳۔ سعید الزمان مرحوم۔

۴۔ محمد زمان مرحوم۔

۵۔ شفیع الزمان مرحوم۔

۶۔ بدیع الزمان مرحوم۔

۷۔ دودو میں مرحوم۔

۸۔ کلثومہ خاتون مرحومہ۔

۹۔ سکینہ خاتون مرحومہ۔

۱۰۔ الماس خاتون مرحومہ۔

۱۱۔ پردہ خاتون مرحومہ۔

۱۲۔ زرینہ خاتون مرحومہ۔

۱۳۔ کلیہ خاتون مرحومہ۔

(الف) مرحوم اشرف الزمان جو ظاہر ہے کہ مرحوم ابوالخیر (بلی) صاحب کے بڑے بیٹے اور حضرت محمد جعفر حبیب کا تایا اور سسر ہیں، جن کی اولاد یہ ہیں:

۱۔ ابوسفیان مرحوم۔

۲۔ سراج احق مرحوم۔

۳۔ زھیر الدین مرحوم۔

۴۔ دل فیروز مرحونہ۔

۵۔ من پیارہ مرحومہ۔

۶۔ اثمیدہ بیگم مرحومہ۔

۷۔ خورشیدہ بیگم مرحومہ: یہ حضرت قائد محمد جعفر حبیب کی تایازاد بہن اور آپ کی اہلیہ محترمہ ہیں۔

(ب) حبیب الزمان چوہدری صاحب مرحوم: یہ حضرت محمد جعفر حبیب کے والد بزرگوار ہیں، جن کی اولاد یہ ہیں:

۱۔ گلہاروز: حضرت قائد محمد جعفر حبیب کی یہ بڑی بہن کرنل رشید احمد صاحب شہید فوئما لوی کی اہلیہ محترمہ ہیں، جنہوں نے اپنے لائق خاوند کے ساتھ جہاد کرتے کرتے ۱۹۵۳ء میں فوئمالی کی جانبِ مشرق میں واقع پہاڑی میں شہادت حاصل کی۔

۲۔ ابوعبیدہ مرحوم۔

۳۔ محمد جعفر حبیب.

۴۔ عارف احمد مرحوم۔

۵۔ انعام الحق صاحب۔

۶۔ زاہد حسین صاحب۔

۷۔ ابوالقاسم صاحب۔

۸۔ آمنہ خاتون۔

۹۔ ہمایون کبیر مرحوم۔

۱۰۔ خالدہ بیگم۔

۱۱۔ محمد انور صاحب۔ وطن میں ہیں، مارشل آرٹ کا ماہر ہیں۔

۱۲۔ محمد سلیم شہید: ماشل آرٹ کے ماہر اور قوم کے بڑے خادم تھے، ان پر مگھ خبیثوں نے رات کی اندھیری میں گھات لگا کر حملہ کیا اور ان بزدلوں سے لڑتے لڑتے جام شہادت نوش فرمایا۔

۱۴۔ ظہورہ خاتون۔

۱۵۔ حسینہ بیگم۔

۱۶۔ مولوی محمد رفیق صاحب: ظاہر ہے کہ یہ ایک عالم دین ہیں، عمر کے لحاظ سے میرے چھوٹے مگر ساتھ پڑھتے تھے، پڑھائی کے حوالے سے ۱۹۸۴ء کے دوران میرے ساتھ بنگلا دیش بھی آئے، کچھ دن دارا لمعارف الاسلامیہ چاٹگام کے طالب علم رہے، حضرت قائد کو ان سے بڑی امید تھی، ہزار سمجھانے کے باوجود نہ جانے کیوں بعد میں وطن چلے گئے تھے، اندرون وطن میں قوم کی خاطر جیل میں سات سال گزارے، شنید ہے کہ آج کل برمی سرحد کے اس پار چین میں مقیم ہیں، اللہ تعالی ان کی حیات دراز کرے۔

صمد علی منشی مرحوم اور ان کی اولاد:

کہتے ہیں کہ صمد علی صاحب نے اپنے والد بزرگوار حضرت شاہ عبد اللطیف حجازیؒ سے دینی تعلیم حاصل کی، پھر اپنے علاقے کے ایک عالم سے فارسی بھی پڑھے، کہتے ہیں کہ آپ فارسی کے انشاء پرداز تھے، یوں آپ کے نام کے ساتھ لفظ ’’منشی‘‘ چسپاں ہو گیا، اور مشہور روایت کے مطابق آپ بڑے زمیندار اور علماء وصلحاء سے نسبت رکھنے والے بزرگ تھے، آپ نے بھر پور زندگی گزاری، انتقال پر خاک وطن میں مدفون ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی اولاد یہ ہیں:

۱۔ امداد حسین مرحوم۔

۲۔ جلال احمد مرحوم۔

۳۔ کریم داد مرحوم۔

۴۔ عبد العظیم مرحوم۔

۵۔ اللہ داد مرحوم۔

۶۔ مالک داد مرحوم۔

۷۔ فجر علی مرحوم۔

۸۔ جلیل داد مرحوم۔

۹۔ رحمۃ النساء مرحومہ۔

۱۰۔ زبیدہ خاتون مرحومہ۔

۱۱۔ آمنہ خاتون مرحومہ: شنید ہے کہ آمنہ خاتون صاحبہ نہایت پاکزہ صفات کی خاتون تھیں، جو دور آخر میں بانی تحریک آزادی حضرت مولانا محمد جعفر حسین قوال شہید کی دادی ہیں، یعنی حضرت کے والد بزرگوار حضرت مولانا سلطان احمد رحمۃ اللہ علیہ کی والدۂ مرحومہ۔ یہاں ایک بات یقینی طور پر یاد رہے کہ حضرت شہید کا تعلق دادی اور نانی کی جانب سے اس خاندان عز وشرف سے ہے ہی۔

حضرت مولانا شاہ عبدالباری صاحب کجافوی علی چنگی، بوسیدنگیؒ:

دور آخر میں سرزمین ارکان کے ایک عظیم المرتبت شیخ طریقت حضرت شاہ مولانا عبدالباری بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی رحمۃ اللہ علیہ کی پیدائش قصبۂ علی چنگ کی بستی بیولا فارہ (کجافہ) میں ہوئی، ظاہر ہے کہ آپ حجازی النسب بزرگ تھے، آپ حضرت قائد محمد جعفر حبیب کے دادا مرحوم ابوالخیر (بلی) کے چچازاد بھائی تھے، اس طرح آپ رحمۃ اللہ علیہ حضرت قائد کے دادا تھے۔

اللہ تعالی نے اس حجازی النسب عالم دین اور پیر طریقت کی اولاد میں بڑی برکت دی، چنانچہ آپ کی نسل سے بڑے بڑے علماء، فضلاء، دعاۃ ومرشدین اور خادمان قوم وملت اور مجاہدین اسلام پیدا ہوئے، جن میں بانئ تحریک آزادی حضرت جعفر حسین قوال کے علاوہ مولانا قاضی عبدالہادی اور مولانا مفضل احمد صاحب ناقابل فراموش اور نامور بزرگ تھے۔

حضرت مولانا عبدالباریؒ نے ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں سے پاکر اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں چندسال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

دوران تعلیم آپ نے بنگال کے ایک مرشد کامل (ایک روایت کے مطابق حضرت مولانا الحاج شاہ حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ) کے ہاتھ پر بیعت کی، اور طویل ریاضت ومجاہدہ کے بعد آپ خرقۂ خلافت سے نوازے گئے، اس کے بعد آپ وطن واپس آ گئے۔

کہتے ہیں کہ آپ وطن آئے ایک طرف بڑے عالم دین اور دوسری طرف پیر طریقت ہوکے، اس لئے یہاں آپ کی شروع ہی سے بڑی پذیرائی ہوئی تھی، یہاں آتے ہی آپ نے اپنی آبائی بستی میں ایک مدرسہ کے ساتھ ایک خانقاہ کی بنیاد ڈالی، آپ طلبہ کو ایک طرف علم دین کا درس دیتے تو دوسری طرف اس خانقاہ میں بیٹھ کر عام لوگوں کو رشد وہدایت کی تلقین کیا کرتے تھے، یوں آپ کی مسلسل خدمات جلیلہ اور پیہم مساعئ جمیلہ سے پورے علاقے علم وعرفان کی روشنی اور ضیا پاشی سے منور اور تاباں ہوگئے تھے۔

ظاہر ہے کہ آپ ایک مرشد کامل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے پایہ کے عالم دین بھی تھے، یوں

علاقے کے عام خاص آپ کو ’’بڑے مولوی صاحب‘‘ کے لقب سے یاد کرتے تھے، درس وتدریس اور رشد وہدایت اور تبلیغ وتلقین کے علاوہ عام حالت میں آپ فقہ وفتاوی سے بھی دل چسپی رکھتے تھے، مگر کہتے ہیں کہ یہ حالت آپ کی زندگی کے آخری ایام تک برقرار نہیں رہ سکی تھی۔

آپ پر شاید زندگی کے آخری ایام میں ہو کہ جذب ومستی کی حالت طاری ہوجاتی تھی، تو ظاہر ہے کہ جذب ومستی کی حالت میں زندگی کے عام معمولات میں تبدیلی آجاتی تھی۔

آپ سماع ومزامیر سے شدید متنفر تھے، سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے پابند تھے، خدمت خلق آپ کی زندگی کا شیوہ بن چکی تھی، بڑے بردبار، نیک صورت وسیرت اور صاحبِ کشف وکرامات بزرگ تھے، آپ نے اپنی بستی میں انتقال فرمایا اور یہیں مدفون ہوئے، آپ کا مزار اب بھی زیارت گہ خاص وعام ہے۔

حضرت شاہ صاحب کی نرینہ کوئی اولاد نہ تھی، صرف دو صاحب زادیاں تھیں، ان میں سے ایک کا نام لطیفہ خاتون جب کہ دوسری کا نام خیر النساء تھا۔

حضرت کی صاحب زادی لطیفہ خاتون بانئ تحریک آزادی حضرت جعفر حسین قوال کی نانی تھی، جن کی اولاد یہ ہیں:

☆ مولوی فروخ احمد صاحب مرحوم، ان کا تذکرہ اگلی سطور میں آئے گا۔

☆ مولوی دبیر احمد صاحب مرحوم، ان کا تذکرہ بھی اگلی سطور میں آئے گا۔

☆ مولوی محمد صاحب مرحوم، ان کا تذکرہ بھی اگلی سطور میں آئے گا۔

☆ بنوشاہ خاتون مرحومہ: یہ بانئ تحریک آزادی حضرت جعفر حسین قوال کی والدہ ہے۔

☆ دل نواز خاتون: یہ منشی نظام الدین اور انجینئر محمد رفیع القدر منشی فاروی بوسیدنگی کی والدہ ہے۔

حضرت مولانا عبدلباری کی دوسری صاحب زادی خیر النساء کی اولاد یہ ہیں:

☆ فیروز احمد صاحب مرحوم۔

☆ اظہار میاں صامرحوم۔

☆ قدوس احمد صاحب مرحوم۔

☆ میر احمد صاحب مرحوم۔

☆دل آویز خاتون مرحومہ۔

☆ثقیلہ خاتون مرحومہ: یہ حضرت مولانا قاضی عبدالہادی صاحب لمبا بیلی بوسیدنگی کی والدہ ہے، قاضی صاحب کا تذکرہ بھی ان معروضات کی زینت بنے گا، انشاءاللہ۔

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ حضرت مولانا شاہ عبدالباری صاحبؒ جس طرح بانیٔ تحریک آزادی حضرت مولانا جعفر حسین قوال کے پرنانا تھے تو اسی طرح پچھلی سطور میں جیسی عرض کی جا چکی ہے کہ حضرت قائد محمد جعفر حبیب کے دادا بھی تھے۔ویسے یہ دونوں قائدین آپس میں قریبی رشتے دار ہیں۔

حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمن صاحب کجافوی، علی چنگی، بوسیدنگیؒ:

حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمن صاحب قصبۂ علی چنگ، بوسیدنگ کی معروف اور مردم خیز بستی کجافہ (بیولا فارہ) میں پیدا ہوئے، آپ کی ابتدائی تعلیم خاندان کے بزرگوں کے ہاتھوں میں ہوئی تھی اور آپ نے خاندان ہی کے ایک جیّد حافظ قرآن کے سامنے زانوئے تلمیذ خم کر کے قرآن کریم کا مکمل حفظ کیا تھا۔ اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے بنگال کا سفر کیا اور خاندانی بزرگوں کی روایت کے مطابق ڈھاکے کے آس پاس کی کسی دینی درس گاہ سے سند فراغت حاصل کر کے سیدھے وطن واپس گئے تھے، کہا جاتا ہے کہ بنگال میں دوران تعلیم آپ کا ذہن تصوف کی طرف مائل ہو گیا تھا، مگر ایک طرف پڑھائی تو دوسری طرف کسی مرشد پر دل جمعی نہ ہونے کی وجہ سے کسی کے ہاتھوں پر بیعت نہ ہو سکی تھی، یوں آپ سیدھے وطن لوٹ آئے تھے۔

وطن میں چند مہینے گزار کر پھر آپ ایک مرشد کامل کی تلاش کو نکلے، چاٹگام اور بنگال کے چند علاقوں میں اس وقت پائے جانے والے چند بزرگوں کی خانقاہوں میں گئے، اس سلسلے میں خانقاہ مہیش بھنڈار بھی گئے تھے، لیکن یہاں اطمینان نہ ہونے کی وجہ سے آپ نے یہاں سے راہ فرار اختیار کی، اس کے بعد آپ ڈھاکے گئے اور وہاں اللہ تعالی کے ایک برگزیدہ بزرگ ہستی کے مبارک ہاتھ میں بیعت کی اور سالوں کی ریاضت ومجاہدہ کے بعد آپ کو خلافت ملی۔

مجاز بیعت ہونے کے بعد آپ سیدھے وطن واپس آئے، اور شادی کی سنت بجالائی، حضرت کی اہلیہ محترمہ میمونہ خاتون بنت انور علی بن کرم علی بن محسن علی بن شاہ لطیف حجازی کے حوالے سے کچھ ضروری باتیں یہاں تحریر کی جا رہی ہیں۔

محترمہ مرحومہ میمونہ خاتون اور ان کے خاندان اور خاندانی بزرگوں کے متعلق بہت ساری باتیں ہیں، مگر یہاں طوالت کے خوف سے ساری باتیں نہیں لائی جائیں گی ۔

میمونہ خاتون بنت انور علی خود ایک صاحب علم خاتون تھیں، انور علی کی پانچ اولاد تھیں:

☆ ابوالحسین۔

☆ ابوالبشر۔

☆ ابوالفضل۔

☆ ابوالخیر۔

☆ میمونہ خاتون۔

مرحوم ابوالخیر (معروف بہ ابوالخیر بلی) نامی شخص یہ حضرت محمد جعفر حبیبؒ صدر روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کا دادا مرحوم تھے، یوں میمونہ خاتون حضرت قائد محمد جعفر حبیب کی دادی تھیں، جن کا نکاح حضرت حافظ مولانا مخلص الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا، یوں حضرت حافظ صاحب قائد حبیب کے دادا تھے۔

مرحومہ میمونہ خاتون کے چچازاد بھائیوں میں وقت کے ایک عظیم المرتبت عالم دین، درویش اور پیر کامل گزرے ہیں، جن کا نام گرامی حضرت مولانا شاہ عبدالباری (معروف بہ بڑے مولوی صاحب) بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ لطیف حجازیؒ تھا۔

مولانا عبدالباری بن علیم الدین رحمۃ اللہ علیہ بانی تحریک آزادیٔ ارکان حضرت جعفر حسین قوّال رحمۃ اللہ علیہ کے پرنانا تھے، سلسلے اس طرح ہے کہ: جعفر حسین بن بنوشاہ خاتون بنت لطیفہ خاتون بنت مولانا شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ۔ لطیفہ خاتون جعفر حسین قوال کی حقیقی نانی تھیں، جن کی پانچ اولاد تھیں :

☆ مولوی فروخ احمد

☆ مولوی ذبیر احمد۔

☆ مولوی محمد۔

☆ بنوشاہ خاتون (والدۂ مرحومہ حضرت جعفر حسین قوالؒ)

☆ دل نواز خاتون۔

مولانا شاہ عبدالباری کے حقیقی بھتیجوں میں اور ایک بڑے جلیل القدر عالم دین گزرے، وہ تھے حضرت مولانا قاضی عبدالہادی بن خیر النساء بنت حضرت مولانا شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ، مولانا اپنے وقت میں اس علاقے کے بڑے علماء میں شمار تھے، قاضی تھے، تفسیر، حدیث، کلام اور فقہ میں یدطولیٰ رکھتے تھے، ان کی زندگی پر راقم کا ایک مقالہ ہے۔ انشاءاللہ اگلی سطور میں آئے گا۔

میمونہ خاتون کی چچازاد بہنوں میں ایک بزرگ خاتون تھیں، جن کا نام بھی میمونہ خاتون تھا،

سلسلہ اس طرح ہے کہ: میمونہ خاتون بنت علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ لطیف حجازی رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ میمونہ خاتون حضرت مولانا شاہ عبدالباریؒ کی حقیقی چھوٹی بہن تھیں، جن کی شادی سندی فرانگ بوسیدنگ کے معروف بزرگ حضرت مولانا شاہ عبیداللہ سندھی فرانگی سے ہوئی، شاہ عبیداللہ رحمۃ اللہ علیہ کا مزار مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ کے جنوبی بغل میں مرجع خاص وعام ہے۔ یہاں ایک بات یاد رہے کہ حضرت مولانا عبدالباری اور مولانا عبیداللہ صاحب رحمہم اللہ حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کے اجل خلفاء میں سے تھے، اسی طرح حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ارکانی گودام فاروی بھی، اسی علاقے میں حضرت حافظ اعظم گڑھی کے اور بھی خلفاء تھے، جن کا تفصیلی تذکرہ ایک علیحدہ موضوع کا حامل ہے۔

میمونہ خاتون بنت انور علی (اہلیہ حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمنؒ کے بھتیجوں میں اور ایک بلند پایہ کے عالم دین گزرے ہیں، جن کا نام حضرت مولانا مفضل احمد بن عبدالعزیز بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ لطیف حجازی ہے، مولانا مفضل احمد صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل تھے، بہت بڑے فاضل، مفسر، محدث اور فقیہ تھے، ان کا شمار علاقے میں اپنے وقت کے سب سے بڑے فقہاء میں تھا، مولانا نے علاقے کے بڑے زمیندار ابوالباصر چوہدری تمنگ چنگی کی بیٹی سے شادی کی اور اپنے سسر اور علاقے کے عام مسلمانوں اور علماء کے تعاون سے مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ بوسیدنگ کی بنیاد رکھی، اور وہیں پڑھاتے رہے۔

یہاں اتنی لمبی چوڑی داستان سرائی سے میرا ایک مدّعا یہ ہے کہ حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمن صاحب رحمۃ اللہ کا رشتہ جس برگزیدہ خاندان سے تھا، اس میں جیسا کہ عرض کی گئی ہے کہ بڑے بڑے مفکرین، قائدین، دانشوران اور زعماء کے علی الرغم بہت بڑے بڑے علماء اور طریقت کے حوالے سے عظیم سے عظیم ترین بزرگان دین موجود تھے اور راقم سطور نے اس خاندان کے چندان بزرگوں کو دیکھا، جن کے سامنے حضرت حافظ صاحب کی زندگی تھی، جن میں حضرت قائد محمد جعفر حبیب کے والد مرحوم حبیب الزمان چوہدری ناقابل فراموش ہیں۔

یاد رہے کہ میرے نانا مرحوم مفضل احمد صاحب اور محمد جعفر حبیب صدر روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کے والد مرحوم چوہدری حبیب الزمان آپس میں حقیقی خالہ زاد بھائی تھے، یوں قائد مرحوم

راقم السطور کی والدہ کا چچازاد بھائی تھے، ویسے ہی اس خاندان کی خاندانی روایات راقم کے پاس زیادہ سے زیادہ میسّر ہوئیں۔مگر کسی بھی بزرگ کے بیان سے اس بات کا پتہ نہ چلا کہ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا روحانی تعلق ''خانقاہ مہیش بھنڈار'' سے تھا، بلکہ اس کے برعکس سارے کے سارے بزرگون کا بیان ہے کہ حافظ صاحب کی زندگی میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی گئی کہ جس سے یہ ظاہر ہو کہ حضرت کا تعلق فرقۂ مہیش بھنڈار سے رہا ہو، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ خاندان میں وقت کے جلیل القدر علماء، صلحاء، درویش اور فقہاء تھے، لیکن کسی کی زبان سے یہ شکایت نہیں سنی گئی تھی کہ حضرت حافظ صاحب کے عقائد واعمال میں مشتبہ چیزیں بھی تھیں، اور جہاں تک دیکھا گیا کہ حضرت کے اعمال وافعال سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق تھے، بس آپ اہل السنت والجماعت اور سلف صالحین کے نمونہ تھے۔

بہرحال بات اتنی ہے کہ حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ ایک مرشد کامل کی تلاش میں ''مہیش بھنڈار'' گئے ضرور تھے، باجو یکہ اس وقت پیر مہیش بھنڈار کا بڑا دھوم تھا، مگر حضرت کو یہاں اطمینان بالکل نہیں ہوا تھا، ویسے جس طرح عرض کی گئی ہے کہ حضرت یہاں سے نکلے اور ڈھاکے کے آس پاس کسی اہل اللہ کے ہاتھ میں بیعت کی اور خلافت سے سرفراز ہو کر وطن واپس آئے تھے۔

اس سلسلے میں چلتے چلتے اور ایک بات بتا دیتا ہوں کہ راقم سطور کے حقیقی ناناجان مرحوم مفضل احمد صاحب بانگونوی ابتداء میں حضرت حافظ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں سے تھے، جنہوں نے حضرت کے انتقال کے بعد اس وقت کے نامور عالم دین شیخ طریقت حضرت العلامہ مولانا شاہ عبد السلام ارکانی گودام فاردی (خلیفہ اجل ومجازِ بیعت حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ) کی طرف رجوع کیا۔راقم سطور نے حضرت مولانا حافظ مخلص الرحمن کے متعلق اپنے ناناجان سے بہت ساری باتیں سنیں، کہتے تھے کہ: حضرت حافظ مخلص الرحمن صاحبؒ حافظ قرآن، عالم دین، صاحب کشف وکرامات مرشد کامل تھے، حضرت کی کرامات تو ناناجان سے بہت ساری سنیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ نانان جان نے بتایا کہ:

''ایک دن کا واقعہ تھا کہ میں کھیت میں کام کر رہا تھا، دوپہر کا وقت تھا، چلچلاتی دھوپ تھی، کھیت ندی کے پار تھی، اچانک دیکھتا ہوں کہ حضرت حافظ صاحب ندی کے اس پار سے ہماری طرف

آرہے ہیں، ندی پانی سے لبالب تھی، جب کہ ندی میں کوئی پل اور کشتی بھی نہ تھی، میں سوچ میں تھا کہ حضرت ندی کیسے پار کریں گے؟ ادھر میں اپنی سوچ میں تھا، ادھر حافظ صاحب کو دیکھا کہ ندی کے اس پار نکل کے میرے قریب آبیٹھے، حضرت کے لباس میں پانی کا ایک بوند بھی نہ تھا، میں حیران اور میری زبان گنگ تھی، وہ اس لئے کہ حضرت ندی کے اس پار تو آ نکلے مگر لباس بالکل سوکھا تھا، گویا انہوں نے ندی پار ہی نہیں کیا ہو، حضرت میرے سامنے پاؤں پھیلائے بیٹھے اور فرمایا: مفضل احمد میرے پاؤں میں کچھ درد ہے، تھوڑے دبا تو دو!، میں نے حضرت کے حکم کی تعمیل کی، حضرت نے بڑی ہی دعائیں دیں''۔

جس وقت ناناجان مجھے یہ قصہ سنا رہے تھے، میں نے دیکھا کہ ان کے جسم میں وجد کا سماں تھا اور آنکھیں پرنم تھیں۔ناناجان کی طرح میں نے یہاں کے بزرگوں سے حضرت کی کرامات اور کشف کے حوالے سے بہت ساری باتیں سنیں، ان بزرگوں کی روایات سے جہاں تک اندازہ ہوا کہ حضرت پر کبھی کبھار جذب ومستی کی حالت بھی طاری ہوجاتی تھی، مگر ایسی حالت بہت کم ہوتی تھی، عام حالت میں سلف وصالحین اور بزرگان دین متین کی روایات سے ہٹ کر کوئی بھی کام آپ سے صادر نہیں ہوا تھا۔

اس علاقے میں حضرت حافظ صاحب کی جاذب نظر شخصیت اور شریعت وطریقت کے حوالے سے آپ کی کی جانے والی کوششوں سے علم وعرفان کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا تھا، علاقے بھر میں آپ کے انگنت مریدان تھے، البتہ آپ نے کسی کو مجاز بیعت کیا تھا یا نہیں اس بات کا پتہ نہ چل سکا۔

اب میں اس عنوان کے آخر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ سرزمین ارکان میں جو مہیش بھنڈاری فرقے کے کچھ لوگ پائے جاتے ہیں ان کا یہ دعوی صحت پر مبنی نہیں ہے کہ حضرت کا تعلق پیر مہیش بھنڈار سے تھا، جب کہ اس دعوی کے خلاف بہت سارے ثبوت موجود نہیں کہ حضرت کا روحانی تعلق مہیش بھنڈار سے نہیں کسی اور سے تھا۔

ہمارے عنفوان شباب میں شاید اب بھی ہو کہ اس فرقے کے لوگ حضرت حافظ کے مزار کے گرد سال میں کم سے کم ایک دو مرتبہ جمع ہوتے تھے، بدنام زمانہ جنرل نیوں کے دور حکومت میں ان لوگوں کو قسمًا کھلی چھٹی مل گئی تھی کہ سال میں ایک دو مرتبہ جمع ہو کر عرس یا برسی کا دھوم مچایا کرتے تے تھے، یہ لوگ اس مزار کے پاس بڑے بڑے بکرے ذبح کرتے اور لوگوں کو کھانے کی دعوت دیتے تھے

، یہاں نماز دعا کی پابندی تونہیں ہوتی ، البتہ رات گئے طبلے کا ٹنک ، ڈھولک کا دھمک بشمول دیگر مزامیر اور گانوں سے رقص وسرود کا بازار گرم ہوجاتا تھا، پھر بھی حکومت وقت کی پشت پناہی کے باوجود علماء اور عام مسلمان ان بدبختوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ،اور چندمرتبہ ہم نے اپنی آنکھوں دیکھا کہ ان کی خوب خوب پٹائی بھی ہورہی تھی۔

حضرت حافظ مخلص الرحمن نے اپنی آبائی بستی میں انتقال کیا، اور یہیں مدفون ہیں، آپ کے مزار پاک زیارت گہِ خاص وعام ہے۔

حضرت مولانا شاہ عبیداللہ صاحب سندی فرانگی، بوسیدنگیؒ:

حضرت مولانا شاہ عبیداللہ سندی فرانگیؒ کی پیدائش جنوبی بوسیدنگ کی مردم خیز بستی سندی فرانگ میں ہوئی، کہتے ہیں کہ حضرت کا خاندان اس بستی کے قدیمی خاندانوں میں سے ایک ہے، آپ کے والد ایک کاشتکار مگر طرز زندگی ان کے علماء جیسے تھے، آپ علماء اور طالبین علوم دین سے نہایت محبت و شفقت کرنے والے بزرگ تھے۔

بستی سندی فرانگ علماء، صلحاء اور دانشوران کی بستی ہے، اس بستی کے آخری جنوبی سرا میں ایک بازار صدیوں سے آباد ہے، جو ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے واقع ہے، کہا جاتا ہے کہ اس بستی کا یہ بازار سندی فرانگ کے قدیم نامور زمیندار خاندان ''مصری بارو خاندان'' اور گودام فارا والے پانچکری سوداگر کے خاندان نے مل کر بسایا تھا، اس بازار کے شمال میں بس تھوڑے فاصلے پر آج بھی حضرت مولانا عبیداللہ صاحب کا مزار زیارت گہِ خاص وعام ہے۔ یاد رہے کہ حضرت کے مزارِ پاک کے شمال میں سندی فرانگ والی معروف دینی درس گاہ ''مدرسہ اشاعت العلوم'' آباد ہے۔

سندی فرانگ کی یہ بستی شرفاء، نجباء، اور خدامانِ ملت وقوم کی بستی ہے، ویسے حضرت مولانا عبیداللہ صاحب کے خاندان میں بھی علماء، صلحاء اور خدامانِ ملت وقوم کی کوئی کمی نہیں تھی۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم اسی بستی میں ہوئی، بعد میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے بنگال کا سفر کیا اور ایک روایت کے مطابق مدرسہ عالیہ کلکتہ سے سند فراغت حاصل کی، اور تعلیم کی تکمیل کے بعد حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ کے مبارک ہاتھ میں بیعت ہو کے تصوف وسلوک کے مقامات طے کئے، اور خلافت حاصل کر کے اپنے وطن آ گئے۔

وطن آتے ہی آپ نے دعوت وتبلیغ، تعلیم وتلقین اور رشد وہدایت کے ذریعے اس علاقے کو علم دین سے روشن اور نورِ عرفان سے منور کر دیا، اور حضرت کے اس علاقے میں ہزاروں مریدان اور انگنت متعلقین پائے جاتے تھے، اور دور دراز کے علاقوں سے بھی سینکڑوں بندگان خدا آپ کے دربار میں آتے اور اپنے اپنے دلوں کو نورِ عرفان سے منور کر کے چلے جاتے تھے، جنہوں نے بھی اپنے مرشد وشیخ کی طرح اپنے اپنے علاقوں کو نورِ عرفان سے منور کر دیا۔

پڑھائی کی تکمیل کے بعد حضرت نے وطن آتے ہی میمونہ خاتون بنت علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبد اللطیف حجازی سے شادی کی، کہتے ہیں کہ اس شادی مبارک میں حضرت مولانا عبد الباری بن علیم الدین معروف بہ بڑے مولوی صاحب کجافوی کے ہاتھ تھے، ظاہر ہے کہ میمونہ خاتون حضرت بڑے مولوی صاحب کی حقیقی بہن ہیں، چنانچہ حضرت نے دیکھا کہ مولانا عبید اللہ صاحب ایک بلند پایہ کے عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پہنچا ہوا عارف باللہ بھی ہیں، تصوف وسلوک کے حوالے سے ان کا مقام بہت ہی بلند ہے، ویسے بڑے مولوی صاحب نے اپنی بہن کی شادی حضرت سے دے کر یہ ثابت کر دیا کہ ''ولی را ولی می شناسد''۔

میمونہ خاتون بنت علیم الدین ایک پڑھی لکھی اور شائستہ خاتون تھیں، زندگی بھر آپ نے اپنے لائق خاوند کی خدمت کی، کہتے ہیں کہ تصوف وسلوک میں آپ نے خاصے مقامات طے کئے تھے، لیکن یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ آیا یہ خاتون اسلام اپنے خاوند حضرت مولانا عبید اللہ صاحب کی مریدہ تھیں یا اپنے بھائی حضرت مولانا عبد الباری بڑے مولوی صاحب کی۔

بہر حال یہاں میرا مدعا یہی ہے کہ اس خانوادۂ شاہ عبد اللطیف حجازی کو یہ سعادت حاصل ہے کہ ایک عظیم مرشدِ کامل بھی اس سے جڑے ہوئے ہیں۔

یہاں ایک بات قابل تذکرہ ہے کہ ظاہر ہے کہ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندی فرانگیؒ حضرت مولانا حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی کا خلیفہ ومجاز بیعت تھے، جن کے بہت سارے پیر بھائی اندرون ارکان اور بنگال کے علاوہ ہند وپاک میں بھی تھے، ادھر حضرت اعظم گڑھی کے خلفائے کرام کے حوالے سے جناب محترم احمد الاسلام چوہدری چاٹگامی صاحب نے اپنی گرانقدر تصنیف ''حضرت مولانا عبد المجید صاحب'' میں ایک گوشوارہ دیا ہے، اس کتاب کے صفحہ نوے میں پیش کردہ اس گوشوارہ کے ستائسویں نمبر پر ایک ارکانی بزرگ کا نام گرامی بھی درج ہے، جس میں دو فروگزاشتیں نظر آئیں:

۱۔ پہلی فروگزاشت یہ ہے کہ چوہدری صاحب نے اس ارکانی بزرگ کا نام عبد اللہ لکھا ہے، جب کہ اس کا نام عبید اللہ ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ اس بزرگ کی جائے پیدائش رنگون (برما) لکھا گیا ہے، جب کہ صحیح یہی ہے کہ اس کی

جائے پیدائش اور جائے وفات دونوں ہی بستی سندی فرانگ، علاقہ بوسیدنگ، ارکان ہے۔

تاہم محترم چوہدری صاحب نے اگرچہ رنگون میانمار لکھا ہے، لیکن سندی فرانگ کو صاف الفاظ میں لکھ دیا ہے، جس سے پتہ چل گیا ہے کہ مصنف کی جس بزرگ کی نشان دہی مقصد ہے وہ اور کوئی نہیں یہی حضرت مولانا عبید اللہ سندی فرانگی ہیں۔

مولانا قاضی عبدالہادی صاحب لمبابیلی، بوسیدنگیؒ:

حضرت مولانا عبدالہادی معروف بہ قاضی مولوی صاحب کی پیدائش قصبۂ علی چنگ، بوسیدنگ کی بستی لمبا بیل میں ہوئی، آپ کا خاندان ایک کاشتکار خاندان ہے، ماضی قریب میں اس خاندان میں بڑے بڑے علماء اور خدامانِ قوم وملت پیدا ہوئے، جن میں حضرت مولانا مفتی ابوالفضل کے علاوہ حضرت مولانا سعیداللہ صاحب لمبابیلی، حضرت مولانا حسین احمد ابوالفضل اور مولانا محمد جلیل نا قابل فراموش علمائے دین ہیں۔

روایت کے مطابق حضرت قاضی صاحب کی مکتب نشینی بستی کے مکتب میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو ایک روایت کے مطابق مدرسہ اشرف المدارس راجار بیل راسیدنگ میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے متوسطہ تک کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد آپ کلکتہ گئے، اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ اور تعلیم سے فراغت کے بعد آپ وطن واپس آئے، اور اپنی بستی کے مسلم بچوں کو پڑھاتے رہے، برطانوی حکومت نے آپ کو قضاء کا عہدہ دیا تو آپ اپنے علاقے میں ''قاضی مولوی صاحب'' کے نام سے مشہور ہوگئے۔

بعض اہل علم کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ آپ بڑے جید عالم اور صاحب ورع وتقوی بزرگ تھے، فقہ وفتاوی میں یدطولی رکھتے تھے، ویسے بھی معروف ہے کہ آپ بڑے مدبر ومعاملہ فہم تھے، برطانوی دور حکومت میں اس خطے میں منصب قضاء کا رواج تھا، یوں برطانوی حکومت نے بڑی جانچ پڑتال کے بعد آپ کو منصبِ قضاء پر فائز کیا، ورنہ اسی زمانے میں اس علاقے میں اتنے بڑے بڑے علماء اور صلحاء کے ہوتے ہوئے آپ کو اس منصبِ جلیلہ پر کیوں فائز کیا گیا تھا؟

قاضی صاحب کی والدہ ثقیلہ خاتون بنتِ خیر النساء بنت حضرت مولانا شاہ عبدالباری معروف بہ بڑے مولوی صاحب کجا فوئیؒ ایک عالی صفات والی خاتون اسلام تھیں، حضرت شاہ صاحب اور سر زمین ارکان کے دور آخر کے قائد تحریک حضرت جعفر حبیب مرحوم کا دادا جناب ابوالخیر صاحب مرحوم آپس میں چچازاد بھائی تھے، یوں ظاہر ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے خاندان اور قاضی صاحب کے خاندان کے مابین رشتہ داری تھی، راقم سطور نے حضرت قاضی صاحب کے متعلق اپنی تصنیف ''تذکرۂ علامہ سیدالامینؒ'' میں یوں لکھا کہ:

''حضرت قاضی مولوی عبدالہادی صاحبؒ بن ثقیلہ خاتون بنت خیر النساء بنت

حضرت مولانا شاہ عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے میں اس علاقے کے بڑے علماء میں شمار تھے، آپ تفسیر وحدیث اور فقہ وکلام میں یدطولی رکھتے تھے''۔

اس ضمن میں یہاں اور ایک بات قابل تذکرہ ہے کہ دور آخر میں سرزمین ارکان کے بانی تحریک حضرت مولانا جعفر حسین قوال شہید اور قاضی صاحب کے درمیان بھی رشتہ ہے، اس کا اجمال کچھ یوں ہے کہ بانی تحریک کی نانی لطیفہ خاتون اور قاضی صاحب کی نانی خیر النساء دونوں حضرت مولانا شاہ عبدلباری صاحب کی صاحب زادیاں تھیں۔

حضرت مولانا قاضی عبدالباری صاحب حضرت مفتی ابوالفضل صاحب کا چچا تھے، لوگوں سے سنا کہ حضرت مفتی صاحب قاضی صاحب کو بہت ہی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، اس حوالے سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کا بھی بیان ہے کہ:

''میرے والد گرامی حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحبؒ دادا حضرت مولانا قاضی عبدالہادی صاحبؒ کو بڑی عزت وتوقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، والد صاحب جس زمانے میں تنگ بازار کے مدرسہ میں درس دیتے تھے، گھر آتے ہی حضرت قاضی صاحب کی زیارت کو جایا کرتے تھے، اور انہی اپنے حقیقی والد کی طرح جانتے اور ان کی خدمت کرتے تھے، قاضی صاحب ایک جید اور معاملہ فہم عالم دین ہونے کے علاوہ نہایت متقی اور درویش صفت بزرگ تھے، ہمارے علاقے میں حضرت کو بڑی عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے''۔

میں نے حضرت قاضی صاحب کو نہیں دیکھا، شاید میری پیدائش سے بہت پہلے آپ انتقال کر گئے ہوں، یوں کوشش کے باوجود حضرت کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا پتہ نہیں چل سکا، البتہ پتہ چلا کہ آپ ایک جید عالم دین، فقیہ اور مفتی ہونے کے علاوہ شب زندہ دار تھے، اللہ تعالی حضرت کے درجات بلند کرے، اور ماضی قریب وبعید میں جس طرح آپ کی اولاد اور خاندان کے دیگر بزرگوں کو ملت و ملک کی خدمات توفیق دی تھی، اسی طرح مستقبل میں بھی مزید توفیق سے نوازے۔ آمین۔

مولانا محمد ابراہیم صاحب قطنی، منگڈویؒ:

سرزمین ارکان کے مایۂ ناز عالم دین اور خادم قوم وملت حضرت العلامہ محمد ابراہیم صاحب قطنی رحمۃ اللہ کا تعلق مشرقی ترکستان سے تھا، جس طرح ان کی کنیت سے صاف ظاہر ہے، کہتے ہیں کہ آپ مع آپ کا گھرانہ برطانوی دور حکومت میں ارکان آیا، خاندانی روایت کے مطابق حضرت نے ارکان اور ہندوستان میں تعلیم حاصل کر کے ارکان میں تدریسی خدمات انجام دینا شروع کر دیا تھا۔ سرزمین ارکان میں آپ نے متعدد مدارس دینیہ کی تاسیس کی تھی، لیکن حضرت علامہ صاحب تقسیم ہند کے دوران مشرقی پاکستان کے سرحدی علاقہ ٹیکناف میں آبسے تھے، آپ نے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کی بھرپور خدمات کی تھیں۔

۱۹۷۱ء کے افراتفری اور خانہ جنگی کے دوران آپ نے پھر ارکان میں مع اہل خانہ قدم رکھا۔ لیکن سوئے قسمتی سے برمی طاغوتوں نے آپ بشمول آپ کے پورے گھرانہ کو حراست میں لے لیا تھا۔ چونکہ آپ پاکستان کے بھرپور حامی تھے، جس کا علم پاکستانی حکومت کو بھی تھا۔ چنانچہ آپ کو جب حراست میں لے لیا گیا تو یہ خبر رنگون میں پاکستانی ہائی کمیشن کے یہاں پہنچی، یوں پاکستانی ہائی کمیشن کے واسطے سے آپ مع اپنا پورا گھرانہ رنگون پہنچے، رنگون سے بذریعہ طیارہ مغربی پاکستان کے اس وقت کے دار الحکومت کراچی آئے، اور ایک مدت تک یہی رہے، بعد میں آپ حجاز مقدس میں منتقل ہو گئے، یہاں بھی آپ نے ملت وقوم کی بھرپور خدمت کی، اور یہیں آپ کا انتقال ہوا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آج کل حضرت کا خاندان مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر ہے، آپ کے صاحب زادے جناب حافظ عبد اللہ صاحب راقم کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ اور محب مکرم جناب ڈاکٹر محب الدین عبد السبحان واعظ آپ کے داماد ہیں، جن کے ساتھ راقم کے برسوں سے خوشگوار تعلقات ہیں، بڑے پائے کے عالم اور دانشور ہیں۔

علامہ محمد ابراہیم صاحب قطنیؒ شک نہیں ہے کہ ایک بڑے پائے کے عالم، مفسر، محدث اور فقیہ اور زمانے کے رمز شناس بزرگ تھے، جہاں اور جس حالت میں بھی رہے، زندگی بھر دین اور علم دین کی خدمات انجام دیتے رہے تھے، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند فرمائے۔

مولانا مفضل احمد صاحب کجافوی، بوسیدنگیؒ:

حضرت مولانا مفضل احمد بن عبد العزیز بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبد اللطیف حجازی کی پیدائش بستی بیولہ فار (کجافہ) قصبۂ علی چنگ میں ہوئی، ظاہر ہے کہ آپ حضرت مولانا شاہ عبد الباری بن علیم الدینؒ کے بھتیجے تھے۔

آپ نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے خاندان کے بزرگوں سے پائی، بعد میں آپ نے اپنے تایا حضرت مولانا شاہ عبد الباریؒ سے دینیات کا درس لیا، اور بڑے ہوئے تو اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں چند سال مسلسل تعلیم حاصل کر کے سند فراغت حاصل کی، اس کے معا بعد وطن واپس آئے۔

وطن واپس آتے ہی آپ کا نکاح تمنگ چنگ والے زمیندار چوہدری ابوالباصر صاحب کی بیٹی سے ہوا، مولانا کی تعلیم اور شادی خانہ آبادی وغیرہ کے متعلق راقم سطور نے اپنی تصنیف ''تذکرۂ علامہ سید الامینؒ'' میں جو لکھا ہے، اس کا ایک اقتباس ایک ضرورت کی بنیاد پر یہاں لایا جارہا ہے:

> ''میمونہ خاتون بنت علیم الدین اہلیہ حضرت مولانا شاہ عبید اللہ صاحب سندی فرانگیؒ کے بھتیجوں میں ایک بلند پایہ کے عالم دین گزرے ہیں، جن کا نام حضرت مولانا مفضل احمد تھا، آپ کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے کہ: مفضل احمد بن عبد العزیز بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبد اللطیف حجازی۔ مولانا مفضل احمد صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل تھے، بڑے فاضل، مفسر، محدث اور فقیہ تھے، علاقے میں آپ کا شمار اپنے وقت کے سب سے بڑے فقہاء میں سے تھا، زمیندار مولانا نے علاقے کے بڑے زمیندار ابوالباصر چوہدری تمنگ چنگی کی بیٹی سے شادی کی، اور اپنے خسر اور علاقے کے عام مسلمانوں کے تعاون سے مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ کی بنیاد رکھی، اور وہیں پڑھاتے رہے''۔

اب ضرورت یہ ہے کہ میں نے تذکرۂ علامہ سید الامینؒ میں حضرت مولانا مفضل احمد صاحب کی حقیقی پھوپی میمونہ خاتون کے والد کا نام انور علی لکھا ہے، جب کہ اس کا نام میمونہ خاتون اور والد کا نام علیم الدین بن غلام علی تھا، جو حضرت مولانا شاہ عبید اللہ سندی فرانگی کی اہلیہ تھی، البتہ اس میمونہ خاتون کے

نام نامی اورایک میمونہ بنت انورعلی تھی ضرور(ہمشیرۂ ابوالخیر بلی) جوحضرت مولانا شاہ حافظ مخلص الرحمن بیولہ فاروی(کجافوی) کی اہلیہ تھی،دونوں میمونہ خاتون ظاہر ہیں کہ ہرایک اپنے وقت کے دوشیوخ کی بیویاں تھیں۔

مولانا مفضل احمد صاحب کے متعلق میرے نانا جان جناب مفضل احمد صاحب بانگونوی نے بتایا کہ:

''حضرت مولانا مفضل احمد صاحب کوان کے اپنے زمانے کے ہمارے علاقے بھر میں سب سے بڑا عالم تصور کیا جاتا تھا،آپ جہاں بھی جاتے میر مجلس آپ ہوا کرتے تھے،علمائے کرام آپ کونہایت احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے،کسی کی کیا مجال آپ کے سامنے لب کشائی کرتے، ہرکجا آپ کے فیصلے کوآخری فیلہ مانا جاتا تھا،بہت اعلی صفات کے بزرگ ترین عالم دین تھے''۔

حضرت مولانا مفضل احمد کجافوی صاحب کے حوالے سے میں نے آج سے تقریبا بارہ سال پہلے سن ۲۰۰۸ء میں آپ کے ایک شاگرد رشید استاد محترم مولانا حمید اللہ کوثرؔ صدیقی کوائندنگی (مرحوم) سے چاٹگام میں ملاقات کی،دراں حالیکہ کوثر صاحب ترک وطن کرکے جامعہ دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام کے قریبی رہائشی علاقے میں مقیم تھے،آپ نے بتایا کہ:

''حضرت مولانا مفضل احمد صاحب میرا شفیق استاد تھے،آپ سے میں نے عرصۂ دراز تک استفادہ کیا،شک نہیں ہے کہ ہمارے علاقے میں آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے عالم دین تھے،آپ محدث،مفسر اوراعلی درجہ کے فقیہ ودانا انسان تھے،اورساتھ ہی ساتھ معلم اورمنتظم بھی''۔

مولانا سید اکبرؒ صاحب منگنماوی،منگڈویؒ:

حضرت مولانا سید اکبر صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانے کے جیداہل علم وفضل میں سے تھے۔جو محترمہ شفیقہ بیگم(اہلیہ محترمہ حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماویؒ) کے بزرگ نانا تھے،مولانا معقول ومنقول میں یدطولی رکھتے تھے،ساتھ ہی ساتھ وعظ ونصیحت رشدوہدایت،دعوت وتبلیغ میں بھی یکتائے روزگار تھے،علاوہ ازیں خدمت خلق ان کا شیوہ بن چکی تھی،اورسیاسیات وسماجیات میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند تھا،آپ کے متعلق صدیق مکرم جناب ڈاکٹر دین محمد صاحب(صاحب زادہ گرامی حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماویؒ) کا بیان ہے کہ:

''میرے پرنانا جان حضرت مولانا سید اکبر صاحب بڑے عالم دین،مفسر،محدث، فقیہ اورمعقولی بزرگ تھے،آپ نے زندگی بھرعلم دین اورعلماء وصلحاء اورعوام الناس کی خدمت کی،علاوہ ازیں آپ بڑے داعی اورمبلغ تھے،آپ کی نصیحت وپند میں خاصی جان تھی،عوام الناس آپ کی تقریر پرتڑپ جاتے تھے،دوران پند ونصیحت ہرکہیں ہاہوکا عالم ہوتا تھا،جہاں تک میں نے سنا کہ عوام الناس کی ایک جم غفیر نے آپ کے مبارک ہاتھ میں توبہ کی، بہت سارے بندگان خدا آپ کی وجہ سے راہِ راست پرآگئے تھے،،بڑے خداترس عالم دین اورداعی الی اللہ تھے''۔

مولانا شبیر صاحب منگالوی کا بیان ہے کہ :

'' مولانا سید اکبر صاحب رحمۃ اللہ جومحترمۂ مرحومہ شفیقہ بیگم(اہلیہ حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماویؒ) کے بزرگ نانا تھے،وہ درحقیقت اسلام کے ایک بلند پایہ مفکر تھے،مشاہیر علمائے ارکان میں ان کا شمارتھا،علاقہ میں ان کے قول کوقول فیصل سمجھا جاتا تھا، جہاں بھی جاتے یادالہی میں مشغول رہا کرتے تھے،نہایت پاکیزہ صفات کے بزرگ ترین انسان تھے،کسی کودکھ دینا توکجا آپ ہرکہیں لوگوں کوراحت پہنچانے کوشش میں سرگرداں رہا کرتے تھے،مولانا نے اپنے علاقے میں وفات پائی اورخاک وطن کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں،اللہ تعال آپ کے درجات بلند فرمائے،آمین یا رب العالمین''۔

مولانا نورالکبیر مجذوب صاحب منگنماوی، منگڈویؒ:

مولانا نورالکبیر مجذوب صاحب محترمہ شفیقہ بیگم (اہلیہ محترمہ حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماویؒ) کے والد بزرگوار تھے، کہا جاتا ہے کہ مولانا تعلیم علوم دینیہ سے فراغت کے بعد کسی اہل اللہ کے ہاتھ میں بیعت ہوئے، جس کے بعد ان میں جذب ومستی طاری ہوگئی تھی، آئے دن ان پر حال طاری رہتا تھا، جس سے دم آخر تک خلاصی نہیں ملی۔

یوں بھی سرزمین ارکان میں ان جیسی چند بزرگ ہستیاں اور بھی دیکھی گئیں، جیسے حضرت مولانا عبد الجبار المعروف بہ فقیر مولوی صاحب سعد اللہ چری۔ روایت ہے کہ مولانا عبد الجبار صاحب نے دار العلوم دیوبند میں پڑھائی کے دوران حضرت مولانا اصغر حسین صاحب دیوبندی کے ہاتھ میں بیعت کی تھی، فراغت کے بعد وطن واپس آئے، اور ان پر آئے دن حال طاری رہتا تھا، ان کی طرح جنوبی منگڈو میں ایک عالم دین بزرگ بھی دیکھا گیا، جن کا نام گرامی مولانا محمد حنیف خونیہ فاروی تھا، وہ بھی دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، اور ان پر بھی جذب ومستی اور حال طاری رہتا تھا، اور موخر الذکر ان دونوں بزرگوں کے تصرفات وکرامات اور خرق عادات کی داستانیں زبان خاص وعام میں ملتی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح مولانا نورالکبیر صاحب مجذوب کا حال تھا، آئے دن مولانا حالت جذب ومستی میں گاؤں درگاؤں پھرتے تھے، جذب ومستی کی حالت میں آپ ٹیکناف گئے، جہاں سے جریرۂ زین زیرہ (جسے سین مارٹن بھی کہا جاتا ہے) پہنچے، اور وہیں آپ کا انتقال ہوگیا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا نورالکبیر مجذوب کے متعلق صدیق مکرم جناب ڈاکٹر دین محمد صاحب کا بیان ہے کہ:

> ”میرے نانا جان حضرت مولانا نورالکبیر مجذوب صاحب ایک اچھے اور صاحب لیاقت عالم دین تھے، عنفوان شباب سے شنید ہے کہ ان پر حال ومستی غالب تھا، ان کو لوگوں سے مل ملاپ سے زیادہ عزلت پسندی اور گوشہ نشینی پسند تھا، کبھی کبھار سیر وسیاحت کے لئے نکل جاتے تھے، عمر آگے بڑھی تو ان پر حال مستی کا غلبہ ہوگیا تھا، اسی حالت میں وہ ٹیکناف ہوتے ہوئے جزیرۂ زنزیرہ پہنچے اور وہیں ان کا انتقال ہوا، اور وہیں دفن ہوئے“۔

مولانا زین العابدین صاحب کھولاربیلویؒ:

حضرت مولانا الحاج زین العابدین بن محمد حنیف کی ولادت باسعادت ۱۳۱۵ھ میں کھولاربیل شمالی منگڈو میں ہوئی، آپ کے والد محمد حنیف صاحب روشن ضمیر اور علماء دوست آدمی کی حیثیت سے علاقے میں معروف تھے، انسانی اور سماجی کاموں سے ہمیشہ لگا رہتے تھے۔

مولانا زین العابدین کی ابتدائی تعلیم منگالہ کے ایک دینی مدرسہ میں ہوئی، جہاں آپ نے حضرت مولانا مقبول علی صاحب سے دینیات کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر شقدار پارہ اسکول میں جاداخل ہوئے، یہاں دوایک سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد حنڈل چلے گئے، وہاں کے ایک سرکاری مدرسہ سے ساتویں جماعت مکمل کرنے کے بعد اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان تشریف لے گئے، جہاں ایک نواب صاحب کے مدرسہ میں داخلہ لیا، اور اسی مدرسہ میں خاص طور پر حضرت مولانا حبیب احمد صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا، پھر مدرسہ عین العلم شاہ جہاں پور میں جاداخل ہوئے، اور مولانا عبد الغنی صاحب سے ۱۹۲۵ء میں دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔

فراغت کے بعد مولانا وطن واپس آئے، اور کھولاربیل کی جامع مسجد کے بغل میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد رکھی، جہاں طلبہ کے ساتھ ساتھ طالبات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ پھر آپ نے یہ مدرسہ ۱۹۲۷ء میں اس جگہ منتقل کرلیا، جہاں آج جامعہ اسلامیہ کھولاربیل موجود ہے، آپ اسمدرسہ میں ۱۴۳۲ء تک تعلیم دیتے رہے، اور اسی سال نہ جانے کس وجہ سے مدرسہ چھوڑ کر رنگون تشریف لے گئے تھے۔ رنگون میں تین سال گزار کر پھر ارکان واپس آئے اور ناری بیل کے مدرسہ میں پانچ سال تک یعنی ۱۹۴۰ء تک پڑھاتے رہے تھے۔

۱۹۵۰ء میں آپ نے عارف کامل حضرت پیر محمد ہاشم صاحب بازاری بوسیدنگی کے ہاتھ میں بیعت کی، ان کی بیعت کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ”مولانا موصوف کی بیعت کا واقعہ بھی بڑا عجیب ہے کہ ایک مرتبہ (لگ بھگ ۱۹۵۰) میں پیر شاہ محمد ہاشم صاحبؒ پر امپرو میں جناب عبد السبحان صاحب رواسوگری کے گھر تشریف لائے اور تقریر فرمائی، اس مجلس میں مولانا موصوف

بھی تھے ، مولانا موصوف نے پیر صاحب سے تین سوالات کئے ، شاہ صاحب نے تینوں کے تسلّی بخش جوابات دیئے، جوابات سن کر مولانا موصوف سمجھ گئے کہ اس قسم کے جواب اللہ والے ہی دے سکتے ہیں ، چنانچہ مولانا موصوف حضرت شاہ صاحب کے ہاتھ بیعت کر لئے‘‘۔

اس کے بعد مولانا موصوف اپنے پیر ومرشد پر گرویدہ ہوگئے تھے ۔ بعد میں آپ نے صاحب بازار بوسیدنگ کی راہ لی، اور اپنے پیر کے دربار میں حاضر ہوئے ، یوں انہوں نے پیر ومرشد کی خدمت کو ہرز جان بنالیا ۔ اور ایک مدت گزرنے کے بعد حضرت ہاشم نے مولانا موصوف کو خرقہ خلافت سے نوازتھا۔

خلافت واجازت کے بعد مولانا موصوف نے اپنے پیر ومرشد کی طرح رشد ہدایت اور بیعت کا کام شروع کیا تھا، یوں ہزاروں بندگان خدا کو آپ کے دربار سے ہدایت اور ایمان ویقین کا نور ملا تھا۔آپ نے بہتوں کو خلافت سے بھی نوازا تھا، ان خلافت یافتوں میں درج ذیل حضرات نا قابل فراموش ہیں۔

(۱) حضرت مولانا عمر فارق صاحب ہنزدہ برما۔
(۲) حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب۔
(۳) حضرت مولانا حافظ بشیر احمد صاحب شرف الدین بیلوی منگڈو۔
(۴) حضرت مولانا رشید احمد صاحب، نہلا، بنگلہ دیش۔۔
(۵) جناب میاں جی ناظر حسین صاحب سندی پرانگ بوسیدنگ۔
(۶) حافظ مولانا ابوالقاسم صاب سابری گوانگ، بوسیدنگ۔
(۷) صوفی اشرف الزمان صاحب، حلقہ نمبر ایک، بوسیدنگ۔

مولانا ایک جید عالم دین تھے، بزم شریعت کے صدر نشین بھی ، علاوہ ازیں آپ ایک صاحب تصنیف بزرگ بھی ہیں ، ان کی چند تصانیف منظر عام پر آئیں اور بہتوں تصانیف تاحال غیر مطبوعہ ہیں، تصانیف میں سے چند کا مختصر تعارف حاضر خدمت ہے ۔

(۱) سراج الفتوی لأ ہل التقوی ۔ آپ نے یہ تصنیف بڑی شان سے لکھی اس تصنیف کو منظر عام پر لانے کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ شمالی منگڈو کی بستی کیاری

پرانگ میں ایک مولوی صاحب تھے ، جنہوں نے مہیش بھنڈاری اور مرزا کیلی (۱) سلسلوں میں کام کرنے والوں کی حمایت میں فتاوی لکھی ، تو حضرت مولانا نے اس فتوی کے جواب میں سراج الفتاوی تحریر فرمائی ، اور مسلمانوں کو طریقت کے نام پر گمراہ کرنے والوں کی سازش سے بچایا تھا ۔

(۲) القصیدۃ الحبیبیۃ فی نعت خیر البریۃ ۔عربی زبان میں سرکار دوجہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح وتعریف میں یہ منظوم لکھی تھی ۔
(۳) حیات العاشقین ۔اردو نثر میں بہت اچھی کتاب ہے۔
(۴) فضائل سخاوت ۔
(۵) مثنوی مولانا زین العابدین ۔
(۶) مثنوی قدرت ربانی بعظمت محبوب سبحانی ۔
(۷) مثنوی عشق ربانی وآتش روحانی۔

ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کے نام درج ذیل ہیں :

(۱) فضائل تفکر۔
(۲) فضائل خدام العلوم۔
(۳) فضائل عقل۔
(۴) فضائل شکر۔
(۵) فضائل حقیقی نماز۔
(۶) فضائل ذکر خفی۔

---

(۱) یادر ہے کہ موضع کیاری پرانگ میں ان دونوں مذکورہ طریقوں پر کام کرنے والوں کی دو جماعتیں پائی جاتی ہیں، مہیش بھنڈاری طریقہ پر کام کرنے والے تو مرفوع القلم ہی ہیں، البتہ مرزا کیلی (جو اپنے طریقہ کو سلسلۂ عالیہ ابو العلائیہ چشتیہ کے نام سے مشہور کرتے ہیں) والے نماز وروزہ وغیرہ کے پابند تو ہیں ،مگر فروعات میں جمہور مسلمین سے بہت کچھ اختلاف بھی رکھتے ہیں ، دونوں طریقوں کے لوگ سجدۂ تحیہ کو جزو طریقت سمجھتے ہیں۔

(۷) فضائل دعاء۔

(۸) فضائل علماء۔

(۹) فضائل حیاورسالہ الغضبان۔

حضرت مولانا زین العابدین ایک عالم باعمل اور مثالی انسان تھے، آپ نے اپنی زندگی قوم وملّت کی خدمات میں گزاری، اور ۲۰ ربیع الثانی ۱۴۰۵ بمطابق ۱۳ رجنوری ۱۹۸۵ء میں آپ اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ع آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب گارڈ بیلی، منگڈ ویؒ:

حضرت مولانا محمد ادریس بن ماسٹر عبدالرشید کی ولادت تقریباً ۱۹۳۰ء میں شمالی منگڈو کی بستی گارڈ بیل میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم اگرچہ ایک ماسٹر اور سرکاری عہدے دار تھے، مگر بڑے دین دار، خداترس اور پرہیز گار آدمی تھے، ۱۹۴۲ء کے واقعۂ کرب وبلا کے دوران ماسٹر صاحب کسی کام کے لئے منگڈو تشریف لے گئے تھے، تو موقع پا کر ظالم مگھوں نے آپ کو شہید کردیا۔

مولانا محمد ادریس صاحب ان کے والد گرامی کی شہادت کے وقت بارہ سال کا ہونہار لڑکا تھے۔ والد کی شہادت کے بعد آپ کو آپ کے عظیم المرتبت ماموں سرزمین ارکان کے معروف ولی کامل حضرت مولانا عبدالجبار معروف بہ فقیر مولوی صاحب نے اپنے آغوش تربیت میں لیا، یوں ایک شہادت سے سرفراز ہونے والے خادم قوم کا فرزند ایک ولی کامل کی زیر تربیت آ گیا تھا۔

آپ کی ابتدائی تعلیم علاقے کے مدارس اور مکاتب میں ہوئی تھی، کچھ بڑے ہوئے تو نامور ماموں کی ہدایت پر چاٹگام کی معروف درسگاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری جا داخل ہوئے، چند سال وہیں تعلیم حاصل کر کے ۱۹۵۸ء میں سند فراغت حاصل کی، یہاں تعلیم کے دوران انہوں نے اپنا اصلاحی تعلق مدرسہ معین الاسلام کے اس وقت کے مہتمم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ومجاز حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کیا تھا۔

آپ فراغت کے بعد اپنے وطن واپس آ گئے، مگر اپنے صاحب دل اور صاحب نظر ماموں نے پھر دوبارہ ہاٹھزاری کو بھیج دیا تھا، اور بھیجتے وقت ہدایت کی تھی کہ دورۂ حدیث کی کتابیں دوبارہ پڑھیں اور ساتھ ہی ساتھ شیخ طریقت کی خدمت کو اپنا حرز جان بنالے، چنانچہ آپ نے اپنے ماموں کی ہدایت وتاکید کے مطابق دورۂ حدیث کی کتابیں بھی دوبارہ پڑھیں اور اپنے شیخ طریقت کی دل کھول کر خدمت کی، اور اپنی اصلاح کی کوشش میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی تھی، چنانچہ حضرت مولانا عبد الوہاب صاحب نے آپ کو سند خلافت کے ساتھ ساتھ بیعت تلقین کی اجازت بھی عطا کی۔

۱۹۵۹ء کی ابتداء میں آپ پھر سے وطن آ گئے، اور دارالعلوم احمدیہ سعد اللہ چر میں مدرس مقرر ہوئے، اور اسی سال یعنی ۱۹۵۹ء میں حضرت مولانا عبدالجبار صاحب کے انتقال پر مجلس شوری

نے آپ کو جامعۂ مذکورہ کا مہتمم بنایا، یوں آپ نے سالوں تک اس عظیم درسگاہ کے مہتمم کی حیثیت سے دینی وتعلیمی فریضہ انجام دیا تھا، آپ کے دور میں نہ صرف اس درسگاہ کی شہرت ملک اور بیرون ملک تک پھیلی بلکہ علمی اور روحانی اعتبار سے سارے ملک پر اس کی طوطی بولنے لگی تھی، یہاں آپ کی انفاس روحانیہ نے عرفان کا ایک دریا بہادیا تھا ۔

مولانا محمد ادریس صاحب کے ہزاروں کی تعداد میں متعلقین ومریدین سرزمین ارکان میں پائے جاتے تھے، اور اب بھی ہیں، بیعت وارادت اور اصلاح خلق کے حوالے سے حضرت نے وطن عزیز کے طول وعرض میں اپنی زندگی میں درجنوں سفر فرمائے تھے، غالبا ۱۹۸۱ء کا زمانہ تھا، حضرت مولانا تبلیغی سلسلے میں بوسیدنگ تشریف لائے تھے، جہاں آپ کے ہزاروں متعلقین پہلے سے موجود تھے، اس مرتبہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ نہ صرف عوام بلکہ وقت کے بڑے بڑے علماء نے بھی آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اپنے اپنے اصلاحی تعلق کو حضرت کے ساتھ جوڑا تھا، مجھے اس دوران اور بعد میں بھی حضرت کے چند مجالس میں بیٹھنے اور سننے کی سعادت نصیب ہوئی تھی، اگر چہ میں بہت چھوٹا تھا، درجہ ہفتم کا طالب علم تھا، مگر پھر بھی یہی احساس ہوا تھا کہ حضرت ایک غیر معمولی انسان اور وقت کے ایک عظیم المرتبت شیخ طریقت تھے، میں نے اپنی آنکھوں سے ان کی تقریر کے دوران لوگوں کو تڑپتے دیکھا تھا، ہا ہو کا ایک عجیب وغریب سماں دیکھا، لگتا تھا کہ رحمت خداوندی کی بدلی چھائی ہوئی ہے، رہ رہ کر کیف ومستی کی ایسی بارش برستی ہے کہ ہر ایک اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس علم وعرفان کی بارش سے سیراب ہو رہا ہے، مولانا کی ذات میں عجیب قسم کی کشش اور جاذبیت تھی، ایک من موہنی شخصیت تھی، خوب صورت چہرہ کے مالک، لوگ آپ کو دیکھتے ہی فدا ہو کر رہ جاتے تھے ۔

مولانا محمد ادریسؒ اپنے زمانے میں ایک طرف بزم علم وعرفان کے صدر نشین تھے تو دوسری طرف رزم وپیکار کے شہسوار بھی تھے، آپ اس وقت کی ایک قومی وملّی تنظیم خدام الاسلام جو بعد میں حمایۃ الاسلام کے نام سے مشہور ہوئی تھی کے رکن رکین تھے، حمایۃ الاسلام نامی اس تنظیم کے اصل محرک حضرت مولانا مفتی محمد یوسف بن حضرت مولانا عبد الحمید فتح پوری چاٹگامی رحمۃ اللہ علیہ تھے، ہاٹھزاری کے قریب اس تنظیم کے سائے تلے چلنے والا ایک عظیم الشان مدرسہ بھی ہے، جسے دنیا والے

مدرسہ حمایت الاسلام کے نام سے جانتے ہیں، یہ ایک بامعنی تنظیم تھی، جس میں حضرت مولانا محمد یوسف فتح پوری کے علاوہ حضرت مولانا مظفر احمد مینگزوی (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ) مولانا نورالاسلام انصاری، خطیب اعظم حضرت مولانا صدیق احمد شیخ الحدیث مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب گوزی بیلی، مولانا حافظ ابو طاہر اکیابی، حضرت مولانا دین محمد شہید فرنگی، حافظ ابو القاسم صاحب اور ہمارے ممدوح حضرت مولانا محمد ادریسؒ جیسے حضرات شامل تھے، اس تنظیم کی بنیاد ۱۹۷۱ء میں پڑی تھی، جو حضرت مولانا عبد الوہاب مجاز بیعت حضرت تھانوی کی سرپرستی میں چلتی تھی ۔

۱۹۷۷ء میں حضرت مولانا مظفر احمد صاحب مینگزوی کی زیر قیادت خلافت کمیٹی بنی تو حضرت مولانا محمد ادریسؒ اس میں شامل ہوئے تھے، ان دونوں تنظیموں کے سائے تلے آپ نے مسلمانان ارکان کی بڑی بڑی خدمات سرانجام دی تھیں ۔

حضرت مولانا محمد ادریس جس طرح ظاہر میں خوب صورت تھے، اس طرح سیرت کے اعتبار سے بھی خوب سیرت انسان تھے، ہاتھ میں عصا، تن پر جبّہ اور سر پر عمامہ لباس کا لازمی حصہ تھا، بڑی درویش صفت انسان تھے، اللہ تعالی کے اس ولی کامل نے اپنی زندگی میں سرزمین ارکان کے طول وعرض میں علم وعرفان کا دریا بہادیا تھا، آپ کو پند ونصیحت کا عمدہ ملکہ تھا، آپ کی زبان مبارک میں بلا کی تاثیر تھی، حضرت مولانا نے اپنی زندگی میں جو کوشش کی تھی، اس کا اثر اب بھی اس زمین میں باقی ہے۔ حضرت کا انتقال ۱۹۸۲ء میں اپنے آبائی گاؤں لندوسرا میں ہوا، اور وہیں مدفون ہوئے ۔

حضرت مولانا سید الامین صاحب سے حضرت مولانا محمد ادریس کا بہت اچھا تعلق رہا تھا، قومی اور ملّی امور میں ایک دوسرے کے ساتھ مشورہ بھی کرتے رہتے تھے، مولانا سید الامین صاحب کو حضرت مولانا محمد ادریس پر بڑا اعتماد تھا، اور سمجھتے تھے کہ حضرت کی رائے میں خاصی قوت ہوتی ہے، جہاں تک پتہ چلا کہ دونوں بزرگ ایک دوسرے پر خاصے اعتماد رکھتے تھے، یہ تھا ہمارے بڑے بڑوں کا شیوہ، آج ہم کس کام کے رہ گئے، بس خودستائی اور غرور وپندار کے شکار، خود تو کسی کام کے نہیں رہے، پر بزرگوں کی تنقید وتنقیص کے خوگر۔

حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب مینگزوی، بوسیدنگیؒ:

سرزمین ارکان کی مایۂ ناز ہستی حضرت مولانا شاہ مظفر احمد بن حاجی فضل الرحمن کی ولادت باسعادت ۱۹۲۷ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معروف بستی مینگزی میں ہوئی، آپ کے والد حاجی فضل الرحمن مرحوم نہایت سخی اور عالم دوست انسان تھے، اور حسن خلق اور صورت وسیرت کے اعتبار سے بھی اپنی مثال آپ تھے۔

مولانا مظفر احمد رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو دار العلوم تنگ بازار میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے اس علاقے کی معروف شخصیت، عالم دین حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا، اس کے بعد اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور ۱۹۴۷ء میں دارالعلوم دیوبند جا داخل ہوئے۔

مولانا مظفر احمد صاحب نے ایک روایت کے مطابق دارالعلوم دیوبند میں مسلسل گیارہ سالوں تک تعلیم حاصل کی، اور اس مادر علمی کے بڑے بڑوں سے خوب خوب استفادہ کیا، یہاں تمام اساتذۂ کرام کے یوں تو آپ نور نظر تھے، لیکن آپ کا خاص لگاؤ شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تھا، حضرت مولانا مدنی ایک طرف آپ کے استاد تھے تو دوسری طرف آپ کے شیخ طریقت بھی تھے، اس حوالے سے مکرمی مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ”مسلسل گیارہ سال تک دارالعلوم کے احاطے میں زندگی کے قیمتی لمحات اللہ والوں کی معیت میں گزارے، اور طالب علمی ہی کے دور میں شیخ العرب والعجم مولانا حسین احمد مدنی کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کی رسم پوری کی، جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی دور اندیش نگاہ سے مولانا ممدوح کی غیر معمولی صلاحیت، قائدانہ قابلیت اور مجاہدانہ کردار کو دیکھا، تو ۱۹۵۷ء میں خرقۂ خلافت عطا کیا، اور فیض رسانی کی خاطر بیعت کی بھی اجازت دے دی، ۱۹۵۷ء میں تو حضرت ممدوح نے دارالعلوم کی چاردیواری سے فراغت حاصل کی، لیکن زہے نصیب ۱۹۵۷ء میں باطنی علوم اور عشق الٰہی کے بحر بے کنار کی طرف گامزن ہونے کا آغاز ہوا“۔

فراغت کے بعد آپ وطن آئے اور اپنے آبائی گاؤں میں ایک مدرسہ کی بنیاد ڈالی، آپ نے بہت ہی قلیل مدّت میں اس مدرسہ کو ایک جان دار درسگاہ بنادیا، آپ کی جان توڑ کوشش اور اخلاص وللّٰہیت کی وجہ سے ملک بھر میں اس درسگاہ کی شہرت ہوئی، آپ خود بھی اس درسگاہ میں درس دیتے رہے، اور مرتے دم تک اس مدرسہ کی خدمت میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑی، اس مدرسہ میں دورۂ حدیث تک کی تعلیم ہوتی رہی، ماشاء اللہ یہ آپ کے اخلاص کا ثمرہ ہے کہ حضرت کے انتقال کے بعد بھی یہ درسگاہ بڑی خوش اسلوبی سے چل رہی ہے، یوں تو آپ کی پوری زندگی قال اللہ وقال الرسول کی تدریس میں اور ساتھ ہی ساتھ ارشاد وتلقین میں گزر گئی، مگر اپنے شیخ کی طرح آپ بھی بڑے آن بان اور شان کے بزرگ تھے، قال وحال کے سنگم، زمانے کی آب وہوا سے واقف، رزم وبزم کے شہ سوار، مدرسہ میں ہیں تو بے مثال استاد ومعلّم، میدان سیاست میں ہیں تو دور اندیش سیاست دان، اور قافلۂ تحریک وجہاد میں ہیں تو ایک مجاہد فی سبیل اللہ اور رزم گہ الفت کا عظیم المرتبت شہوار۔

۱۹۷۱ء میں آپ نے دیگر اعیان سے مل کر چاٹگام میں ارکانی مہاجرین کی فلاح وبہبودی کے لئے ایک رفاہی تنظیم کی بنیاد رکھی تھی، جس کے سرپرست اعلی خطیب اعظم حضرت مولانا صدیق احمد صاحب سابق شیخ الحدیث مدرسہ ضمیریہ پٹیہ تھے، اور مفتی محمد یوسف بن مولانا عبدالحمید فتح آبادی خطیب اعظم صاحب کی نیابت کا فریضہ انجام دیتے تھے، جبکہ اس تنظیم کے امیر مولانا مظفر احمد مینگزوی تھے۔ ان بڑے بڑوں میں امت مسلمہ اور انسانیت کی خدمات کے حوالے سے جو جذبے اور ولولے دیکھے گئے تھے، وہ اپنی مثال آپ تھے، علاوہ ازیں مولانا محمد ادریس صاحب سعد اللہ چری اور مولانا نورالاسلام صاحب انصاری بھی اس تنظیم میں شامل تھے، پہلے پہلے اس رفاہی تنظیم کا نام خدام الاسلام رکھا گیا تھا، بعد میں نام کی تبدیلی کے ساتھ حمایۃ الاسلام سے مشہور ہوئی تھی۔

اسی طرح سرزمین ارکان کے علمائے اسلام نے اور ایک تنظیم کی بنیاد رکھی تھی، جس کا نام خلافت کمیٹی تھا، اس میں بھی حضرت مولانا ممدوح مرکزی امیر رکھ چکے تھے، بعض لوگوں نے آپ کو خلیفۃ المسلمین کا لقب بھی دیا تھا، ان مذکورہ دونوں تنظیموں نے اپنے اپنے وقت میں بہت ہی نمایاں کام بھی انجام دیا تھا۔

ان دونوں تنظیموں کے بعد گئی صدی کی آٹھویں دہائی کے اواخر میں مولانا محمد حنیف راغبؔ کی

قیادت میں اتحاد المجاہدین نامی تنظیم کی بنیاد پڑی تو کہا گیا تھا کہ اس موخر الذکر تنظیم کے چار سرپرست اعلی تھے، جن میں سے ایک حضرت مولانا ممدوح اور بقیہ تینوں بزرگوں کے نام یہ ہیں کہ :

(۱) حضرت مولانا سعید الامین صاحب منگنماوی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) حضرت مولانا مفتی سلطان احمد صاحب سرپرست اعلی دار العلوم میانجان پورؒ ۔

(۳) حضرت مولانا عبد السبحان گرھاخالوی رحمۃ اللہ علیہ۔

اور ان چاروں بزرگوں میں بھی حضرت مولانا مظفر احمد صاحب کو سرپرست اعلی مقرر کیا گیا تھا، جب کہ مولانا محمد حنیف راغبؔ ان کی طرف سے نیابت کا فریضہ انجام دے رہے تھے، البتہ اس تنظیم کے مذکورہ دعوی کہاں تک صحیح تھا، اسے وہ لوگ ہی کہہ سکیں گے، جو اس تنظیم کے مؤسس یا رکن رکین رہ چکے تھے، مگر یہ دعوی شہرت کے حوالے سے حد تک پہنچا ہوا تھا، جب کہ بخلاف اس دعوے کے، بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ حضرت مولانا ممدوح سمیت ارکان کے ان مذکورہ بزرگوں کا بظاہر اس تنظیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، اللہ معلوم کہ کس دعوے میں سچائیت تھی، اور اس تنظیم کے ساتھ ہمارے ان بزرگوں کی کس نوعیت کا تعلق تھا، بہر حال درس وتدریس کے ساتھ ساتھ مولانا مظفر احمد صاحب نے سلسلۂ بیعت وارشاد کو بھی بڑی خوبی سے جاری رکھا، جہاں بھی گئے آپ نے ارشاد وتلقین کا سلسلہ جاری کیا۔ علماء وفضلاء کی سرپرستی اور رہنمائی کے علاوہ عوام الناس کے رشد وہدایت آپ کی زندگی کا ایک بڑا نصب العین رہا تھا، اسی وجہ سے آپ کے متعلقین ومریدین کا شمار بہت ہی مشکل ہے، ملک کے گوشے گوشے میں آپ کے متعلقین پائے جاتے ہیں، اسی طرح آپ کے خلفاء بھی بہت ہیں، اور آپ کے خلفاء تقریبا سب کے سب علمائے عظام پر مشتمل ہیں۔

۳۰/۱/۲۰۰۳ء کا واقعہ تھا کہ میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کی نیت سے ڈھاکہ پہنچا، تو مولانا محمد ناصر تنگ بازی نے مجھے فون میں اطلاع دی کہ اس روز ہوائی جہاز ٹیکنیکل خرابی کی وجہ سے پرواز نہیں کرسکتا، اور ایک روز مجھے ڈھاکہ میں انتظار کرنا پڑے گا، بعد میں مولانا ناصر صاحب نے یہ بتایا کہ اسی جہاز میں حضرت مولانا مظفر احمد صاحب اور مولانا سید الامین صاحب کے علاوہ بھی اور ایک بزرگ جانے والے تھے، اور سب حضرات مولانا ناصر صاحب کے گھر میں مقیم ہیں، مزید یہ بھی بتایا کہ اگر آپ (یعنی ناچیز) کو کوئی پریشانی نہ ہوتو آپ بھی میرے غریب خانے میں آسکتے ہیں، اب میں

نے ان بزرگوں کے نام گرامی سنے تو مولانا کی رہائش گاہ جانا مناسب سمجھا، یوں ایک ٹیکسی کے ذریعے ان کی رہائش گاہ پہنچ گیا، رات ان دونوں بزرگوں کے ساتھ گزارا، اور ان دونوں کے ساتھ مختلف علمی، فکری اور تحریکی موضوعات پر گفتگو بھی کی، دوران گفتگو میں نے حضرت شاہ مظفر احمد صاحب سے چند سوالات بھی کئے، جن میں سے کچھ یہ ہیں :

سوال : حضرت مولانا محترم! آپ کے کتنے خلفاء ہیں؟

جواب : دوسو کے لگ بھگ ہمارے خلفاء ملک وبیرون ملک میں ہیں۔

سوال : حضرت! کیا جنات میں بھی آپ کے خلفاء ہیں۔

جواب : جنات میں خلفاء کیسے؟ جنات سے خلافت چھین لی گئی، اس لئے جنات میں خلفاء نہیں اور نہیں ہوسکتے، البتہ مریدان بہت ہیں۔

سوال : سنتا ہوں کہ جنات کے ساتھ آپ کے بہت سے معاملات ہوتے رہتے ہیں، جبکہ حضرت مولانا مدنی رحمۃ اللہ کے دیگر خلفاء تو اس حوالے سے آپ جیسے نہیں ہوتے؟

جواب : عزیزم! میرا علاقہ ایک جنات کا علاقہ ہے، اس لئے مجھ سے جنات کا بہت ہی سابقہ ہوتا ہے، جب کہ حضرت مدنیؒ کے دیگر خلفاء کے یہاں جنات بہت کم ہوتے ہیں اس لئے انہیں جنات سے سابقہ نہیں ہوتا۔

اس کے بعد میں نے حضرت کو کچھ نصیحت فرمانے کی گزارش کی تو آپ نے فرمایا :

> ''انسان کے ہر معاملات میں خوف الہی ہو تو گمراہی چھو کر بھی نہیں گزر سکتی، خوف الہی انسانی زندگی کے لئے سب بڑا روشن چراغ ہوتا ہے، اسی لئے تم ہر حالت میں خوف الہی اور تقوی شعاری کو اصول زندگی بنالو! انشاء اللہ دنیا و آخرت میں کامیاب رہو گے، قرآن وسنت کو رہنما بنالو، ہدایت اسی میں ہے، قرآن وسنت میں ہر مشکلات کا حل موجود ہے، انسان کے لئے مشعل راہ یہی ہے''۔

حضرت مولانا آٹھ مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہوئے تھے، یوں سعودی عرب میں پائے جانے والے ہمارے براوری میں حضرت کے بے شمار مریدان ہیں، غالبا یہاں بھی حضرت کے بعض خلفاء پائے جاتے ہیں، یہاں پائے جانے والے غیر مقلدین سے چند مرتبہ آپ کی

گفتگو ہوئی تھی، اس حوالے سے حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''شعبان المعظم ۱۴۱۹ھ مطابق دسمبر ۱۹۹۸ء میں سعودی عرب میں مقیم موجودہ اہل حدیث (غیر مقلدین) کے ایک وفد نے (جو علماء پر مشتمل تھے) حضرت کی خدمت میں حاضری دی، حضرت سے وفد نے کہا کہ علماء دیوبند کے عقاید میں کچھ خامیاں ہیں، جن کے اصلاح ضروری ہے، اس وفد نے چند متنازعہ فیہ مسائل چھیڑے، راقم الحروف بھی وہیں تھا، اس وقت حضرت پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے، علماء دیوبند کا نام سن کر فورا اٹھ کر بیٹھ گئے، اور آمدہ وفد کے جملہ اعتراضات کے تسلّی بخش جواب دیئے، جوابات کیا تھے؟ بلکہ علوم ومعارف کی بارش تھی، اچانک برس پڑی تھی، جن سے وفد لاجواب ہو گیا تھا، پیر صاحب نے بعد میں، خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مجھے سعودی عرب کے مفتی اعظم سمیت دنیا کے کسی بھی بڑے سے بڑے اہل حدیث یا غیر مقلد عالم کے پاس لے جایئے، میں علماء دیوبند کا ادنی سا خادم ہوں، علماء دیوبند کے عقائد قرآن وسنت کی روشنی میں بیان کروں گا، اگر کسی بھی غیر مقلد عالم نے یہ ثابت کر دیا کہ فلاں عقیدہ قرآن کے خلاف ہے، فلاں عقیدہ سنت کے خلاف ہے تو میں اس وقت غیر مقلد بن جاؤں گا''۔

حضرت نے دو کتابیں بھی لکھیں، ان میں سے جلاء القلوب راقم کی نظر سے گزری، جو ۱۵۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس گراں قدر تصنیف میں آپ نے تصوف وسلوک کی بنیادی اور ضروری مباحث پر خاصی روشنی ڈالی ہے، اور دوسری تصنیف اشک اہالیان برما، میری نظر سے تو نہیں گزری، البتہ اس کا تذکرہ حافظ محمد صدیق صاحب نے کیا ہے۔

غرض حضرت مولانا ایک جید عالم دین، اہل دل شیخ طریقت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دور اندیش سیاست دان بھی تھے، آپ نے زندگی بھر ملک وملّت کی خدمات کیں، بالآخر حج بیت اللہ کے سفر کے دوران ۲۰۰۷ء میں وفات پائی، اور جنت المعلی میں مدفون ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا سلطان احمد صاحب فوئما لوی، بوسیدنگی:

حضرت مولانا سلطان احمد بن مولانا حبیب الرحمن بن فقیر کالا چاند کی ولادت باسعادت ۱۹۰۵ء میں جنوب منگڈو کی معروف بستی خونیہ فارہ میں ہوئی، آپ کے دادا مرحوم کالا چاند فقیر علاقے میں ایک درویش، خدا رسیدہ بزرگ اور مخلوق خدا سے پیار کرنے والے انسان کی حیثیت سے مشہور تھے، انہوں نے اپنی زندگی عبادت الٰہی اور خلق خدا کی خدمت میں گزاری تھی، جبکہ انہوں نے عبادت الٰہی اور مخلوق خداوندی کے تہ بتہ اپنی خانگی اور عائلی زندگی کو بھی روشن رکھا تھا، جوگیوں، سنیاسیوں اور راہبوں کی زندگی کبھی بھی نہیں گزاری تھی۔ فقیر صاحب کے پانچ بیٹے تھے،

(۱) جناب امیر علی مرحوم۔

(۲) حضرت مولانا حبیب الرحمن رحمہ اللہ، والد محترم حضرت مولانا سلطان صاحبؒ۔

(۳) جناب یونس علی مرحوم۔

(۴) جناب عبد الشکور مرحوم۔

(۵) جناب عبد المطلب مرحوم۔

مرحوم امیر صاحب کے پانچ بیٹے تھے، مگر سارے کے سارے اللہ تعالی کو پیارے ہو گئے، اور مرحوم یونس علی کے صاحب زادہ میں حضرت مولانا سید احمد صاحب مقیم حال کراچی قابل ذکر عالم اور میدان علم وعمل کے شہسوار ہیں، انہوں نے جہاد اسلامی میں حصے لے کر اس گھرانہ کا نہ صرف حق ادا کر دیا، بلکہ وہ ایک عظیم عالم دین ہونے کا ثبوت بھی پیش کر دیا تھا۔ مرحوم عبد الشکور صاحب کا صرف ایک بیٹا تھا، نام تھا ماسٹر عبد اللطیف، جنہیں ۱۹۴۲ء میں جاپانیوں نے شہید کر دیا، اسی طرح عبد المطلب مرحوم کے دو بیٹوں کو بھی اسی دوران شہید کر دیا۔ اللہ تعالی ان شہیدوں کے مراتب بلند کرے، آمین۔

مولانا حبیب الرحمن صاحب کو اللہ تعالی نے تین نرینے اولاد عطا کیں، اور انہوں نے تینوں کو زیور علم وفن سے آراستہ کیا تھا، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا سلطان احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) جناب ماسٹر صدیق احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

(۳) حضرت مولانا فیاض احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

مولانا کے خاندان کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے ہر مرد علم وعمل کے رسیا تھے، علم کی دولت سے ہر ایک مالا مال ہونے کی جد وجہد میں یکتائے روزگار تھے، اس خاندان کے علماء ہوں یا دانشوران، غرض ہر ایک علم وعمل کے ساتھ ساتھ جذبۂ قومی وملی سے سرشار تھے، مولانا حافظ صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا کا خاندان علمی حیثیت سے بہت اونچا تھا، اس خاندان کے ہر فرد کی سرشت میں وطن کی محبت، آزادی کا جذبہ، علم وعمل کا ولولہ، اور شعائر اسلام کی پاسداری و نگہبانی داخل تھی''۔

مولانا کی ولادت جس طرح غرض کی گئی ہے کہ خونیہ فارہ منگڈو میں ہوئی، بعد میں اس خاندان نے نقل مکانی کی، اور بوسیدنگ کا معروف قصبہ پوئمالی جا کر یہ خاندان از سرنو آباد ہوگیا تھا۔ چونکہ خاندان علم وعمل سے مالا مال تھا، تو یہاں کے مقامی لوگوں نے اس کا بھر پور استقبال کیا، اور ہر ممکنہ تعاون و امداد بھی فراہم کی تھیں۔

مولانا سلطان احمد صاحب کے والد صاحب حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب مرحوم ایک جلیل القدر عالم دین، درویش صفت عامل، دور اندیش مبصر، دور بین سیاسی، عمیق مفکر ہونے علاوہ خدمت خلق کے حوالے سے اپنے مرحوم والد فقیر کالا چاند کی طرح یکتائے روزگار تھے، علاوہ ازیں درس و تدریس کے حوالے سے یہاں تک معروف تھے کہ ''اگر کوئی لڑکا مولانا حبیب الرحمن کے سامنے زانوئے تلمذ خم کیا ہو تو وہ کسی نہ کسی میدان میں ماہر ہی بنے گا''۔ مولانا حبیب نے اپنے ہونہار لڑکا سلطان احمد کو کسی اور کام کاج میں لگایا نہ تھا، کیونکہ:

''چونکہ مولانا کی نورانی شکل یہ بتا رہی تھی کہ رب کریم نے انہیں دین کی حفاظت اور ملت کی حمایت کے لئے پیدا کیا، اس لئے انہیں دنیاوی تعلیم میں لگانے کے بجائے دینی تعلیم میں لگا دیا، تاکہ یہ لڑکا آگے جاکر مذہبی رہنما بن جائے''۔

بات والہانہ اور عاشقانہ اور محبت بھری ہے، الہامی نہ کہوں تو الہامی سے کسی طرح کم بھی نہیں ہے۔ بہر حال حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب نے اپنے اس بیٹے کی طرف خاص توجہ دی تھی، اور اس ذہین وفطین بچہ کو علم کی دولت سے مالا مال کرنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھی تھی۔

مولانا سلطان احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنے عظیم والد کے مبارک ہاتھ میں ہوئی تھی۔ پھر کیا کتو کے معروف مڈل اسکول (جس کا بانی مولانا یار محمد صاحب تھے، اور جس میں بیرسٹر زین العابدین نے عرصہ دراز تک تعلیم دی تھی) میں جاکر داخلہ لیا، عام روایت کے مطابق اس اسکول میں آپ نے دو سال تعلیم حاصل کی تھی، اور ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک اس اسکول میں آپ پڑھتے رہے تھے، پھر ۱۹۲۰ء میں بنگال پہنچے اور چاٹگام کی معروف سرکاری مدرسہ ''دارالعلوم چندن پورا چاٹگام'' میں جا داخل ہوئے، آپ نے یہاں ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۶ء تک تعلیم حاصل کی، پھر ۱۹۲۶ء میں اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندستان پہنچے، اور برصغیر کی نامور درسگاہِ علم وفن مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخلہ لیا، اور یہاں سے ۱۹۲۸ء میں آپ نے فراغت حاصل کی۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب مولانا کی ذہانت اور قوت حافظہ کے حوالے سے رقمطراز ہیں کہ:

''مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء کہتے ہیں کہ مولانا بے انتہا ذہین تھے، استاد کی پوری تقریر ہوبہو یاد کرلیا کرتے تھے، ایک حرف بھی آگے پیچھے نہیں ہوتا تھا، بلکہ بعض اوقات استاد سے دوران تقریر ایسے ایسے سوالات پوچھتے تھے کہ استاد بھی حیران ہوجاتے تھے، نکات، باریکیاں اور لطائف بیان کرنا مولانا کا معمول تھا، ایک استاد نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر اس لڑکے کی صحیح نگرانی ہوئی تو یہ کام کا آدمی بنے گا، ورنہ حد سے تجاوز ہونے کا خطرہ ہے''۔

آپ کی دو شادیاں ہوئی تھیں، ۱۹۳۰ء میں آپ نے پہلی شادی کی، مگر ان سے ناچاقی ہوگئی اور طلاق کی نوبت آگئی تھی، بعد ازاں دو سال کے بعد اور ایک حافظ قرآن لڑکی سے شادی ہوئی تھی، جس کے ساتھ بعد کی زندگی بڑی خوشگوار گزری، ایک روایت کے مطابق اس پچھلی بیوی نے حضرت کو غیرت دلائی تھی کہ ''میں تو حافظۂ قرآن اور آپ بس عالم ہیں، حافظ قرآن نہیں'' تو آپ نے قرآن

کریم کا حفظ کرلیا، ان کے قرآن کریم کے حفظ کرنے کے حوالے سے مولانا محمد صدیق صاحب نے اور ایک روایت بھی کی ہے کہ:

''انہی دنوں ایک اور واقعہ یوں پیش آیا تھا کہ مسجد میں ختم قرآن کے لئے کوئی مناسب حافظ تلاش بسیار کے باوجود نہ ملا، چنانچہ مولانا بہت ہی قلیل مدت میں (ایک قول کے مطابق ایک ماہ میں) حفظ قرآن کی دولت سے مالا مال ہوگئے۔''

بہر حال مولانا کی دوسری بیوی بڑی جید حافظۃ القرآن تھیں، مولانا ان کی بہت تعریف کرتے تھے، اس حوالے سے ایک واقعہ یاد آگیا، کچھ طویل ہے کہ سن ۱۹۸۰ء میں راقم الحروف جماعت ہشتم کا طالب علم تھا، ہمارے گاؤں میں شرعی مسئلہ کے حوالے سے فتوی بازی کا ایک معاملہ پیش آیا تھا، کہ معاملہ طلاق کا، علاقہ بھر کے علماء اس بات پر متفق تھے کہ طلاق واقع ہو چکا ہے، آخر کار یہ مسئلہ حضرت مولانا سلطان احمد صاحب کے سامنے پیش ہوا تو مولانا نے یہ فتوی جاری کیا کہ طلاق واقع نہیں ہوا ہے، اب علاقہ کے علماء نے شور مچانا شروع کر دیا کہ مولانا کا یہ فتوی غیر مقبول بلکہ مردود ہے، اس لئے کہ یہ فتوی احناف کے خلاف ہے، اب گاؤں کے بڑے بڑوں نے مولانا کو تشریف لانے کی دعوت دی تو مولانا تشریف لائے، ان کے آنے پر علاقے کے ان مذکورہ علماء کو ایک بڑی مجلس میں جمع کیا گیا، اور مولانا کے سامنے علاقے بھر کے علماء حاضر تھے، جن کے سرخیل حضرت کے ایک پرانے دوست حضرت مولانا مظہر الحق باغکونوی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحب زادے مولانا علی جوہر صاحب تھے ۔ اب مولانا نے مسئلہ کے حوالے سے بحث چھیڑی تو مولانا علی جوہر صاحب درمیان میں معترض ہوگئے، حضرت نے ان کو مختلف انداز میں بات سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ ماننے والے نہ تھے، اب مولانا کو رہا نہ گیا اور مولانا علی جوہر صاحب سے خاص طور پر مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

''مولوی علی جوہر! تمہارے والد حضرت مولانا مظہر الحق صاحب مرحوم نے پوری زندگی میری اتباع کی تھی، انہوں نے میرے سامنے کبھی بھی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی، حالانکہ وہ ایک جید اور جلیل القدر عالم دین تھے، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے فارغ التحصیل تھے، تم تو علم وفن سے تقریبا پاک صاف ہو، میں جو باتیں اصول و

فروع کے حوالے دے کر بتا رہا ہوں، وہ تمہاری سمجھ سے باہر ہیں، کیوں تم خواہ مخواہ شور مچا رہے ہو، تمہاری یہ حرکت میں نے تو برداشت کرلی، اگر میری جگہ پر تمہارے والد مرحوم ہوتے، شاید وہ برداشت کر سکتے''۔

شام ہوئی تو مجلس ختم ہوگئی تھی، میرے نانا جان جناب مفضل احمد صاحب جو مولانا مظہر الحق صاحب مرحوم کے دست راست، راز دار ساتھی رشتے میں بھانجے تھے، انہوں نے مولانا کو گھر تشریف لانے کی دعوت دی تو مولانا نے خوشی خوشی منظور کرلی، نماز مغرب کے اختتام پر میرے نانا جان نے حضرت سے گزارش کی کہ یہ میرے نواسا طاہر اس کا نام ہے، برکت کے لئے کچھ پڑھا دیں گے تو ہم مشکور ہوں گے، اب مولانا نے ہنس کر مجھے قریب بلایا، کچھ سوالات کئے، میں بھی ڈرتے ڈرتے جواب دیا، آپ بڑے خوش ہوئے، اور ''جملہ صرف'' لانے کا حکم کیا تو میں نے کتاب حاضر کی ، تو آپ نے نحو وصرف کے چند قوانین پڑھا دیئے تھے۔ دراں حالیکہ موسم برسات کا تھا، خوب بارش ہو رہی تھی، مولانا نے امین بالجہر اور رفع یدین کے ساتھ گھر ہی میں نمازیں پڑھائیں، اور نماز عشاء کے بعد ایک مجلس منعقد ہوئی، جس میں علاقے کے چند عالم اور چند معمر حضرات بھی حاضر تھے، دوران گفتگو میرے نانا جان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ:

''ہر رمضان المبارک میں میرا معمول ہے کہ تراویح میں اپنے گھر میں میری بیوی کی معیت میں ادا کرتا ہوں، قرآن میں پڑھتا ہوں تو میری بیوی سامع ہوتی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ قرآن اس کو یاد ہے، ماشاء اللہ اچھی حافظۃ القرآن ہے، میری زندگی میں وہ آئی تو میری زندگی ہی بدل گئی ہے، علاوہ ازیں رمضان المبارک میں کم سے کم تین مرتبہ پورے قرآن کریم اس کو سناتا ہوں وہ مجھے سنایا کرتی ہے۔''

مولانا انگریزی زبان وادب کے بڑے ماہر عالم تھے، ان کی انگریزی دانی کی شہرت کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں تھی، انگریزی عصری علوم کے تعلیم یافتہ حضرات آپ سے بہت ڈرتے تھے، اس لئے کہ آپ جس طرح ایک جلیل القدر اور بڑے شاندار عالم دین تھے، اسی طرح عصری علوم میں بھی آپ

دانشوروں سے کسی بھی طرح پیچھے نہیں تھے، انگریزی آپ نے طالب علمی کے زمانے میں نہیں سیکھی، بلکہ فراغت تعلیم کے بعد ہی اس زبان کی طرف متوجہ ہوئے تھے، انگریزی کی طرف آپ کی توجہ ہونے کے اسباب کے حوالے سے مختلف روایات سننے میں آئیں، ان میں ایک مولانا حافظ صدیق صاحب کے قلم سے ملاحظہ کیجئے:

''مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک بے تکلف دوست بی اے بشیر صاحب نے ایک مرتبہ مولانا سے مذاقاً کہا کہ یہ خط (جو انگریزی میں تھا) لیجئے اور ذرا پڑھ کر سنایئے کہ کیا لکھا ہوا ہے، اس سے مقصود یہ بتانا تھا کہ موجودہ دور میں انگریزی ایسی ضرورت کی چیز ہے کہ عربی علوم نہ بھی ہوں تب بھی گزارا ہو جاتا ہے۔ دوست ازراہ تفنن مذاق کیا تھا، یہ واقعہ مولانا کے انگریزی سیکھنے کے لئے نسخہ کیمیا ثابت ہوگیا۔ اور مولانا اس فکر میں مگن تھے کہ شوق نے ابھارا اور رخت سفر باندھ کر حج کی نیت سے بنگال تشریف لے گئے، وہاں جاکر معلوم ہوا کہ حالا حج کے لئے جانا مشکل ہے، بلکہ چند مہینے انتظار کرنا پڑیگا، کیونکہ اس زمانے میں بمبئی سے چھ ماہ میں ایک بحری جہاز حجاز مقدس جاتا تھا۔ مولانا کے دل میں الہامی طور پر خیال آیا کہ انتظار کا یہ زمانہ ویسے گزارنے کے بجائے کسی کام میں لگانا چاہئے، چنانچہ مولانا چاٹگام میں ٹھہر گئے، اور اپنے ایک دوست سے انگریزی سیکھنا شروع کردیا، بلکہ کتاب ہاتھ میں ہوئی تھی اور جو بھی انگریزی تعلیم یافتہ نظر آتا تھا اس سے پوچھتے، اس طرح پوچھتے رہے اور سیکھتے رہے، یہاں تک مولانا بھی انگریزی کے ماہر ہوگئے، جس کے بعد قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کردیا، جس کی طباعت کی نوبت نہیں آئی، ممکن ہے کہ اب تک مسودہ کی شکل میں موجود ہو۔ مولانا سید احمد مدظلہ لکھتے ہیں کہ مولانا نے انگریزی میں ترجمہ کیا ہوا نسخہ بوسیدنگ میں میرے سامنے بی اے جعفر مجاہد کو دکھایا تھا۔ مولانا نے اس لگن اور یکسوئی کے ساتھ تعلیم حاصل کی کہ اس کے بعد اپنے دوست بی اے بشیر صاحب کے پاس انگریزی میں خط لکھا

،اور بتایا کہ انگریزی میں مولوی لوگ بھی پیچھے نہیں ہیں۔''

حافظ محمد صدیق صاحب نے اپنی تالیف ''محدث ارکان'' میں حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب گرھا خالویؒ کا ایک تفصیلی رسالہ درج کیا ہے، یہ رسالہ حضرت نے حافظ صاحب کے چند سوالات کے جواب میں تحریر فرمایا تھا، اس میں حضرت مولانا سلطان احمد صاحب پوئمالوی کے متعلق طویل مگر معلوماتی مندرجات ہیں، ابھی میں اس رسالہ پر کسی قسم کے تبصرہ کئے بغیر متعلقہ مندرجات نقل کردیتا ہوں :

''آپ نے مولانا سلطان احمد پوئمالوی کے سوانح میں حفظ کے متعلق جو لطیفہ لکھا وہ غلط ہے، مولانا نے تقریبا نصف درجن شادیاں کیں، اور سب ان پڑھ ہیں ،صرف ایک اہلیہ کے جن کا ذکر آگے آتا ہے، مولانا کے دادایال خونیہ پارہ کے ہیں اور ننھیال اودنگ کے ہیں، میرا سسرال بھی اودنگ کے ہیں، کسی رشتہ کے اعتبار سے مجھے مولانا داماد کہتے ہیں، اور ہمارے محاورہ کے مطابق ابا کہہ کر خطاب کرتے تھے، اکثر فرمایا کرتے تھے ابا! میری خوش دامنیں تو بہت ہیں تقریبا نصف درجن ہوں گی، کچھ مرگئی اور کچھ طلاق ہوگئی۔ دائما دو تین ایک ساتھ رہتی تھیں، میں جس وقت اکیاب مارکین اسکول میں پڑھاتا تھا اس وقت میری تحریر اور مضمون دیکھ کر ایک کمائنگ کی لڑکی مجھ پر عاشق ہوگئی، باہم مراسلے کے بعد شادی ہوگئی، اردو تعلیم یافتہ تھی، نماز روزہ کی بھی پابندی تھی، ویسے تو کمائنگ لوگ نیم مگھ اور نیم مسلمان ہیں، مگر یہ میری خوش دامن دین دار تھی، مترجم قرآن شریف تلاوت کرتی تھی، ایک دن آیت "**نسائکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم الخ**'' کا ترجمہ دیکھ کر کہنے لگی کہ اچھا قرآن شریف میں عورتوں کا بھی تو ذکر ہے، اس واقعہ کو بڑے لطف امیز اور عجیب تبسم کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ انگریزی تفسیر لکھنے کا واقعہ بھی غلط ہے، اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بی اے ابوالبشر صاحب ایم پی سابق ممبر پارلیمنٹ برما، پر غبطہ کرکے انگریزی سیکھی ہے۔ کسی اسکول کالج میں نہیں پڑھا ۔کسی سے کچھ کسی سے کچھ اپنی ذہانت کی بناء پر الحمد للہ کچھ سیکھ لیا، مولانا کی

انگریزی استعداد تھی کہ ضروری خط خطوط لکھ سکتے اور پڑھ سکتے تھے، ضروری بول چال بھی کرتے تھے، اس سے زیادہ نہیں۔ مولانا اپنے بکس میں ایک ضخیم انگریزی ڈکشنری رکھتے تھے، کبھی کبھی نکال دیکھتے تھے اور ہمیں دکھاتے اور فرماتے یہ میرا استاد ہے۔ انگریزی تفسیر لکھنے کے لئے کتنی وسعت اور تبحر کی ضرورت ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ حفظ قرآن کا سبب فرماتے تھے کہ جاپان برٹش جنگ کے زمانے میں جب کہ کوئی کام خطرہ سے خالی نہیں تھا اس وقت میں نے ایک دودھ کی گائے پال رکھی تھی، جس کو میں خود چراتا تھا، گائے چراگاہ میں باندھ کر میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر قرآن یاد کرتا تھا، اس طرح سے میں حافظ قرآن ہوگیا۔ مولانا سلطان احمد مجھے حد درجہ پیار فرماتے تھے، چنانچہ ایک ماہ تک ساتھ سفر کیا، اس وقت مولانا کی دو بیبیاں تھی، چنانچہ آتے وقت دونوں میں سے جو خوش حال تھی اس کے گھر میں بکری ذبح کر کے کھانا کھلا کر رخصت کیا۔

اس کے بعد مولانا کے آخر دم تک آپس میں خبر گیری اور مراسلے جاری رہے، اس وقت میں نور اللہ پارہ میں تھا۔ مولانا کے چچازاد بھائی مولانا سید احمد کی خبر ہمیشہ سنایا کرتے تھے، وہ اس وقت مجاہدین میں پہاڑ میں تھے، آپ کی کتاب سے معلوم ہو اکہ وہ فی الحال پاکستان میں ہے۔ آپ نے مولانا کی فراغت کلکتہ عالیہ سے ذکر کیا ہے۔ حالانکہ مولانا فرمایا کرتے تھے مدرسہ رحمانیہ دہلی، انڈیا سے فراغت حاصل کی، جو کہ اہل حدیث کا مدرسہ ہے۔ ممکن ہے دونوں باتیں صحیح ہوں، باعتبار تعدد واقعہ کے، مولانا کے اندر تقلید کے بارے جو تذبذب پیدا ہوا تھا وہ اپنے اساتذہ کا اثر تھا۔ ہمارے زمانے میں خالص حنفی تھے۔، البتہ آمین کو ذرا سا جہر آواز سے کہتے تھے، جس کو دائیں بائیں کے دو آدمی سنتے، اور بھی فرمایا کرتے تھے کہ لوگ مجھے غیر مقلد کہتے ہیں، حالانکہ میں زندگی بھر شامی، عالمگیری سے فتوی دیتا رہا۔ یہاں غیر مقلد کی کتابیں کہاں۔ ہم کہتے تھے کہ ہم نے سنا کہ آپ کذا و کذا تھے، فرماتے تھے میں بالکل بے کس اور بے سہارا آدمی تھا، جب ہی تو میں

نے اپنے شباب میں صوفی محمد ہڈمن کی ایک ثیبہ سے شادی کی۔ کیونکہ وہ حاکم بھی تھے، زمیندار بھی تھے، اور یہاں کے جمہور کے خلاف جو باتیں کیں وہ تو اپنے علم اور قابلیت کے اظہار کے لئے۔ پھر ہم سوال کرتے کہ حدیث میں ہے "**من طلب العلم لیحاری به العلماء الخ**" تو فرمائے وہ جوانی کا جنون تھا، اب تو اس سے توبہ کر لی، مولانا حد درجہ ذہین ذکی، محنتی، عبادت گزار اور متواضع اور شیرین طبیعت کے حامل تھے، رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ"۔

اللہ تعالی نے حضرت مولانا کی ذات میں بے شمار خوبیاں اور رعنائیاں بخشی تھیں، جسمانی حسن و جمال کے ساتھ ساتھ باطنی اور معنوی خوبیاں بھی بے شمار اور انگنت عطا کی تھیں، ان کی شخصیت میں جاذبیت تھی، لوگ انہیں دیکھتے ہی فدا ہو جاتے تھے، ان کی شان وشوکت اور رعب داب کے سامنے ہر ایک شخص سرنگوں ہو جاتے تھے، جہاں بھی جاتے امیر کارواں اور میر مجلس آپ ہی ہوتے تھے، اور جہاں بھی بیٹھتے تو شمع انجمن اور میر محفل آپ ہی ہوتے تھے، کسی کی مجال نہیں ہوتی کہ ان کے سامنے باتیں بتاتے، اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے، بڑی شان وشوکت اور ان کے عالم دین تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے صاحب مجمع الکمالات عالم دین میں نے سرزمین ارکان میں ان کے علاوہ اور کسی کو نہیں دیکھا، ایسے عالم دین کو عالم ربانی نہ کہوں تو اور کیا کہوں، اللہ تعالی ان کی درجات کو بلند کرے۔

مولانا مرحوم فراغت تعلیم کے بعد وطن واپس آئے، اپنے علاقے میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، چند مدارس میں پڑھاتے رہے، بعد میں جامعہ عالیہ شقدار فارہ میں بطور محدث مقرر ہوئے، یہاں بھی چند سال پڑھائے، پھر ۱۹۵۰ء میں ان کے ہمجولی حضرت مولانا عبد المتین صاحب نے ہتالیہ میں ایک مدرسہ بنام "دار العلوم نظامیہ ہتالیہ" کی بنیاد رکھی تو آپ یہاں تشریف لائے، اور اپنے دوست کے ساتھ یہاں پڑھاتے رہے تھے، جب یہ مدرسہ بعض وجوہات کی بنیاد پر کائندہ فارہ منتقل ہو گیا تو آپ دوبارہ پوئمالی تشریف لے گئے، اور یہاں کے مدرسہ میں زندگی بھر درس حدیث وتفسیر اور دیگر علوم دیتے رہے تھے، آپ نے اپنی زندگی کو درس وتدریس اور فقہ وفتاوی کے لئے وقف کر دیا تھا، درس وتدریس کی شکل میں آپ نے علم وعرفان کا دریا بہا دیا تھا۔ آپ کے بے شمار تلامذہ ہیں، ان میں

سے مولانا حافظ صدیق صاحب نے چند حضرات کے نام اپنی مذکورہ کتاب میں درج کئے ہیں ۔تو لیجئے

(۱) مولانا حافظ احمد صاحب، مہتمم دارالعلوم فاروقیہ اورنگی ٹون، کراچی ۔
(۲) مولانا احمد حسین صاحب مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ، اورنگی ٹاون، کراچی ۔
(۳) مولانا عبدالمنیف صاحب، مقیم حال لانڈھی کراچی ۔
(۴) مولانا قاضی ابوالحسین صاحب، سوکواٹر کورنگی، کراچی ۔

مولانا محمد سلطان صاحب کے زمانے میں سرزمین ارکان میں دو مکاتب فکر کے علماء پائے جاتے تھے، دیوبندی مکتب فکر تو ظاہر ہے کہ اس کا مرکز دارالعلوم دیوبند تھا، دوسرا عالیوی مکتب فکر، جس کا مرکز مدرسہ عالیہ کلکتہ تھا، البتہ ان دونوں مکتب فکر کے علاوہ یہاں شاذ و نادر بریلوی مکتب فکر کے علماء بھی پائے جاتے تھے، مگر ان کا وجود گویا نہ ہونے کا برابر تھا، اور معاشرۂ ارکان میں ان کے لئے کوئی خاص جگہ بھی نہیں تھی، یہاں مشرب دیوبند کے حامل علماء تو انگنت تھے اور اب بھی ہیں، ان کے تہ بتہ عالیوی مکتب فکر کے علماء بھی بہت تھے، جن میں حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی خلیفہ ومجاز بیعت حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھی، مولانا اصحاب الدین صاحب زادی پرانگی، مولانا مظہر الحق صاحب باغگونوی، اور مولانا سلطان احمد صاحب پوئمالوی قابل ذکر ہیں، اور دیوبندی علماء میں حضرت مولانا صالح صاحب یونگ چنگی مولانا مفتی ابوالفضل صاحب لمبا بیلی، مولانا محمد حسین صاحب تنگ بازاری مولانا محمد صدیق صاحب پندوفرانگی وغیرہ قابل ذکر ہیں، تقسیم ہند کے بعد ارکانی طلبہ کا مدرسہ عالیہ وغیرہ میں جانا بند ہونے، اور ساتھ ساتھ دیوبندی مشرب کے مدارس کے بڑھ جانے کی وجہ سے ان دونوں مکاتب فکر کے علماء کے درمیان مشربی رسہ کشی جو خال خال یہاں پائی جاتی تھی بالکل ختم ہوگئی، ہمارے لڑکپن کے زمانے میں اگرچہ دیوبندی علماء عالیوی علماء کے مقابلہ میں اکثریت میں تبدیل ہو چکے تھے، مگر پھر بھی بوسیدنگ کے علاقہ میں ایک مولانا سلطان احمد صاحب کی وجہ سے بعض علمی اور فقہی مباحث اور فتاوی بازی کے دنگل میں عالیوی علماء کی جیت ہوا کرتی تھی ۔مولانا سلطان احمد صاحب اور ان کے ہم نوا مولانا مظہر الحق صاحب باغگونوی (جو فتاوی بازی کے حوالے سے بڑی ضدی اور غصیلے مشہور تھے) دنیائے فانی سے کوچ کر گئے تو عالیوں مکتب فکر کے حاملین کے ساتھ

دیوبندی علماء کی رشہ کشی بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی، اور جہاں تک حضرت مولانا عبدالسلام ارکانی گودام فاروی کا تعلق ہے، آپ ایک جلیل القدر عالم دین تو تھے ہی، مگر فقہ وفتاوی بازی کی جنجھٹ سے آپ کنارہ کش تھے، فقہ فتاوی کے حوالے سے آئے دن ہونے والی معرکہ آرائی سے آپ کوسوں دور رہا کرتے تھے۔

اب رہا مذکورہ بالا محدث صاحب والے خط میں مولانا سلطان احمد صاحب فوئمالویؒ کے متعلق علانیہ اور کہیں دبے ہوئے الفاظ میں جس نوعیت کے الزامات تراشے گئے، وہ میرے علم کی حد تک صحیح نہیں ہیں، البتہ یہی سچ ہے کہ آپ کسی خاص امام اور ان کے خاص فقہی مسلک کے پابند نہیں تھے، آپ کے تحریر کردہ فتوی کا ایک فقرہ ملاحظہ ہو کہ:

"تقلید الشخص المعین لیس بواجب"

تو ظاہر ہے کہ آپ تقلید تو کرتے تھے، مگر کسی خاص امام یا کسی خاص فقہی مسلک کی پابندی کئے بغیر، چونکہ ارکان میں ہر ایک مکتب فکر کے علماء حنفی مسلک کے پابند تھے اور اب بھی ہیں، تو ضروری ہے ان کے لئے کہ ہر ایک مشکلات کا حل مسلک امام ابوحنیفہ کے مطابق ہو، برعکس اس کے اگر کسی دوسرے امام کے قول پر عمل کیا جائے تو طرح طرح کے الزامات کے تازیانے برسائے جاتے ہیں، مگر مولانا اس پابند سلاسل سے آزاد تھے، میں اس طرف جانا نہیں چاہتا ہوں کہ مولانا آیا مجتہد بھی تھے یا نہیں، مگر یہی سچ ہے کہ مولانا ایک جلیل القدر عالم دین، اور بلند پایہ کے فقیہ النفس انسان تھے۔انہیں طبقۂ فقہاء، مفسرین، محدثین پر خاص نظر تھی، اور فقہ وفتاوی کے اصول وفروع پر عبور حاصل تھا، تو ایک ایسے عالم اور فقیہ النفس انسان کو جو بس تقلید الشخص المعین کو واجب قرار نہیں دیتے تھے، غیر مقلد کہہ کہہ کر نشانہ بنانا اور ان پر الزامات کے کوڑے برسانا کہاں تک شرافت ہوسکتی ہے؟

مولانا ایک ایسے اہل علم تھے، جنہیں عربی زبان کے قواعد، علم الاشتقاق ومفردات اللغات، بلاغت ومعانی کے ساتھ ساتھ علوم القرآن والحدیث، علم الروایۃ والدرایۃ، علم مصطلحات الحدیث و اسماء الرجال، آثار صحابہ واقوال تابعین وتبع تابعین وائمہ مجتہدین اور اختلافات فقہاء پر خاصی مہارت تھی، انہیں مذکورہ بالا علوم پر کامل رسوخ حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر دلائل کے مابین

ترجیح دینے، ائمۂ مجتہدین کے اقوال وآراء اور دلائل کو قرآن وسنت کی روشنی میں تولنے پرکھنے کی پوری صلاحیت تھیں، تو اب سوال آتا ہے کہ مولانا جیسے ایک عظیم المرتبت عالم دین کے لئے آندھی تقلید کہاں تک سزاوار ہوسکتی ہے؟ یہ قارئین کرام ہی فیصلہ کرسکتے ہیں۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے بھی کمال کردیا ہے کہ آپ نے اپنی کتاب ''مشاہیر ارکان برما'' کے صفحہ ۱۷۴ میں مولانا کو سراسر غیر مقلد قرار دیا تو مذکورہ کتاب کے صفحہ ۲۶۶ میں مرحوم کے تذکرے کے دوران لکھا ہے کہ:

''مولانا تقلید محض کے قائل نہ تھے، بلکہ بسا اوقات حنفیت کو چھوڑ کر دوسرے مذاہب پر بھی عمل پیرا ہوتے تھے، جس سے مشہور ہوگیا تھا کہ مولانا ممدوح غیر مقلد ہیں، حالانکہ مولانا مکمل طور سے غیر مقلد نہیں تھے، بلکہ دوسروں کو مات دینے کے لئے نقل مذہب کرتے تھے۔ مولانا تقلید محض کے قائل نہ تھے تو حنفیت کو چھوڑنے نہ چھوڑنے کی بات کہاں سے آگئی؟ اور یہ کہ مولانا جیسے ایک عظیم عالم دین، خداترس بزرگ، متقی وپرہیزگار اور مرجعی انسان پر یہ ایک بڑا الزام ہے کہ آپ ''دوسروں کو مات دینے کے لئے نقل مذہب کرتے تھے''۔

مولانا حافظ صدیق صاحب اور ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ:

''جب مولانا عبدالمتین صاحبؒ نے مولانا ممدوح کو اپنے مدرسہ میں استاد مقرر کیا تو بعض حضرات نے مولانا عبدالمتین صاحبؒ پر اعتراض کیا کہ اس سے غیر مقلدین کی حوصلہ افزائی ہوگی، مولانا عبدالمتین صاحبؒ نے جواب دیا کہ ''پتہ نہیں کہ مولانا سلطان احمد صاحب امام ابوحنیفہ کے اقوال پر عمل کرتے ہیں یا نہیں؟ لیکن وہ تو میری بات مانتے ہیں، اور عمل بھی کرتے ہیں۔ اس سے اشارہ ہوگیا کہ مولانا ممدوح مکمل طور پر غیر مقلد نہیں تھے۔ مولانا سید احمد رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مولانا آمین بالجہر اور رفع یدین پر عمل کرتے تھے، اگر کوئی اعتراض کرتے فرماتے تھے کہ تم سے سنت پر اعتراض ہورہا ہے، کبھی کبھار دیگر مختلف فیہ مسائل پر بھی عمل پیرا

ہوتے تھے۔''

مولانا عبدالمتین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کونسی اور کس قسم کی باتیں مانتے تھے اس کی کوئی وضاحت یہاں نہیں ملی، البتہ اس غیر واضح اور مبہم بیان سے یہ استشہاد کرنا'' کہ مولانا ممدوح مکمل طور پر غیر مقلد نہیں تھے'' کہاں تک ہماری خردمندی کی دلیل ہے؟ پھر مجھے اس بات پر تعجب ہورہا ہے کہ حضرت مولانا سلطان احمد صاحب کی عقل اتنی کب موٹی تھی کہ آپؒ مولانا عبدالمتین صاحب کی بات تو مانتے تھے مگر امام اعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی بات نہیں مانتے تھے، اگر بات حقیقت میں اس کے خلاف تھی تو راقم سطور کے ناقص خیال میں حضرت مولانا کی ذات وشخصیت پر ایک سخت اعتراض ہے، ساتھ ساتھ آپؒ کے علم ودانائی کی توہین بھی۔

اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا ممدوح کے چند ہم جھولی اور معاصرین کے نام درج کردوں، تو لیجئے:

(۱) مولانا محمد مظہر الحق باغگونوی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۲) مولانا عبدالسلام ارکانی رحمۃ اللہ علیہ، خلیفہ ومجاز حضرت حافظ حامد حسین اعظم گڑھیؒ۔
(۳) مولانا عبدالمتین خائندہ فاروی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۴) مولانا عبدالحق ٹھکیدار رحمۃ اللہ علیہ۔
(۵) مولانا ابوالخیر، والد شہید سی ایل (کرنل) رشید پوئمالوی رحمۃ اللہ علیہ۔
(۶) مولانا محمد اسماعیل کیوکتویؒ۔
(۷) مولانا سید احمد کیوکتوی، بانی مدرسہ ناظر فارا اکیاب۔
(۸) مولانا عبدالاول مدرس دارالعلوم چندپورا چاٹگام۔
(۹) مولانا محمد امین صاحب، مدرس دارالعلوم چندپورا چاٹگام.
(۱۰) مولانا عبدالمنان چاٹگامی۔

کہتے ہیں کہ مولانا نذیر احمد چنوتوی، خلیفہ ومجاز حضرت حافظ حامد حسین علوی اعظم گڑھیؒ، طلاق پر فتاوی حاصل کرنے کے لئے بہت دور سے پیدل چل کر فوئمالی حضرت کے گھر پہنچے، امید تھی کہ آپ

گھر میں ملیں گے،مگر پوچھنے پر معلوم ہوا کہ حضرت میدان میں ہل چلانے میں مصروف ہیں،اور آپ کا ستر نیم کھلا ہوا ہے،مولوی صاحب کو بہت تعجب ہوا کہ اتنے بڑے عالم دین ایک تو ہل چلا رہے ہیں، اوران کا ستر بھی نیم کھلا ہوا ہے،قریب جا کے ان کو سلام کیا اور بولا کہ حضرت آپ اتنے بڑے عالم دین اور یہ آپ کا ستر کا حال؟ مولانا نے ترت جواب دیا کہ:

> ’’ارے او مولوی صاحب!تم نہیں دیکھتے کہ بارش کتنی زور سے ہورہی ہے،جس کی وجہ سے زمین کتنی گیلی سڑی ہوگئی ہے،میرا ستر مجبوری میں نیم کھلا ہوا ہے،اگر میری جگہ تمہارے امام ہوتے،تو شاید دیکھ پاتے کہ ان کا ستر پورا کھلا ہوا ہے۔چلو تم آئے ہو،میں ستر چھپا لیتا ہوں،کہو آنے کا مقصد کیا ہے؟‘‘

اب مولوی صاحب نے اپنا حال سنایا تو حضرت نے فرمایا کہ قلم اور کاغذ ساتھ لائے ہو کہ نہیں؟ مولوی صاحب نے ہاں کہہ دیا تو آپ نے اسی جگہ پر فتوی لکھ دیا تھا۔

مولانا حافظ محمد صدیق صاحب نے لفظ غالبا کے ساتھ مولانا ممدوح کے سن وفات کے بارے میں لکھا ہے کہ:

’’بالآخر یہ عظیم ہستی غالبا ۱۹۹۰ء میں آسودۂ خاک ہوگئی ہے‘‘ صحیح نہیں ہوسکتا،اس لئے کہ جنوری ۱۹۸۶ء کی بات تھی کہ راقم السطور حضرت مولانا کے انتقال کے تین چار مہینے بعد استاد محترم مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے ساتھ فوئمالی گیا تھا،جہاں استاد محترم کی دعوت وہاں کے مشہور عالم مولانا عبد الاول صاحب کے گھر ہوئی تھی، مجلس میں مولانا حسین احمد صاحب نے حضرت مرحوم کی شخصیت پر طویل گفتگو کی تھی۔دوران گفتگو فرمایا تھا کہ:’’حضرت تو اس جہان فانی سے کوچ کر گئے،اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مولانا مرحوم کی سوانح حیات ضرور مرتب ہوجائے‘‘ تو ظاہر ہے کہ مولانا کا انتقال سن ۱۹۸۵ء کے کسی مہینے میں ہو چکا تھا۔

مولانا افلاطون صاحب ندوی ؒ منگڈوی:

جلیل القدر عالم دین اور نامور معلم و مصلح و متکلم حضرت مولانا افلاطون صاحب ندوی منگڈو ارکان میں پیدا ہوئے،ابتدائی تعلیم وطن میں پا کر اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی،اس کے بعد وطن واپس آئے اور مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے۔

مولانا افلاطون ندوی نے شمالی منگڈو کی مردم خیز بستی نائن چنگ میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی،جس میں آپ کے ساتھ مولانا محمد سکندر ندوی صاحب بھی پڑھایا کرتے تھے،لیکن چند سال کے بعد ان کا یہ مدرسہ ایک حادثہ کا شکار ہوگیا تھا،مولانا کے متعلق ان کے ایک شاگرد جناب غلام احمد چوہدری نے راقم سے یوں کہا کہ:

> ’’ہمارے استاد حضرت علامہ جناب مولانا افلاطون ندوی صاحب ایک جلیل القدر عالم دین اور مایۂ ناز معلم و مدرس تھے،نحو،صرف، بلاغت،ادب،فلسفہ و منطق میں کافی درک رکھنے کے علاوہ تفسیر قرآن کریم اور حدیث وعلوم حدیث میں بھی ید طولی رکھتے تھے،مولانا کی تدریس بڑی دیدنی تھی،جس نے بھی مولانا سے کسی فن کی ایک کتاب پڑھی ہو وہ اس فن کا ماہر ہوگیا تھا،آپ بڑے ادیب اور انشاء پرداز تھے،انداز بیان بڑا شوخ اور طرز گفتگو بڑا نرالا تھا،آپ نہایت نستعلیق کیفیت کے بزرگ تھے،ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر بھی آپ کی خاصی نظر تھی،اللہ تعالی آپ کے درجات بلند فرمائے‘‘۔

مولانا افلاطون ندوی ایک مفکر،مورخ اور اور قابل قدر مصلح و متکلم تھے،آپ حضرت مولانا عبد الجبار صاحب معروف بہ فقیر مولوی صاحب سعد اللہ سری کے ہم عصروں میں سے تھے، کہتے ہیں کہ:

> ’’بمقام نائن چنگ،منگڈو ایک دن یہ واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا عبد الجبار معروف بہ فقیر مولوی صاحب حالت جذب میں مولانا افلاطون ندوی صاحب سے کچھ بظاہر نازیبا بات کی تو مولانا ندوی نے فقیر صاحب پر ہاتھ اٹھایا،جس کے

جواب میں فقیر صاحب نے کچھ بد دعا دی، کہتے ہیں کہ اس کے چند دن بعد حالت ایسی پیدا ہوگئی کہ نہ صرف مولانا ندوی کو اس مدرسہ سے ہاتھ دھونا پڑا، بلکہ ان کے جانے کے بعد یہ مدرسہ بھی تباہ ہوگیا تھا، یاد رہے کہ اس مدرسہ میں مولانا ندوی کے ساتھ حضرت مولانا سکندر ندوی تمنگ چنگی بھی پڑھایا کرتے تھے، جن کا تذکرہ اگلی سطور میں آرہا ہے، اگر چاہے خدا کرے"۔

مولانا افلاطون ندوی نے اپنے وطن میں دین اور علم دین کی بڑی بڑی خدمات انجام دیتے ہوئے آخر کار داعی اجل کو لبیک کہا اور خاک ارکان میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد سکندر صاحب ندوی تمنگ چنگی، بوسیدنگیؒ:

حضرت مولانا محمد سکندر ندوی کی پیدائش شمالی مغربی بوسیدنگ کی بستی تمنگ چنگ میں ہوئی، آپ زمیندار خاندان کے چشم و چراغ تھے، ویسے آپ کا بچپن اور نشو ونما بڑی شان وشوکت سے ہوا تھا، کہتے ہیں کہ آپ کے والد علاقے کے سر برآوردہ لوگوں میں سے تھے، اور تھے بڑے زمیندار اور سخاوت پسند، ہر حالت میں غریبوں، مسکینوں اور بے کسوں کے کام آتے تھے۔

مولانا سکندر ندوی نے ابتدائی تعلیم علاقے کے مختلف مدارس میں پا کر اعلی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد وطن واپس آئے اور عرصۂ دراز تک مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ (جس کا بانی حضرت مولانا مفضل احمد صاحب کجافوی/علی چنگی تھے) میں بلا معاوضہ پڑھاتے رہے تھے، جس کی وجہ سے علماء اور دانشوروں کے علاوہ عوام میں بھی آپ کی قیمت وقدر میں کافی اضافہ ہوا تھا۔

مولانا سکندر ندوی صاحب کے صاحب زادوں میں مولانا محمد اقبال صاحب ماشاء اللہ قابل قدر عالم دین اور داعی الی اللہ ہیں، مولانا محمد اقبال صاحب میرے براہ راست استاد تو نہیں لیکن میرے اساتذۂ کرام کے دوست اور ہم جھولی ہیں، انہوں نے درس وتدریس کے علاوہ دعوت دین کے حوالے سے ملت وقوم کی بڑی خدمات کی ہیں، ارکان برما کے طول وعرض کے علاوہ دیگر چند ملکوں کا بھی دعوت دین کی خاطر سفر کیا ہے، جن میں سعودی عرب قابل تذکرہ ہے۔

مولانا محمد سکندر ندوی صاحب کے اور ایک صاحب زادہ جدہ سعودی عرب میں مقیم ہیں، عرصۂ دراز تک روزانہ ایک نہ ایک مرتبہ مسجد میں ان سے ملاقات ہوتی رہی تھی، جن سے مولانا کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا، محمد یوسف نام ہے، بڑے با اخلاق اور صوم وصلاۃ کے پابند دانشور ہیں۔

بہر حال مولانا محمد سکندر ندوی صاحب ایک جید عالم دین، مفسر، محدث اور ادیب ہونے کے ساتھ ایک نستعلیقی کیفیت کے بزرگ دانشور بھی تھے، آپ نے اپنی زندگی میں مختلف مدارس میں خدمات انجام دے کر بالآخر اپنی بستی میں انتقال کیا اور بستی کی قبرستان میں میں مدفون ہیں، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

مولانا مشتاق احمد صاحب ندویؒ سانگری بیلی، بوسیدنگ:

ارکان کے جلیل القدر عالم دین، مفسر ومحدث، فقیہ وادیب حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب ندوی بن نورالعالم بن عبدالرشید چوہدری کی ولادت ۱۹۱۶ء میں مشرقی بوسیدنگ کی معروف بستی سانگری بیل میں ہوئی، آپ کے والد بڑے دین دار اور عالم دوست انسان تھے، اور دادا جناب مرحوم عبدالرشید چوہدری سانگری بیلی ایک بڑے زمیندار ہونے کے علاوہ اپنے علاقے کے مکھیا تھے، ایک باوثوق روایت کے مطابق رواسوگری صاحب کے پاس بہت سارے ہتھیار تھے، جوانہوں نے ۱۹۴۸ء کے دوران سرزمین ارکان کے عظیم مردمجاہد فی سبیل اللہ شہید اعظم عبدالرشید دابوی کا حوالہ کیا، یوں اللہ تعالی کی امداد ونصرت اوران ہتھیاروں کے سہارے مجاہدین کو سرخروئی نصیب ہوئی تھی۔

سانگری بیل والے چوہدری خاندان اور تمنگ چونگ والے چوہدری خاندان اصل میں دونوں ایک ہی خاندان کی دوشاخیں ہیں، جیسے کہ تمنگ والے چوہدری جناب مرحوم ابوالباصر صاحب جناب عبد الرشید چوہدری سانگری بیلی کا بھتیجہ تھے، ایک روایت کے مطابق ان دونوں خاندان کا پرانا تعلق ارکان کے تاریخی دارالحکومت پتھری قلعہ سے تھا، کہا جاتا ہے کہ ۱۷۸۴ء میں ارکان پر برمی راجا بودوپھیا کے قبضہ کے دوران ان خاندانوں نے نقل مکانی کر کے شمالی مغربی ارکان میں رہائش اختیار کرلی تھی۔

حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی کی ابتدائی تعلیم اپنی بستی کے مکتب میں ہوئی، اس کے بعد علاقے کے دیگر دینی مدارس سے درجۂ ثانویہ تک کی تعلیم پا کر ہندوستان کا سفر کیا، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء یوپی انڈیا میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے چند سال تعلیم پا کر تقریباً ۱۹۴۰ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔

فراغت کے معابعد آپ وطن واپس آئے، اور علاقے کے مدارس میں تعلیم دیتے رہے، تدریس کے حوالے سے آپ نے یہاں جن مدارس میں تعلیم دی تھی، ان میں مدرسہ معین الاسلام تمنگ چونگ قابلِ ذکر ہے۔ پھر ۱۹۵۳ء میں آپ نے سرزمین ارکان کے نامور ترین بزرگ عالم دین حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب پکتلوی اور حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب لمبابیلی سے مل کر بوسیدنگ ٹاؤن میں جامعہ اسلامیہ عالیہ کی تاسیس کی، جہاں آپ نے ۱۹۶۴ء تک مسلسل تعلیم دی تھی۔ ۱۹۶۴ء میں آپ نے وطن سے ہجرت کی، اس ہجرت کے حوالے سے آپ کی اہلیہ کا بیان یوں سامنے آیا کہ:

"مولانا ندوی مچھلی کے اچھے خاصے شکاری تھے، ایک دن آپ مچھلی شکار کو گئے، آپ کو دیگر مچھلیوں کے ساتھ ایک بڑا جھینگا بھی ملا، واپسی پر ان کا سامنا ایک مگھ یا برمی فوجی سے ہوا، جس نے ان سے بزور بازو جھینگا چھین لیا، اس واقعہ کے بعد سے آپ خاصے بے چین سے رہے، بالآخر انہوں نے وطن سے ہجرت کی ٹھان لی، اور ۱۹۶۴ء میں مع اہل خانہ مشرقی پاکستان (بنگلادیش) چلے آئے"۔

دورانِ ہجرت آپ نے اپنے داماد مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری سے قسما بات طے کرلی تھی کہ وہ بھی مع اپنے اہل وعیال ہجرت کریں گے، ویسے مولانا ندوی تقریباً ایک سال تک مشرقی پاکستان میں انتظار کرتے رہے، بالآخر یہ متحقق ہونے پر کہ مولانا مظاہری وطن سے ہجرت کرنا نہیں چاہتے ہیں، یوں مولانا ندوی مع اہل وعیال ۱۹۶۵ء میں مغربی پاکستان کو کوچ کرگئے، اور کراچی میں مقیم ہوگئے۔ کراچی میں آپ کی تقریباً گیارہ سال اقامت رہی، اس دوران آپ نے جامعہ اشرفیہ کراچی میں تعلیم دینے کے ساتھ ہی ساتھ جامع مسجد کی امامت اور خطابت کا فریضہ انجام دیا، اس کے بعد آپ مع اہل خانہ ۱۹۷۶ء میں حجازِ مقدس پہنچے، اور سرزمینِ مقدس مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر ہوگئے، یہاں آپ کی وفات ہوئی۔

باوثوق ذرائع سے پتہ چلا کہ مکہ مکرمہ کے حارۃ البلدیہ والے محلہ چاؤ پرنگ کی جامع مسجد کی تاسیس آپ کے مبارک ہاتھوں سے پڑی، آپ نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے کام لیتے ہوئے اس مسجد کی بنیاد ڈالی اور اس کی تعمیر وترقی کے لئے بڑی بڑی مشقتیں اٹھائیں، راقم سطور کو بارہا اس مسجد میں نماز ادا کی توفیق ہوئی، ماشاءاللہ بڑی بارونق مسجد ہے، اللہ تعالی حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی اس محنت کو شرف قبولیت بخشے اور اس کے صلے میں درجات بلند فرمائے۔

بعد میں آپ مکہ مکرمہ کی معروف بستی "ترکی اڈہ" منتقل ہوگئے، لیکن بعض باوثوق ذرائع سے پتہ چلا کہ آپ تقریباً روزانہ حارۃ البلدیہ والی اپنی تاسیس کردہ اس مسجد میں بطور خاص عصر کی نماز ادا کرنے پیدل جایا کرتے، اور نماز کی ادائیگی کے بعد پیدل واپس جاتے تھے، راستے میں کوئی جان پہنچان گاڑی والے آپ کو گاڑی پر بٹھانا چاہتے تو شکریہ کے ساتھ معذرت کرتے تھے۔ مولوی محمد

اکرام سلیمان صاحب کا بیان ہے کہ:

''نانا صاحب حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی کا تقریباً سائنتیس (۳۷) سال مکہ مکرمہ میں قیام رہا، اس دوران پانچویں اوقات کی نمازیں اپنے محلے کی مسجد یا حرم پاک یا دیگر کسی مسجد میں ادا کرتے رہے، لیکن نماز جمعہ ہر حال میں مسجد حرام میں ادا کرتے تھے، آپ کے چند ایسے ساتھی تھے، جو دس بجے حرم مقدس پہنچتے اور آپ کے لئے جائے نماز (مصلی) بچادیا کرتے تھے''۔

مولانا سے واقف بعض علماء کا بیان ہے کہ مولانا بڑے بلند پایہ کے عالم دین، مفسر قرآن، محدث، فقیہ اور ادیب انسان تھے، حسنِ اخلاق کے ساتھ خطاط اور خوش نویس بھی، اردو، عربی، فارسی اور انگریزی بہت خوب لکھتے تھے، چنانچہ اس حوالے سے ایک واقعہ سامنے آیا کہ:

''مولانا محمد صالح صاحب یونگ چونگی ؒ کو ایک لفظ ''مخوف'' کے مطلب سمجھنے میں کچھ مشکل پیش آئی تو آپ کی نظر سیدھی مولانا ندوی پر جا ٹکی، اس لفظ کی تحقیق کے لئے مولانا صالح صاحب یونگ چنگ سے بذریعۂ کشتی پو پھٹے نکلے اور بوسیدنگ تشریف لائے، ویسے صبح سویرے مولانا کو دیکھ کر ندوی صاحب حیرت میں تھے، اور پوچا کہ مولانا اتنے صبح سویرے یوں آپ کا تشریف لانا کیسا؟ جواب میں فرمایا کہ ندوی صاحب! مجھے لفظ مخوف کے مطلب سمجھنے میں دقت سی محسوس ہوئی تو آپ کے پاس آیا ہوں، تو مولانا ندوی نے ایک بند پڑھا کہ:

فلا ترحلن بلا عدة فان الطریق مخوف مخوف

اب مولانا صالح صاحب کو اس لفظ کا مطلب سمجھ میں آ گیا، اور واپس جانے لگے تو مولانا ندوی نے فرمایا کہ مولانا آپ اتنی دور سے آئے ہوئے ہیں، کچھ مجھے تواضع تو کرنے دیں! لیکن مولانا صالح صاحب نے جاتے ہوئے فرمایا کہ مولانا! میں صرف اور صرف طلب علم کی خاطر آیا ہوں، اس میں ملاوٹ کی کوئی گنجائش نہیں ہے''۔

کون نہیں جانتا کہ علمائے ارکان تقلید وفقہ کے حوالے سے احناف کے سخت پیروکار ہیں، ویسے

حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی صاحب بھی تقلید وفقہ میں احناف کے پیروکار تھے، اس باب میں ٹھس سے مس نہیں ہوتے تھے، اس حوالے سے آپ کا نواسہ عزیزم مولوی محمد اکرام صاحب کا بیان ہے کہ:

''نانا صاحب حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی رحمۃ اللہ علیہ فقہ کے حوالے سے احناف کے پیروکار تھے، کبھی کبھار میں اہل حدیث کا روپ دھار کر بعض مسائل میں آپ سے اختلاف کرتا تھا، تو نانا صاحب احناف کے حق میں ایسے ایسے دلائل پیش کرتے کہ جن سے میں دھنگ رہ جاتا تھا، اور تعجب ہوتا تھا کہ بڑھاپے کے اس عالم میں بھی آپ کا حافظہ کتنا ہی مضبوط تھا، بالآخر مجھے ان کے سامنے ہار ماننا پڑتا تھا۔ علاوہ ازیں آپ بلند پایہ کے عالم دین، صبر وثبات کے پیکر، اور توکل وعزیمت کے کوہِ گراں تھے''۔

حضرت مولانا ندوی نے فراغت تعلیم کے معا بعد اپنے ہی خاندان کی ایک شریف خاتون محترمہ کلثوم تمنگ چونگی سے شادی کی، اللہ تعالی نے آپ کی اولاد میں قدرے برکت دی، اور ان کے بطن سے پانچ اولادیں پیدا ہوئیں، جن کا اجمالی تعارف یہ ہے:

(۱) محمد زبیر مرحوم: یہ مولانا کا بڑا صاحب زادہ تھا، ایک روایت کے مطابق نفسیاتی مریض تھا، جب کہ دوسری ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کی بعض حرکات وسکنات سے یوں لگتا تھا کہ کہیں وہ مجذوب قسم کا انسان تو نہیں تھا؟

(۲) حافظ محمد فرقان: یہ حضرت مولانا کا دوسرا صاحب زادہ ہے، جو جید حافظ القرآن ہونے کے علاوہ بڑے دین دار اور انسان دوست ہے، تادم تحریر مکہ مکرمہ میں مقیم ہے۔

(۳) حافظ محمد نعمان: یہ حضرت مولانا کا تیسرا صاحب زادہ ہے، وہ بھی جید حافظ القرآن ہونے کے علاوہ پرہیزگار انسان ہے، حالیا مکہ مکرمہ میں مقیم ہے۔

(۴) فاطمہ خاتون: مولانا ندوی کی یہ صاحب زادی اچھی خاصی پڑھی لکھی ہونے کے علاوہ بڑی نیک سیرت اور عالم دوست خاتون ہیں، ان کی شادی وخانہ آبادی ہمارے شفیق مربی اور استاد حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری تمنگ چونگی سے ہوئی، جو برادر محترم محمود الحسن صاحب اور

عزیزم مولوی محمد اکرام وغیرہ کی والدۂ محترمہ ہیں، برما کے دارالحکومت رنگون میں مقیم ہیں، اللہ تعالی ان کی حیات میں برکت دیں، آمین۔

(۵) عارفہ خاتون: یہ مولانا کی چھوٹی صاحب زادی ہیں، آج کل کراچی پاکستان میں مقیم ہے۔

اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک جلیل القدر عالم باعمل، صاحب صورت وسیرت، بڑے غیور، متوکل علی اللہ، اور صبر ثبات کے پیکر انسان تھے، انہوں نے اپنی حیات مستعار میں ملت وقوم کی کافی خدمات کیں اور پچاسی سال کی عمر طبعی پاکر سرزمینِ مقدس مکہ مکرمہ میں ۲۰۰۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، اور جنت المعلی میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ خدا رحمت کندایں عاشقانِ پاک طینت را۔

مولانا محمد انور صاحب ندویؒ دھودائنگی، منگڈوی:

قابل قدر مفکر اور ذہن رسا کے مالک مورخ عالم دین حضرت مولانا محمد انور صاحب ندوی کی پیدائش شمالی منگڈو کی بستی دھودائنگ میں ہوئی، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم علاقے میں پاکر دارالعلوندوۃ العلماء جاداخل ہوئے، اور یہاں چندسال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

مولانا محمد انور صاحب ندوی سے راقم کی ملاقاتیں رہیں، بڑی خوب صورت اور نیک سیرت انسان تھے، جبھی ان سے ملاقات ہوتی مجھے کسی نہ کسی اعتبار سے فائدہ ہوتا تھا، بچپن میں یوں تو میں نے ندوے کے متعلق خاندان اور علاقے کے بعض بزرگوں سے بہت کچھ سن رکھا تھا، جن میں حکیم محمد صدیق مرحوم نائن چنگی ناقابل فراموش ہیں، لیکن ندوے کے حوالے سے جو باتیں مولانا محمد انور ندوی سے سنی تھیں وہ بہت قیمتی اور کام کی تھیں، سچ تو یہ ہے کہ مولانا سے سنی ہوئی باتیں میرے دل میں جاگزیں ہو چکی تھیں، جو آگے چل کر میرے ندوے جانے کا باعث بنی تھیں، اللہ تعالی مولانا کو جزائے خیر دے۔

مولانا محمد انور ندوی کے بیان کے مطابق آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ہم سبق تھے، حضرت مولانا ندوی کے رنگون کے سفر کے دوران مولانا محمد انور ندوی رنگون میں تھے، وہاں حضرت مولانا ندوی سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی، اور حضرت مولانا نے آپ کو اپنی گرانمایہ تصنیف ''حیات عبدالحیؒ'' ہدیہ میں دی تھی، جو مجھے آپ نے دی اور پڑھی تھی۔

شک نہیں ہے کہ مولانا محمد انور ندوی ایک جلیل القدر عالم دین اور مایۂ ناز ادیب تھے، ندوے سے وطن واپسی کے بعد مولانا ندوی صاحب نے برما کا طول طویل سفر کیا اور دار الحکومت رنگون میں چندسال گزارے تھے، جہاں آپ نے اپنی دیگر خدمات کے ساتھ ''دار المولفین رنگون'' کے نام سے شہر رنگون میں ایک ادارہ قائم کیا تھا، لیکن نیون حکومت نے اسے چلنے نہیں دیا، اس کے بعد آپ ارکان چلے آئے اور نائن چنگ والے چوہدی خاندان کی ایک خاتون سے شادی کی، اس کے بعد عرصۂ دراز تک دینی اور فکری کاموں میں مشغول رہ کر انتقال کیا اور خاک نائن چنگ میں مدفون ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا رشید احمد صاحب ندویؒ اکیابی:

حضرت مولانا قاضی رشید احمد صاحب ندوی کی ولادت ۱۵/جنوری/ ۱۹۲۶ء میں ارکان کے دار الحکومت اکیاب کی بستی قصائی فارہ میں ہوئی، آپ کے والد کا نام قاضی ابوبکر تھا، جو ایک بڑے عالم دین اور زندہ دل بزرگ تھے، قاضی صاحب برطانوی دور حکومت میں منصب قضا پر فائز تھے۔

مولانا رشید احمد صاحب ندوی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ اکیاب میں ہوئی، ابھی آپ کی عمر دس کی تھی کہ آپ نے اعلی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، ندوے میں مسلسل دس سال پڑھ کر ۱۹۴۶ء میں سند فراغت حاصل کی۔

مولانا رشید احمد ندوی صاحب فراغت تعلیم کے بعد وطن واپس آئے اور اکیاب کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، ظالم برمی حکومت اور اس کے لالے پالے غنڈوں نے آپ کا یہاں جینا حرام کر دیا تو آپ نے ہجرت کی اور ۱۹۶۴ء میں مغربی پاکستان کے شہر کراچی جا مقیم ہوئے تھے۔

مولانا رشید احمد ندوی نے دار العلوم کراچی میں چند سال مدرسی کی، اس کے بعد مسجد نور ۳۶/ بی، لانڈی کراچی کے استاد رہے، بعد ازاں آپ نے ۳۶/ زمان آباد لانڈی میں ندوۃ العلماء کے طرز پر ''المدرسۃ العربیۃ الدینیۃ'' کے نام پر ایک دینی مدرسہ قائم کیا، جس کے آپ تا حیات مہتمم رہے تھے، بہر حال سرزمین ارکان کے اس عالی مقام غیور عالم دین نے اپنی مستعار زندگی میں ملت وقوم کی بہت ساری خدمات انجام دے کر ۱۱/اپریل/ ۲۰۰۱ء میں انتقال کیا اور اسماعیل گوٹھ کی قبرستان میں آسودۂ خاک ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آپ کے لواحقین میں سات صاحب زادے اور آٹھ صاحب زادیاں ہیں، جن میں سے راشد بن حضرت مولانا رشید احمد ندوی سے میرا مراسم تھا، اللہ تعاان سب کی حیات دراز کرے۔

مولانا رشید احمد ندوی کو عربی، فارسی، اردو، انگریزی زبانوں پر عبور حاصل تھا، شک نہیں ہے کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین اور مفکر انسان تھے، رہتی زندگی میں آپ نے علم دین اور طلبائے دینیہ کی قابل قدر خدمات کیں، جن سے قوم وملت کا گرانقدر فائدے ہوئے تھے، اللہ تعال آپ کا مرتبہ بلند فرمائے۔

مولانا ابوالحسین صاحب عرب شاہ فارویؒ منگڈوی:

مولانا ابوالحسین بن ابوالخیر بن فٹان علی بن عبد الشکور بن عبد الکریم بن حیدر علی کی ولادت باسعادت ۱۹۴۶ء میں شمالی منگڈو کی معروف ومشہور بستی عرب شاہ فارہ میں ہوئی، کہا جاتا ہے کہ زمانۂ قدیم میں اس بستی کو کسی ایک عربی النسل آدمی نے آباد کیا تھا، تاریخ میں اس بستی کا تذکرہ پایا جاتا ہے، شاید کہ وہ کوئی عرب شہزادہ تھا، اسی لئے اسے عرب شاہ فارہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اسی طرح یہاں کے بعض لوگ اس آدمی کو عرب شاہ شقدار کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی مقامی آدمی تھا۔

مولانا اپنے والدین کے لاڈلہ اور پیارا بیٹا تھے، ویسے بڑی ناز پروردگی سے آپ کی پرورش ہوئی تھی، اس حوالے سے مولانا لکھتے ہیں کہ:

''میں اپنے والدین کا بڑا پیارا تھا، بچپن میں والد صاحب مجھے ہمیشہ اپنے پاس سلاتے تھے، میرے والدین بڑے علم اور عالم دوست بزرگ تھے، والد صاحب گوکہ عالم نہ تھے، مگر عالموں سے بہت ہی شناسائی رکھتے تھے، اسی لئے اپنے بچوں کو علم دین کے حصول کے لئے وقف کر رکھا تھا، مگر قدرت کی عجیب کرشمہ سازی تھی کہ احقر کے علاوہ ان کی اولاد میں کسی کو بھی علم دین سے وافر مقدار میں حصہ نصیب نہیں ہوسکا، بھائیوں میں تین مجھ سے بڑے ابوصدیق، ابوالبشر اور ابوطاہر تھے، اور ایک چھوٹے، جس کا نام سید عالم ہے، اور دو بہنیں تھیں، معاویہ بیگم اور فاطمہ خاتون، بھائیوں میں سے کوئی جماعت ہشتم اور کوئی اس سے زیادہ کچھ پڑھا تھا''۔

یاد رہے کہ راقم سطور کو مولانا مرحوم کی ایک خودنوشتہ تحریر ملی ہے، جس میں ''سوانح عمری احقر الوری ابوالحسین بقلم خود'' سرورق پر لکھا ہوا ہے، اس تحریر میں مولانا کی ولادت سے ۱۹۹۳ء تک حالات ملے ہیں، راقم نے اس تحریر سے ان کی حیات کے متعلق استفادہ کیا، یہ تحریر ڈاکٹر دین محمد بن مولانا سید الامین صاحب کی کوشش سے ملی ہے۔

مولانا ابوالحسین صاحب نے اپنے تعلیمی حالات کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے، اب میں چاہتا ہوں کہ ناظرین کرام خود ان کی خود نوشتہ تحریر سے مستفید ہوں، ان کی اعلیٰ تعلیم کے حوالے سے جو کچھ زیر تحریر لانا ہے، وہ بعد میں لاؤں گا، پہلے ان کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم کے متعلق ملاحظہ ہو:

''لڑکپن میں احقر مکتب میں تعلیم حاصل کرتا اور ساتھ ساتھ گھر کے بیل بکریاں بھی چراتا تھا، خصوصا بھینس کی دیکھبال کی ذمے داری میرے سر پر تھی، تعلیم کی ابتدا احقر کے دادا عبدالشکور کے سگے بھائی حضرت مولانا تاج الملوک صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی، مولانا وقت کے بڑے عالم دین، واعظ انسان تھے، ان کے مرض الموت کے دوران چند دن اور ایک آدمی سے کچھ پڑھا، جس کا نام جناب محمد شفیع تھا، بخشو فارہ کا رہنے والا تھا، پہلے زمانے میں اس کا عقیدہ صحیح تھا، بعد میں دائرہ والوں سے متاثر ہوکر بھٹک گیا، بعد میں معلوم ہوا کہ مرنے سے پہلے تائب ہوگیا تھا ،ایک اطلاع کے مطابق اسے کسی نامعلوم آدمی نے ٹیکناف کے مقام میں قتل کردیا ۔تیسیر المبتدی اور اسماعیل میرٹھی والی اردو کی دوسری کتاب حضرت مولانا الحاج مستفیض الرحمن صاحب مہاجر کراچی سے پڑھی، آپ نہایت مستقل مزاج انسان تھے، بڑے حق گو اور پاک باز بھی، مولانا کو تیسیر المبتدی پڑھانے میں مہارت حاصل تھی، مولانا کی ہجرت کے بعد احقر مولانا مقبول حسین عرب شاہ فاروی مدظلہ العالی سے علم دین حاصل کرتا رہا تھا۔

اس کے بعد غالبا ۱۹۵۷ء میں ہتالیہ فاہ گیا، جہاں مولانا عبدالمتین صاحب مہاجر کراچی کا مدرسہ قائم تھا، وہاں مولانا محمد یوسف صاحب سے فارسی کی کتابیں پڑھیں ، اور مولانا عبدالحکیم صاحب انوکی (پچھم سے آئے ہوئے) سے بھی استفادہ کیا، موخر الذکر یہ دونوں عالم دین خاصے اخلاق کے پیکر تھے ۔

اگلے سال ۱۹۵۸ء کو چچا مولوی حبیب اللہ صاحب کی معیت میں جامعہ اسلامیہ عالیہ شقدار پارہ میں جماعت نہم میں داخلہ ملا، تعلیم الاسلام وغیرہ کتابیں مولانا عبد العزیز مدظلہ العالی شاکر فاوری سے پڑھیں، میزان منشعب حضرت العلامۃ مولانا

جلال الدین انڈانگی مدظلہ العالی سے پڑھی گئی، حضرت موصوف بڑے دین دار اور نیک سیرت عالم دین تھے ۔حضرت حکیم الامت مجدد ملت اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے حدیقۂ علم وعرفان سے پھل کھائے ہوئے تھے، میں نے ان جیسا متقی اور پرہیزگار عالم دین بہت کم دیکھا، اسی زمانے میں جامع العلوم شقدار فارہ کے زمام قیادت ان کے ہاتھ میں تھا، حضرت موصوف بڑے مستقل مزاج انسان تھے، حضرت کے زمانے میں اس درس گاہ نے بڑا نام پیدا کیا تھا، آپ نے مکہ مکرمۃ کی طرف ہجرت کی تو اس میں کمی آنے لگی تھی، حضرت موصوف کو میزان منشعب پڑھانے کا ایک خاص ملکہ حاصل تھا، اس وقت کے علماء آپ کے تدریسی طرز پر رشک کیا کرتے تھے، احقر کو آپ کی ذات عالی صفات سے حد درجہ فائدہ ہوا، ان کے علاوہ مولانا مستفیض الرحمن صاحبؒ سے بھی بہت فائدہ ملا تھا، ان دونوں بزرگوں کو مجھ پر خاص نظر تھی، یوں ان بزرگوں کی دعا اور نیک توجہ کی وجہ سے اسی سال پورے مدرسہ میں میں نے تفوق کلی حاصل کی تھی۔

اگلے سال اسی درسگاہ میں جماعت ہشتم میں داخلہ لیا، نحو میر نامی کتاب حضرت مولانا الحاج محمد صاحب لمبا گونوی سے پڑھی، اس وقت اسی درسگاہ میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نحو کے امام سمجھے جاتے تھے، کم گو تھے مگر کبھی کبھار خوش مزاجی سے بھی کام لیا کرتے تھے، کھل کر ہنستے نہ تھے مگر تبسم فرمایا کرتے تھے، موصوف جلد ساز بھی تھے، اور گھڑی ساز بھی، ان کا تقوی، پرہیزگاری اور حق گوئی ضرب المثل تھی، بعد میں ہجرت کی اور مکہ مکرمۃ میں پناہ گزین ہوئے ، کہاجاتا ہے مکہ مکرمۃ میں اس وقت کے کسی قاضی سے آپ کا ٹکراؤ ہوا تو آپ کو عرب امارات کی طرف جلاوطن کردیا گیا تھا۔اسی سال عربی کی پہلی کتاب حضرت العلامۃ الحاج مولانا بشیر اللہ صاحب انڈانگی سے پڑھی ، مولانا موصوف حضرت مولانا جلال الدین صاحب انڈانگی کے سگے بھائی تھے۔دراں حالیکہ آپ اس درس گاہ کے شیخ الحدیث تھے، اسی علاقہ میں باضابطہ دورۂ حدیث کی تعلیم آپ سے شروع ہوئی تھی، مولانا انوار شاہ

کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ اور اسی سال میں نے اردو کی چوتھی کتاب حضرت مولانا الحاج سعید عظیم سنبنوی صاحب دامت برکاتہم سے پڑھی، آپ ایک طرف اس درس گاہ کے ناظم تعلیمات تھے تو دوسری طرف مدیر درس گاہ بھی، جبکہ یہ دینی درس گاہ ان کے مبارک ہاتھوں سے تاسیس ہوئی تھی، اسی زمانے میں آپ اس علاقہ کے استاد الکل تھے، احقر کو علم کی دولت جتنی نصیب ہوئی شاید ان کی دعا کی برکت سے نصیب ہوئی ہے، احقر پر ان کی خاص نظر شفقت تھی، مولانا موصوف حکیم الامت اشرف علی تھانوی کے مرید میں سے تھے، بڑے پاک باز اور نیک سیرت عالم دین تھے، اللہ تعالی ان کا مرتبہ بلند فرمائے، میں نے آپ سے بہت ہی استفادہ کیا تھا۔

اس کے اگلے سال اس درس گاہ میں احقر نے جماعت ہفتم میں داخلہ لیا، نور الایضاح نامی فقہ کی کتاب مولانا سعید عظم صاحب سنبنوی سے پڑھی، علم الصیغہ نامی کتاب حضرت مولانا الحاج ابو الحسین صاحب خونخوار فاروی سے پڑھی ، موخر الذکر یہ دونوں بزرگ عالم دین آپس میں سمدھی تھے، مولانا خونخوار فاروی اسی جامعہ کے سکرٹیری کے منصب پر فائز تھے، احقر نے کنز الدقائق اور گلستان کا کچھ حصہ ان سے پڑھا، دراصل گلستان نامی کتاب حضرت مولانا احمد الرحمن صاحب گدوسراوی کے حصے میں تھی، درمیانی سال میں مولانا گدوسراوی کا انتقال ہوگیا تو بقیہ حصّہ مولانا ابوالحسین سے پڑھنے کا موقع ہوگیا تھا۔ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے احقر ہر ایک امتحان میں اعلی نمبروں سے پاس ہوتا رہا، لیکن بدقسمتی سے اس سال سالانہ امتحان میں حصہ لینا نصیب نہیں ہوا، دراصل شیطان لعین نے مجھے بھکایا، موقولہ مشہور ہے کہ ''**لکل شئ آفۃ وللعلم آفات** '' اللہ تعالی ہر ایک طالب علم کو شیطان کی شیطنت سے محفوظ رکھے۔

۱۹۶۰ء کے وسط میں پھر اسی جامعہ میں جماعت ششم میں داخلہ ملا، اللہ تعالی کے خاص فضل کرم سے سالانہ امتحان میں تفوق کلی حاصل کرنے کی سعادت نصیب

ہوئی تھی، کافیہ، مرقات، فصول اکبری نامی کتابیں حضرت مولانا مقبول احمد صاحب مہاجر مکی دامت برکاتہم سے پڑھیں، مولانا جنوبی منگڈو کی معروف بستی بارنگیار ڈیل کے رہنے والے تھے، موصوف بڑے آزاد منش تھے، محکومی اور غلامی سے حضرت کو گویا چھیڑ تھا ۔

۱۹۶۱ء کے وسط میں پھر اسی درس گاہ میں جماعت پنجم میں داخلہ لیا، شرح ملاّ جامی بحث فعل حضرت مولانا عبد العزیز شاکر فاروی سے پڑھی، اصول الشاشی اور شرح تہذیب حضرت مولانا محمد اسلام صاحب شاکر فاروی سے پڑھی، علاوہ ازیں دیوان علی نامی کتاب بھی موخر الذکر عالم دین سے پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ مولانا محمد اسلام صاحب بڑے خوش مزاج انسان تھے، اللہ تعالی کے فضل وکرم سے مجھے خوش مزاجی کی دولت انہی سے وراثت میں ملی ہے۔

۱۹۶۲ء میں میرا حقیقی دادا عبد الشکور کا انتقال ہوگیا، مرحوم بڑا شریف انسان تھا، کسی حادثہ کی وجہ سے اندھا ہوگیا تھا، آخری عمر میں احقر گویا ان کا خادم جیسا تھا، بطور خاص جمعہ کے لئے مسجد لے جانا میرا ذمہ تھا، اسی سال میرا ایک چچازاد بھائی مولوی محمد صدیق صاحب فارغ التحصیل ہوکے وطن واپس آئے اور مولانا تاج الملوک صاحب کے بنا کردہ ابتدائی مدرسہ میں بحیثیت مدرس مقرر ہوئے۔ ان کے ساتھ مولانا سید حسین صاحب بھی تھے، شرح ملا جامی بحث اسم وغیرہ یعنی جماعت چہارم کی کتابیں ان دونوں سے پڑھیں، پہلے پہلے میں اکیلا تھا، بعد میں مولوی احمد حسین ، مولوی امیر حسین اور مولوی بدیع الرحمن کونا فاروی بھی ساتھ ہوگئے تھے، یوں یہ حضرات میرے ہم سبق تھے۔

۱۹۶۳ء کے واسط میں دوبارہ جامع العلوم شقدار فارہ میں جماعت سوم میں داخلہ لیا، سلم العلوم اور ہدایۃ الحکمت نامی کتابیں حضرت مولانا الحاج عبد الکریم صاحب مہاجر مکیؒ سے پڑھیں، مولانا موصوف واپرانگ نامی بستی کے رہنے والے تھے، علم التجوید والقرأۃ کے علاوہ معقولات میں خاصی مہارت رکھتے تھے، دین داری

و پرہیزگاری میں بھی یکتائے روزگار تھے، اسی سال جامع العلوم شقدارفارہ میں ایک بڑا حادثہ ہوا تھا، کہ طلباء اور بعض مدرسین کرام اس وقت کے مہتمم صاحب پر نالاں ہوگئے تھے۔ مہتمم صاحب بڑے اچھے آدمی تھے مگر عالم نہ تھے، ان کے خلاف بات یہ چھیڑی گئی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے دستور کے مطابق مدرسہ کا مہتمم عالم دین ہونا ضروری ہے، بالآخر ان کے خلاف اسٹرائک ہوگیا تھا۔ تیس چالیس طلبہ مدرسہ چھوڑ کر چلے گئے، بدقسمتی سے میں بھی ان کے ساتھ تھا، محمود اللہ کھلاربیلی اور حافظ احمد رامیوربیلی اس ہنگامہ کے لیڈروں میں سے تھے، اس اسٹرائک کے دوران مولانا سید الامین صاحب منگنماوی نے مشتعل طلبہ کے کانوں میں شرارت کی ہوائیں پھونکیں، دراصل اس اسٹرائک کے اصل بانی بھی مولانا موصوف تھے، پہلے پہلے احقر کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہو پایا تھا، اور علاقائی عصبیت کی بنیاد پر اس جماعت باغی میں شریک ہوگیا تھا، طلبہ تو مدرسہ چھوڑ چلے گئے، مگر مولانا سید الامین صاحب رہ گئے تھے، جبکہ پہلے سے بات یہ طے تھی کہ طلبہ کے ساتھ مولانا بھی مدرسہ چھوڑ دیں گے، البتہ مولانا نے اس سال کے اختتام پر مدرسہ چھوڑا اور اگلے سال کے لئے آپ مدرسہ محمدیہ پرامپورو میں مقرر ہوگئے تھے، الغرض میں جامع العلوم شقدارفارہ چھوڑ کر مدرسہ محمدیہ پرامپورو میں آیا، مگر وہاں بات نہ بن پائی تو جامعۂ اسلامیۃ کھلاربیل چلا گیا، مگر وہاں بھی بات نہ بن پائی، بالآخر جامعہ نظامیہ خائندہ کا ٹا جا ٹھہرا، دراں حالیکہ حضرت مولانا عبدالمتین صاحب ہتالوی اس درس گاہ کے منتظم اعلی تھے، انہوں نے ہماری رہائش اور خورد ونوش کا بندوبست کیا، مزید براں ہماری چاہت کے مطابق حضرت العلامۃ الحافظ مولانا سلطان احمد صاحب مدّظلہ العالی فوئمالوی کو اس درس گاہ میں بلالایا، مولانا موصوف عربی ادب میں مہارت رکھنے کے علاوہ انگریزی اور برمیز زبانوں میں یہ طولی رکھتے تھے، گو کہ موصوف نے معقولات کی کتابیں زیادہ نہیں پڑھیں مگر اس فن میں دخل عجیب انداز سے رکھتے تھے۔ کاتب بھی تھے اور عربی ادب کے شہسوار بھی،

میں نے حضرت سے سلم العلوم اور مقامات حریری نامی کتابیں پڑھیں، نورالانوار، ہدایۃ اور مختصر المعانی حضرت الحاج مولانا عبد المتین صاحب سے پڑھیں، یہ تھی میری وطن عزیز میں پڑھائی کی داستان"۔

مولانا ابوالحسین صاحب ۱۹۶۴ء کے اواخر تک وطن میں پڑھتے رہے تھے، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے پاکستان کا قصد کیا، گھر والوں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا تو تمام گھر کے لوگوں نے خوشی خوشی سے یہ مشورہ دیا کہ مشرقی پاکستان نہیں بلکہ مغربی پاکستان جاکے مزید علم حاصل کرنا چاہئے، یوں آپ چاٹگام پہنچے اور سفینۂ عرب کے ذریعے کراچی پہنچ گئے تھے، اب مولانا کی اگلی تعلیمی حالات وکوائف خود مولانا ہی کے قلم سے پڑھئے:

"۸ ر شوال ۱۳۸۵ھ کو مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی میں داخلہ لیا تھا، چوں کہ یہاں معقولات کی کتابیں بہت ہی کم پڑھائی جاتی ہیں، منطق، سلم العلوم، پر ختم، اس لئے یہاں سے ٹھہری (ایک مقام کا نام) جانے کا ارادہ کیا، ہدایۃ اوّلین، حسامی، سلم العلوم، ملاحسن، مختصر المعانی، حاشیہ عبدالغفور، حجۃ اللہ البالغہ، مسلم الثبوت، تلویح، التوضیح، میبذی، میرزاہد، ملاّ جلال، میرزاہد، امور عامہ، شرح مواقف سمعیات، شرح اشارات الطوسی، شرح اشارات الرازی، صدرا، شمس بازغۃ، اقلیدس، تصریح، شرح چغمنی، قاضی، حمداللہ، ہدایہ آخرین، جلالین شریف، مشکٰوۃ شریف، بخاری شریف کامل، ترمذی شریف، ابن ماجہ، نسائی شریف، طحاوی شریف، غلام یحییٰ، مطول، بیضاوی شریف، ہدایہ اوّلین غرض یہ ساری کتابیں یہاں پڑھیں"۔

جامعہ مدنیہ دارالہدیٰ ٹھہری میں آپ نے تین سال تعلیم حاصل کی، مولانا نے اپنے اساتذہ کے خوب دل کھول کر تذکرے کئے ہیں، ان تمام تفصیلات سے صرف نظر صرف ان بزرگ اساتذہ کے اسمائے گرامی یہاں درج کیے جارہے ہیں، جن سے آپ کا شرف تلمذ حاصل تھا:

(۱) حضرت مولانا محمد امین صاحب۔

(۲) شیخ الحدیث حضرت مولانا قطب الدین صاحب سندھی۔

(۳) حضرت مولانا غلام قادر صاحب۔

(۴) حضرت مولانا عزیز احمد صاحب۔

(۵) حضرت مولانا قاضی الحاج فضل اللہ صاحب۔

(۶) حضرت مولانا محمد بلال صاحب۔

مولانا کے بیان سے جہاں تک معلوم ہوا کہ ۱۳۸۵ھ سے ۱۳۸۸ھ کے درمیانی رمضان المبارک کو آپ نے دیگر بزرگوں سے استفادہ کیا تھا، ان میں سے پہلا رمضان المبارک پیر گوٹھ نامی بستی میں دورۂ قرآۃ کے حوالے سے گزارے، ان حالات پر مشتمل مولانا کا بیان ملاحظہ کیجئے:

''۱۳۸۵ھ تا ۱۳۸۸ کے درمیان جو رمضان شریف گئے تھے، ان مبارک مہینوں میں دوسرے بزرگوں سے استفادہ کیا تھا، ان میں سے پہلا رمضان المبارک کو میں اور میرا ایک ساتھی مولوی احمد حسین پیر گوٹھ نامی بستی جا کر دورۂ قرأۃ کیا تھا، اگلا رمضان المبارک تفسیر قرآن مجید کے حوالے سے خان پور شہر گئے اور حضرت العلامۃ حافظ القرآن والحدیث شیخ طریقت محمد عبد اللہ درخواستی صاحب سے خوب خوب استفادہ کیا۔ یاد رہے کہ حضرت مولانا کے یہاں میرا دو مرتبہ جانا ہوا تھا، ایک مرتبہ کا تذکرہ تو یہاں ہوا، دوسرے مرتبہ حضرت سے استفادہ میری لاہور سے واپسی پر ہوا تھا، آخر الذکر ملاقات اور استفادے کے دوران میں اور میرے ساتھی مولوی احمد حسین نے حضرت مولانا سے مکی مسجد خان پور میں بیعت کی تھی، وظیفے صبح کے لئے سو مرتبہ درود شریف اور سو مرتبہ یا عزیز، عشاء کے بعد کے لئے سو مرتبہ استغفار اور سو مرتبہ کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ علاوہ ازیں پانچ فرائض کے بعد الحمد للہ اور تکبیر مقرر کردی۔ اور ان وظائف پر مداولت کی تاکید کی تھی''۔

اس پڑھائی کے دوران مولانا ابوالحسین صاحب کو یرقان کی بیماری لاحق ہوئی تھی، بالآخر ۱۸ر جمادی الثانی ۱۳۸۸ھ کو ہسپتال داخل کرایا گیا، اور ۲۴ر جمادی الثانی تلی کا آپریشن ہوا تھا، اس خطرناک بیماری کے دوران آپ کے دو ساتھی احمد حسین اور امیر حسین نے دل کھول کر خدمت کی تھی ۔

۳ر شعبان المعظم ۱۳۸۸ھ بعد نماز جمعہ جامع مسجد ٹھری میں حضرت مولانا کی دستار فضیلت بندھی

گئی تھی، اس دستار بندی میں حضرت مولانا کے ساتھ اور بھی چار برمی طلبہ شریک تھے، وہ تھے مولوی عبدالرزاق نافیتارڈیلی، مولوی احمد حسین عرب شاہ فاروی، مولوی امیر حسین عرب شاہ فاروی اور مولوی فیض اللہ منگالوی۔ اس کے بعد مولانا میانوالی گئے، اور شعبان ۱۳۸۸ھ سے لے کر ۲۷ر رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ تک ترجمان القرآن حضرت مولانا محمد زمان صاحب سے علوم قرآن میں خوب استفادہ کیا تھا۔

۲۸ر رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ کو آپ مزید پڑھائی کی خاطر لاہور روانہ ہوئے، لاہور جامع مدنیہ میں آپ کا چچا مولانا حبیب اللہ صاحب کے یہاں ۷ر شوال تک قیام کیا، اس کے بعد خیر المدارس ملتان میں مزید پڑھائی کی خاطر پہنچے، داخلہ تو لیا تھا، مگر دلجمعی نہ ہوسکی، تو واپس لاہور آگئے تھے۔ ۱۲ر شوال ۱۳۸۸ھ کو جامعہ اشرفیہ لاہور میں داخلہ لیا۔ اب حضرت مولانا لاہور میں اپنی پڑھائی کے حوالے سے کیا کہتے ہیں، خود ان کی خود نوشتہ تحریر سے پڑھئے:

''۱۲ر شوال المکرم ۱۳۸۸ھ بروز جمعرات میں اپنا محترم ساتھی مولانا منیر احمد صاحب رمیوربیلی کی معیت میں جامعہ اشرفیہ لاہور پہنچا، نائب مہتمم حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب کے پاس داخلہ کے لئے مشکوٰۃ شریف کا امتحان دیا، ۱۸ر شوال المکرم ۱۳۸۸ھ بروز بدھ حضرت اقدس مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی سے سبق شروع کیا، اکابر کا دستور ہے کہ شروع سال کا درس یا تو اتوار سے شروع کیا جاتا ہے، یا بدھ سے ۔ یہاں بخاری شریف حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی سے پڑھی، حضرت کی ذات محتاج تعارف نہیں، انور شاہ کشمیری کے شاگرد، بڑے بارعب انسان تھے۔ اس زمانے میں یہاں مولانا بشیر اللہ صاحب برمی مہاجر مکی بھی تھے، وہ بھی حضرت شاہ صاحب کے شاگردوں میں سے تھے۔ وہ بھی نہایت بارعب انسان تھے، یہاں میں نے حضرت شاہ صاحب کے ممتاز شاگرد حضرت مولانا بجنوری کو بھی دیکھا، آپ بھی بڑے بارعب انسان تھے، شاید حضرت شاہ صاحب کے تمام شاگرد بڑے بارعب ہوتے ہیں ۔ الغرض مولانا کاندھلوی سے خوب خوب استفادہ کیا، حضرت مولانا میں رنگ بلاغت غالب تھا،

جس طرح حضرت انور شاہ صاحب میں رنگ بلاغت غالب تھا، میں نے مولانا کاندھلوی کی تصانیف ''التعلیق الصبیح شرح مشکوٰۃ المصابیح'' اور ''تحفۃ القاری بحل مشکلات البخاری'' سے خوب استفادہ کیا، حضرت مولانا کی یہ عجیب وغریب تصانیف ہیں، مختلف مسائل کے بیان میں کسی کی ذات کی طرف نظر نہیں کرتے بلکہ دلیل اور کلیت کی طرف نظر رکھتے تھے، کلّیت کے تحت جو بھی آجائے اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے ۔

یہاں میں نے ترمذی شریف شیخ الکل حضرت مولانا رسول خان صاحب (خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ) سے پڑھنے کی سعادت حاصل کی، حضرت مانسرہ ہزارہ کے رہنے والے تھے، جسم پتلا مگر نہایت گداز تھا، آپ مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا محمد شفیع صاحب دیوبندی، حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب بجنوری، حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی وغیرھم کے استاد تھے، حضرت میں معقولات شرعی اور معقولات عرفی کا رنگ غالب تھا، اپنے زمانے میں منطق وفلسفہ کے امام سمجھے جاتے تھے۔ حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی بھی آپ کے شاگرد تھے، جو وقت کے عظیم فلسفی عالم تھے، خود مولانا افغانی کے شاگردوں میں بڑے بڑے فلسفی تھے۔ جن میں حضرت مولانا موسیٰ صاحب روحانی بڑے نامور ہوئے، الغرض حضرت مولانا رسول خان صاحب کے درس ترمذی میں مسائل فقہیہ اور مطالب احادیث نبویہ کے تہ بتہ منطق اور فلسفہ کے اہم مسائل بیان ہوتے تھے۔

ابوداؤد شریف حضرت مولانا جمیل احمد صاحب تھانوی مفتی جامعہ اشرفیہ سے پڑھی گئی، آپ حضرت حکیم الامت اشرف علی صاحب تھانوی کے داماد تھے، حضرت میں ادب کا رنگ غالب تھا۔ مسلم شریف حضرت الحاج الحافظ الخطیب حضرت مولانا عبدالرحمن صاحب سے اور طحاوی شریف حضرت مولانا حافظ عبیداللہ صاحب مہتمم جامعہ اشرفیہ سے پڑھی گئی، موخر الذکر دونوں بزرگانِ دین آپس میں سگے بھائی

تھے۔ اور حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب (خلیفہ مجاز حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) کے صاحبزادے بھی''۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ لاہور سے حیدرآباد پھر کراچی آگئے تھے، پھر ٹھہری جا کے تمام اساتذہ سے رخصت لی، مشہور عالم دین حافظ الحدیث حضرت مولانا عبداللہ درخواستی صاحب سے بیعت کی، پھر وطن کا قصد کیا، ویسے ۴؍محرم الحرام ۱۳۹۰ھ میں آپ چاٹگام پہنچے، مولانا نے اپنی واپسی کے حالات تفصیلات سے لکھے، طوالت کے خوف سے یہ سارے حالات یہاں درج نہیں کئے گئے، الغرض چاٹگام سے ٹیکناف ہوتے ہوئے ۷؍محرم الحرام وطن واپس صحیح سلامت پہنچ گئے تھے، اور وطن والوں نے آپ کا خیر مقدم کیا تھا۔

وطن پہنچنے سے قبل ہی یہاں مولانا کی شہرت ہوگئی تھی، اب مدرسہ والے گھر آنے لگے تھے، ہر ایک مولانا کو اپنے مدرسہ لے جانے پر تلے ہوئے تھے۔ بالآخر محرم الحرام کے بقیہ دن گھر ہی میں کاٹ کر یکم صفر المظفر کو مدرسہ محمدیہ پرامپورومنگڈو میں آپ کا تقرر ہوگیا، یہاں مولانا ابوالحسین صاحب نے عرصۂ دراز تک تعلیم دی تھی۔

شروع ہی میں آپ کے حصے میں ہدایہ جلد رابع، شرح تہذیب، ملاحسن، سلم العلوم، شرح عقائد نسفی، شرح ملا جامی بحث اسم جیسی کتابیں دی گئیں، بعد ازاں چند دن جاتے نہ جاتے ۲۷؍صفر کو حدیث نبوی کی معروف کتاب ابوداؤد شریف بھی آپ کے حصے میں دی گئی تھی، اس حوالے سے مولانا رقم طراز ہیں کہ:

'' مابقیہ محرم گھر گزار کر یکم صفر ۱۳۹۰ھ بروز بدھ مدرسہ محمدیہ پرامپورو میں میری تعلیمی کاروائی شروع ہوئی تھی، میرے حصے میں ہدایۃ رابع، شرح تہذیب، ملاحسن، سلم العلوم، شرح عقائد نسفی، شرح ملا جامی بحث اسم جیسی اہم کتابیں آئیں، پھر ۲۷؍صفر ۱۳۹۰ھ کو حدیث کی کتاب ابوداؤد شریف بھی بفضل تعالیٰ میرے حصے میں آئی، اسی سال کے اواخر میں طحاوی شریف بھی پڑھانے کا موقع ہوگیا تھا، الحمدللہ تعالیٰ۔ اسی سال دورۂ حدیث میں دس طلبہ تھے، جن میں مولوی حافظ احمد پرامپوروی، مولوی عبدالعزیز روہانگی، مولوی عبدالحمید روہانگی قابل ذکر جید طلبہ

میں سے تھے، ماشاء اللہ مولوی حافظ احمد مدرسہ محمد یہ پرامپورو کے قابل مدرس ہیں ۔اسی طرح مولوی عبدالعزیز اور مولوی عبدالحمید بھی اکیاب کی نامور درس گاہ مدرسہ عملہ فارہ کے قابل اساتذہ ہیں ۔اللہ تعالیٰ ان کی حیات دراز کرے اور خدمات کی توفیق عنایت کرے۔آمین۔

اگلے سال ۱۳۹۱ھ میں مسلم شریف میرے حصے میں آئی، درس کی خوب توفیق ہوئی ،اس سال میرے شاگردوں میں مولوی شفیق الاسلام پرامپوروی قابل ذکر طالب علم تھا، ماشاء اللہ اس کی لیاقت واستعداد صحیح ہے، آج کل مدرسہ امداد الاسلام شجاع فارہ کے صدر المدرسین کے عہدہ پر فائز ہیں''۔

سیرت وسوانح اور تاریخ کے بعض مندرجات میں ہم ملاحظہ کرتے ہیں کہ بڑے بڑوں میں بعض معاصرین کے درمیان عجیب وغریب کی چپقلس پائی جاتی ہے۔ٹھیک اسی طرح کی کچھ چیزیں ہمارے بزرگوں کے درمیان بعض امور کے حوالے سے پائی گئی ہیں۔حضرت مولانا ابوالحسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا سیدالامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عمر میں پندرہ سال چھوٹے تھے۔

اندازہ ہوا ہے کہ مولانا ابوالحسین صاحب جس زمانے میں جامع العلوم شقدارفارہ میں زیر تعلیم تھے، اسی زمانے میں مولانا سیدالامین اس ادارہ کے استاداعلی تھے۔مگر مولانا ابوالحسین کو حضرت مولانا سیدالامین صاحب سے باضابطہ طور پر شرف تلمذ حاصل نہیں تھا۔

بعد میں یہ دونوں بزرگ ترین عالم دین ایک دوسرے کے معاصر ٹھہرے، مولانا ابوالحسین صاحب کے مذکورہ خود نوشتہ بعض مندرجات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا بعض امور کے حوالے سے حضرت مولانا سیدالامین کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، ان میں سے کچھ امور تو آپس کے سوئے تفاہم تھے اور کچھ امور نظر کی تفاوت، جبکہ بعض چیزیں معاصرانہ چپقلس سے متعلق تھیں تو بعض چیزیں ان دونوں بزرگوں کی افتاد طبع سے متعلق، بہرحال جو بھی ہوا ان دونوں بزرگوں کے آپس میں اختلافات تھے۔

اب یہاں مولانا کے مندرجات سے چند چیزیں بطور اقتباس حاضر خدمت کی جارہی ہیں، ناظرین سے درخواست ہے کہ ان چیزوں کو دیکھ کر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ معاذ اللہ ہماری یہ دونوں بزرگ ترین معاصر شخصیات میں کوئی دینی، روحانی، فکری، ثقافتی اور بطور خاص اخلاقی

اعتبار سے خامیاں بھی تھیں، جن پر زمانے کی انگلیاں اٹھ سکتیں، بلکہ یہ خیال کرنا چاہئے کہ کبھی کبھار اور کہیں نہ کہیں بڑے بڑے معاصرین کے درمیان اس قسم کی رسہ کشیاں اور چپقلس ہوجاتی ہے، اگر چہ ان دونوں بزرگوں کے درمیان بعض امور کے حوالے سے کچھ معاصرانہ رسہ کشی یا شکایت پائی جاتی ہے، مگر یہ بھی یاد رہے کہ دنیا میں ہر شکایت بجا نہیں ہوتی، بعض شکایات کے خلاف صفائی بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

باوجودیکہ ہمارے ان دونوں بزرگوں کے مابین بعض امور کے حوالے سے کچھ شکایات پائی جاتی ہیں، مگر دونوں ہمارے علاقے کے معروف ومشہور جلیل القدر عالم دین تھے، جنہوں نے عرصۂ دراز تک کبھی کبھی ایک ہی درسگاہ میں اور کبھی علیحدہ قوم وملّت کی خدمات انجام دی تھیں، ایک ہی سماج ایک ہی معاشرہ میں ان دونوں کی قومی، ملّی، دینی، ثقافتی، علمی، فکری اور سیاسی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔

مولانا لکھتے ہیں کہ:

''دار العلوم محمد یہ پرامپورو میں میرے تقرر کے وقت دو دو میاں صاحب مہتمم اور مولانا سیدالامین صاحب منگنماوی ذمے دار اعلیٰ تھے۔مولانا کی طبیعت میں بچپن سے ''ہر دلعزیزی'' کی لت لگی ہوئی تھی، بسا اوقات ان کی یہ طبیعت دوسری شکل بھی اختیار کر جاتی تھی، اس درسگاہ میں میرا تقرر ہونا پھر درسیات کی بعض اہم کتابیں میرے حصے دینا ان کو ناپسند بلکہ ناگوار تھا۔چنانچہ مولانا نے اپنے بعض شاگردوں کے ذریعے مجھے بہت ستایا، بطور خاص مدرسین میں مولوی عبدالحکیم صاحب کے ذریعے میرا سر کچل دینا چاہا۔ادھر میں بھی طبقا ایک آزاد منش رہا، کسی کی غلامی مجھے سرے سے پسند نہ تھی، مولانا نے اپنی بساط بھر کوشش کی کہ میرا سر نیچا ہوجائے، اور میں بھی ان کی غلاموں کے زمرے میں آجاؤں، مگر اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم سے میں ہر محاذ پر کامیاب رہا اور وہ لوگ ناکام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

اور مولانا سیدالامین صاحب اپنے ماتحت کے مدرسین کرام کو ہمیشہ غلام بنائے رکھنا چاہئے تھے۔مدرسین بے چارے مارے خوف کے ان کے سامنے کچھ کہنے کی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے، چوں کہ میری طبیعت میں جرأت کا رنگ نمایاں تھا، اسی

لئے مجھے اس قسم کی غلامی برداشت نہیں ہوتی، چنانچہ میں نے بعض مدرسین سے یہ
کہا کہ یہ ایک دینی ادارہ ہے، کسی کی جاگیرداری نہیں، ہمیں اپنے دلوں سے خوف
نکال دینا چاہئے، میرے اس احتجاج پر بعض مدرسین کا کہنا تھا کہ ہم میں سے بعض
تو مولانا کے براہ راست شاگرد ہیں، ڈر ہے کہ ہماری کوئی سرگرمی استاد کی مخالف نہ
ہوجائے، ایک طرف عار ہے تو دوسری طرف تقاضائے ادب، جبکہ بعض مدرسین
مولانا کے شاگرد تو نہیں لیکن مارے خوف کے ان کے سامنے سر اونچا کر کے کچھ
کہنے کی ہمت نہیں کر پاتے ہیں ------- ،،

اور مولانا سید الامین صاحب بڑے چالاک آدمی ہیں، انہوں نے اپنی جادوگری
سے خاصے لوگوں کو مسخر کر رکھا ہے، مولانا کوئی دوراندیش تو نہیں، چالاک ضرور ہیں،
حریص بھی ہیں اور تھوڑی چیزوں پر اپنی عزّت وآبرو کو نیلام کرنے والے بھی
------،،

مولانا ابوالحسین صاحب نے اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ لکھا ہے، مگر یہاں ایک طرف طوالت کا خوف ہے تو دوسری راقم سطور خود بھی یہ نہیں چاہتا کہ ان بزرگوں کے مابین کبھی پائی جانے والی رنجشوں کو از سر نو اچھال کر تلخی اور بدمزگی کا سروسامان کر دیا جائے، اس سے نقصانات کا امکان ضرور ہے مگر فائدے کچھ بھی مرتب ہونے والے نہیں، تاہم بطور نمونہ کچھ چیزیں درج کر دی گئی ہیں، اس سے کسی کا دل دکھے تو معذرت !!

۱۳۹۴ھ کے اختتام پر مولانا ابوالحسین صاحب اپنے دو ساتھی مولانا منیر احمد اور مولانا محمد امین صاحبان سمیت جامعہ محمدیہ پرامپورو سے علیحدہ ہو گئے اگلے تعلیمی سال کے لئے جامعہ عربیہ امدادالعلوم شجاع فارہ کے لئے مقرر ہو گئے، مولانا کے بیان کے مطابق ان تینوں کی علیحدہ گی کی وجہ سے جامعہ محمدیہ کے تعلیمی حالات متأثر ہو گئے تھے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:

’’کسی بھی طرح مولانا سید الامین صاحب سدھرتے نہ تھے، اس وجہ سے احقر
بشمول مولانا منیر احمد صاحب اور مولانا محمد امین صاحب جامعہ محمدیہ سے علیحدہ
ہو گیا، اور اگلے سال جامعہ عربیہ شجاع ڈیا کو جا آباد کیا، دراں حالیکہ جامعہ محمدیہ پر

میپورو کے تعلیمی محور بھی ہم تینوں تھے، ہماری علیحدگی کی وجہ سے جامعہ محمدیہ کی تعلیمی
حالت خراب ہو گئی تھی، اکثر طلباء میرے ساتھ یہاں آ گئے تو مولانا سید الامین
صاحب کو احساس ہوا کہ اگر جامعہ کو دوبارہ بارونق کرنا ہے تو ہم تینوں کو یہاں دوبارہ
لانا ضروری ہے، یوں مولانا نے ہمیں واپس لانے کے لئے اپنی کوشش تیز کر دی،
بالآخر ہم بھی مان گئے اور دوبارہ جامعہ محمدیہ پرامپورو واپس آ گئے تھے‘‘۔

۱۳۹۶ھ میں مولانا سید الامین صاحب حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کی نیت سے حجاز مقدس گئے تو اس درمیانی مدت میں بخاری شریف کامل بھی حضرت مولانا ابوالحسین صاحب کے حصے میں آئی، اسی طرح ۱۹۷۸ء کی ناکام آپریشن کے دوران مولانا سید الامین صاحب بنگلا دیش ہجرت کر گئے تو بخاری شریف کا درس مولانا ابوالحسین کو دینا پڑا تھا، اس دوران کبھی کبھار فرمایا کرتے تھے کہ اگر مولانا سید الامین صاحب ہوتے تو یہ نوبت کبھی نہیں آتی۔

مولانا ابوالحسین صاحب جامعہ محمدیہ فرانفور میں اپنی تدریسی زندگی میں مختلف عہدوں پر فائز بھی رہے تھے، کبھی ناظم دار الطلبہ تھے تو کبھی ناظم تعلیمات۔ ۱۴۰۰ھ کے دوران عہدۂ صدارت ہمارے ان دونوں بزرگوں حضرت مولانا سید الامین صاحب اور حضرت مولانا ابوالحسین صاحب کے درمیان مشترک تھا۔

۱۴۰۳ھ میں جامعہ محمدیہ میں فنونات عالیہ کا درجہ کھولا گیا، اور فنونات کی ساری کتابیں ان دونوں بزرگوں کے حصے میں تھیں، اس حوالے سے مولانا رقم طراز ہیں کہ:

’’۱۴۰۳ھ میں جامعہ محمدیہ پرامپور میں فنونات عالیہ کا درجہ کھولا گیا، اور فنونات کی
ساری کتابیں احقر اور مولانا سید الامین صاحب کے حصے میں تھیں، فنونات عالیہ
کے طلباء میں مولوی مشتاق احمد مرنگلوی بڑا قابل ذکر جید طالب علم تھا، اپنی جماعت
میں فائق تھا، میرزاہد، ملاجلال، رشیدیہ، خیالی اور تلویح میرے حصے میں تھیں،
قاضی اور حمد اللہ مولانا سید الامین صاحب پڑھاتے تھے، عزیز مولوی مشتاق احمد
میرے منظور نظر تھا، بڑا خلیق تھا، چار سال تک مسلسل میرے کمرہ میں رہ کر میری
خدمت کا فریضہ انجام دیتا رہا تھا، مجھے اپنے حقیقی باپ جیسا سمجھتا تھا، اور میں بھی

حقیقی بیٹا جیسا تصور کرتا رہا تھا، اس کے علاوہ اور ایک طالب علم مولوی مختار احمد تنگبازاری بھی تھا، ماشاءاللہ علمی قابلیت کے لحاظ سے مشتاق احمد سے کسی طرح کم نہ تھا"۔

۱۴۰۵ھ میں جامعہ محمدیہ پرامپور کے منتظمین کے درمیان بعض انتظامی امور کے حوالے سے شدید اختلافات رونما ہوئے، جہاں تک مولانا ابوالحسین صاحب کی تحریر سے معلوم ہوا کہ ان اختلافات کی وجہ سے مولانا دل برداشتہ ہوگئے تھے۔ ایسے حالات میں جامعہ عالیہ شقدارفارہ کی طرف سے مولانا اسعد اللہ صاحب اور حضرت مولانا سید عظیم صاحب نے مولانا کو یہاں آنے کی دعوت دی، تو آپ لبیک کہتے ہوئے وہاں منتقل ہوگئے، ادھر مولانا شقدارفارہ کے مدرسین میں شامل ہوئے تو ادھر جامعہ محمدیہ والوں کے اصرار شروع ہوگئے کہ مولانا پھر واپس چلے آئیں، تو ان لوگوں کے اصرار پر پھر مولانا پرامپورو واپس آگئے تھے۔ مولانا نے ۱۴۰۶ھ سے ۱۴۰۹ھ تک پھر سے جامعہ اسلامیہ محمدیہ پرامپور میں مدرسی اختیار کرلی تھی، اس حوالے سے مولانا رقم طراز ہیں کہ:

"۱۴۰۹ھ کے شوال کو میں نے جامعہ محمدیہ پرامپورو سے علیحدگی اختیار کرلی۔ جس کا اجمال یہ ہے کہ پرامپورو کے بعض سرآوردہ لوگوں کے دل میں بعض عصبیت جاہلیہ نے سر اٹھایا تھا، جس کا اصل محرک مولانا افلاطون تھا، مولانا علمی حیثیت سے نہایت کم زور تو تھے ہی، ساتھ ہی ساتھ ان کی ظاہری حالت متکبرانہ تھی، ان کا ایک بہنوی مولوی عبدالسّلام تھے، جو اس علاقہ کے معروف کشتی بان (بلی) محمد سلام کے بھائی تھے، ان لوگوں میں پہلوانی کا غلبہ تھا، یوں انہوں نے بزور طاقت جامعہ کے انتظامات پر ڈاکہ ڈالا، تو ہم نے یہاں سے علیحدگی کو مناسب سمجھا تھا"۔

جامعہ محمدیہ سے موخرالذکر علیحدگی کے بعد ۱۴۱۰ھ کا پورا ایک سال جامعہ امدادالاسلام شجاع فارہ میں آپ نے تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ بعض انتظامی خدمات بھی انجام دیں، مگر امدادالاسلام شجاع فارہ کی مالی حالت بہت خراب تھی، اسی لئے دورۂ حدیث تک کی تعلیم ملتوی کردی گئی تھی، چنانچہ مولانا نے اگلے سال ۱۴۱۱ھ کو جامعہ شقدارفارہ جانا مناسب سمجھا، اس حوالے سے مولانا لکھتے ہیں کہ:

" جامعہ امداد العلوم شجاع ڈیا کے حالات ناگفتہ بہ ہونے کی وجہ سے اپنے دونوں رفقائے خاص مولانا منیر احمد صاحب اور عزیز مولوی محمد حسین پرامپوروی کو

لے کر ہم جامعہ عالیہ شقدارفارہ چلے آئے۔ اور یہاں آکر درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا، اس وقت یہاں کے جید طلباء میں مولوی حافظ احمد پرامپوروی اور مولوی محمد الیاس بارنگیاڈیلوی تھے۔ ۱۴۱۰ھ سے احقر جامعہ عالیہ شقدارفارہ میں عہدۂ صدارت کے ساتھ شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہا، یہاں میرے آنے سے پہلے مولانا عبدالوہاب صاحب صدر المدرسین کے منصب پر فائز تھے، میرے آنے کے بعد مولانا مدرسہ نظامیہ کائندہ کاٹا چلے گئے، احقر اس جامعہ میں ۱۴۱۳ھ تک رہا، پھر جامعہ محمدیہ پرامپورو آیا، یہاں ایک سال بحیثیت صدرالمدرسین اور شیخ الحدیث گزارا تھا، اس کے بعد ۱۴۱۴ھ میں جامعہ امدادالاسلام شجاع ڈیا چلا آیا، اسی سال ۲۹ / مارچ ۱۹۹۳ء بمطابق ۱۸ / ذی قعدہ ۱۴۱۴ھ بروز پیر موسمی طوفان ہوا تھا، جس کی وجہ سے منگڈو کے پورے علاقہ میں بہت ہی نقصانات ہوئے تھے، اور جامعہ امدادالاسلام اور اس کی جامع مسجد توڑ پھوڑ گئی تھی"۔

حضرت مولانا ابوالحسین صاحب بہت بڑے عالم دین، منتظم اور جلیل القدر ہر دل عزیز معلم ومدرس تھے، سرزمین ارکان اور اس کے باہر بھی حضرت کے انگنت تلامذہ پائے جاتے ہیں، جتنوں سے راقم کی ملاقاتیں ہوئیں، سب کو حضرت مولانا کا مداح پایا، ظاہر ہے کہ ان کے بے شمار تلامذہ ہیں، لیکن یہاں ان چند تلامذہ کے اسمائے گرامی درج کروتیا ہوں، جن کا تذکرہ خود مولانا نے اپنی مذکورہ خودنوشتہ تحریر میں درج کردیا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سارے بڑے خوش قسمت تلامذہ میں، جن کا تذکرہ خود استاد نے کیا ہو:

(۱) مولوی علی جوہر صاحب۔
(۲) مولوی ذاکرحسین صاحب۔
(۳) مولوی شبیر احمد صاحب چالی پرانگی۔
(۴) مولوی مشتاق احمد صاحب مرنگلوی۔
(۵) مولوی مختار احمد صاحب تنگ بازاری۔
(۶) مولوی محمد حسین صاحب۔

(۷) مولوی محمد حسین احمد صاحب بن مولانا مقبول احمد مرحوم کوار بیلی۔

(۸) مولوی عبدالرشید صاحب کوار بیلی۔

(۹) مولوی حافظ احمد صاحب پرامپوروی۔

(۱۰) مولوی محمد الیاس صاحب بارنگیار ڈیلی۔

حضرت مولانا نے اپنی مذکورہ خودنوشتہ تحریر میں اپنی حیات مبارکہ کی ابتدا سے ۱۴۱۴ھ کے جستہ جستہ حالات لکھے ہیں، جس میں حضرت نے اپنی تدریسی خدمات کے حوالے سے ۱۳۹۰ھ سے لے کر ۱۴۱۴ھ تک کی تفصیلات دی ہیں۔ جنھیں ایک مختصر سے گوشوارہ میں ملاحظہ کیجئے:

اعداد	ازسن ہجری	تاسن ہجری	مقامات خدمات
۱	۱۳۹۰ھ	۱۳۹۴ھ	جامعہ محمدیہ پرامپورو
۲	۱۳۹۵ھ	۱۳۹۶ھ	جامعہ امدادالاسلام شجاع ڈیا
۳	۱۳۹۶ھ	۱۴۰۵ھ	جامعہ محمدیہ پرامپورو
۴	۱۴۰۵ھ	۱۴۰۶ھ	جامعہ عالیہ شقدارفارہ
۵	۱۴۰۶ھ	۱۴۰۹ھ	جامعہ محمدیہ پرامپورو
۶	۱۴۰۹ھ	۱۴۱۰ھ	جامعہ امدادالاسلام شجاع ڈیا
۷	۱۴۱۰ھ	۱۴۱۳ھ	جامعہ عالیہ شقدار پارہ
۸	۱۴۱۳ھ	۱۴۱۴ھ	جامعہ امدادالاسلام شجاع ڈیا

مولانا عبدالسبحان صاحب گرھاخالویؒ، منگڈوی:

سرزمین ارکان کے مائیہ ناز عالم دین شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالسبحان گرھاخالوی کی ولادت باسعادت جنوبی منگڈو کی معرف بستی گرھاخالی میں ہوئی، آپ کا پدری سلسلہ نسب یوں ہے: عبدالسبحان بن ابوطالب بن علیم الدین بن عظیم الدین اور مادری سلسلے نسب یوں ہیں: عبدالسبحان بن عقیمۃ خاتون بنت خلیل الرحمن بن صورت علی میاں جی بن فتح علی۔ آپ کے والد گرامیٔ مرحوم نہایت عالم دوست، گاؤں کے ہر دل عزیز اور نیک صفات انسان تھے، اور والدۂ مرحومہ بھی ایک پاک بازا ورسیدھی سادھی خاتون تھیں۔

حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب کے خاندان میں مولانا عبدالباریؒ ایک جید عالم دین گزرے، جو حضرت کے نانا کے حقیقی بھائی تھے، مولانا عبدالباریؒ حلقۂ دیوبند کے جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری صاحب ''بذل المجہود'' کے تلامذہ میں سے تھے، اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ کے ہم عصر تھے۔

مولانا گرھاخالوی کی تعلیم علاقہ سے شروع ہوئی۔ دوسال کے اندر مولانا سعید اکبر گرھاخالویؒ سے ناظرۂ قرآن کریم، ادعیۂ ماثورہ، کلمہ، نماز اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، دریں اثنا سرکاری اسکول سے برمیز میں چوتھی جماعات تک کی تعلیم بھی پائی تھی۔ پھر دارالعلوم مرنگلوا میں داخلہ لیا، جہاں سے جماعت ششم تک تعلیم پا کر ٹیکناف گئے، یہاں آپ نے اس وقت کے معروف عالم دین حضرت مولانا ابراہیم قطبیؒ مولانا محمد اسماعیل خنڈ لی اور مولانا محمد امین شقدارفاروی وغیرہ سے ایک سال تعلیم حاصل کی۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم کے حوالے سے صدیق مکرم مولانا حافظ محمد صدیق صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''محدث صاحب چھ سال کی عمر (۱۹۴۱ء) میں مکتب میں داخل ہوئے، دوسال کے اندر مولانا سعید اکبر گرھاخالوی سے ناظرۂ قرآن کریم، ادعیۂ ماثورہ، کلمہ، نماز اور اردو فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، پھر دوسال ۱۹۴۳ء تک محترم ماسٹر نورالاسلام مرنگلویؒ سے پرائمری تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دوسال ۱۹۴۵ء تک برمیز تعلیم حاصل

کی، ۱۹۴۷ء کو ملک میں آزادی کی تحریک چلی، جس کی وجہ سے بدامنی اور افراتفری کی فضا قائم ہوئی، ویسے ایک سال تک تعلیم موقوف رہی، اس کے بعد ۱۹۴۸ء میں مولانا عبد الباری صاحب (جن کا تذکرہ اوپر آیا ہے) نے محدث صاحب کو بلاکر صرف کی کتاب ''میزان الصرف'' شروع کروادی، بہت ہی قلیل مدّت میں حضرت نے جماعت ہفتم تک ہدایۃ النحو وغیرہ کتابیں پڑھیں، ۱۹۴۹ء کو محدث صاحب مدرسۃ دار العلوم مرنگلوا (اس کی بنیاد ۱۹۳۲ء میں مولانا اشرف الزمانؒ اور مولانا عبد السلام مرنگلوانے رکھیؒ ہے) میں داخل ہوئے، اور دو سال ۵۰-۱۹۴۹ء میں جماعت ششم یعنی ثانیۃ (نور الایضاح، ہدایۃ النحو، اصول الشاسی وغیرہ) اور جماعت پنجم یعنی ثالثۃ (کافیۃ، کنز الدقائق، شرح تہذیب وغیرہ) کی کتابیں یہاں پڑھیں، اس وقت یہاں کے سینئر اساتذۂ کرام یہ تھے: فخر العلماء مولانا خلیل الرحمن بحرسراوی (مظاہر علوم سہارن پور کے فارغ ہیں۔ سن فراغت ۱۳۴۱ھ / 1921ء ہے) محقق زمان حضرت مولانا نور احمد گدوسراوی (مظاہر علوم سہارنپور کے فارغ ہیں سن، فراغت ۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء ہے۔۔۔۔۔۔۔۔) وغیرہ تھے۔ جن سے محدث صاحب نے خوب خوب استفادہ کیا''۔

بعد ازاں اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور ۱۹۵۱ء میں ازہر ہند دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا، آپ نے یہاں ۱۹۵۶ء تک تعلیم حاصل کی، مشہور روایت کے مطابق دار العلوم میں آپ نے ہر سال جماعت میں اوّل پوزیشن حاصل کی، البتہ یہ حقیقت ہے کہ آپ نے دورۂ حدیث کے امتحان میں اوّل پوزیشن ضرور حاصل کی تھی، جس کی تفصیلات اگلی سطور میں آرہی ہیں، بہر حال آپ کی اعلی تعلیم کے حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کے قلم سے ملاحظہ کیجئے:

''اس دوران محدث صاحب کے دل میں دار العلوم دیوبند جانے اور حضرت سید مولانا حسین احمد مدنیؒ سے علم حاصل کرنے کا داعیہ اور شوق پیدا ہوا۔ اس شوق کی خاطر محدث صاحب نے ۱۳۷۱ھ / 1951ء کو دیوبند کا رخ کیا، اور ازہر ہند دار العلوم دیوبند میں داخلہ لیا۔ داخلہ لینے کی بعد مسلسل پانچ سال پڑھ

کر ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۶ء میں وہیں سے فراغت حاصل کی۔ حضرت نے بخاری شریف کامل شیخ العرب والعجم سید حسین احمد مدنیؒ سے پڑھی، ان کے علاوہ دیگر کتابیں امام المعقولات علامہ محمد ابراہیم بلیاویؒ، صاحب ''ضیاء النجوم شرح سلم العلوم'' امام الهیئۃ والفلکیات حضرت مولانا بشیر احمدؒ، حضرت مولانا فخر الحسنؒ سابق شیخ الحدیث وصدر مدرس دار العلوم دیوبند، صاحب ''التقریر الحاوی شرح بیضاوی'' حضرت مولانا معراج الحق صاحب سابق صدر مدرس ونائب مہتمم دار العلوم دیوبند، حضرت مولانا ظہور احمد صاحبؒ، حضرت مولانا جلیل احمد صاحبؒ، حضرت مولانا نصیر احمد صاحبؒ سے پڑھیں۔ خارجی اوقات میں شیخ الادب مولانا اعزاز علیؒ سے مختصر المعانی، حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ سے ملفوظات تھانویؒ، مولانا نصیر احمد صاحبؒ سے اقلیدس، مولانا حکیم عبد اللہؒ سے طب میں قانونیہ اور علامہ بلیاویؒ سے امور عامہ اور اشارات پڑھیں۔ حضرت خود تحریر فرماتے ہیں کہ: ''حضرت شیخ مدنیؒ کی وفات کے خوف سے جلدی جلدی ضروری کتابیں پڑھ کر دورہ پڑھ لیا تھا۔ فراغت کی بعد فلسفہ، عقائد، معقولات اور ادب میں داخلہ لیا، اس سال (فنونات کے سال) شیخ مدنیؒ نے بخاری باب الاغتسال فی العلم والحکمۃ تک پڑھائی تھی کہ وفات کا سانحۂ عظمی پیش آگیا۔ اس کے بعد حضرت مولانا فخر الدینؒ نے بخاری پڑھائی، نصف سال میں یہ ناکارہ وطن واپس لوٹ گیا''۔

دورۂ حدیث میں تفوق کلی حاصل کرنے کی حوالے سے مولانا محترم حافظ محمد صدیق صاحب نے حضرت مولانا کی ایک قلمی تحریر نقل کی ہے، جس میں حضرت نے فرمایا کہ:

''اللہ کی رحمت ۱۳۷۶ھ / ۱۹۵۶ء میں خلاف توقع اس ناکارہ کو دورۂ حدیث میں تفوق کل کی پوزیشن نصیب ہوئی، جب کہ درجۂ ثانی (دوسری پوزیشن حاصل کرنے والے) میں تین حضرات اور درجۂ ثالث (تیسری پوزیشن حاصل کرنے والے) میں بھی تین تھے۔ درحقیقت ان حضرات کی ذکاوت، ذہانت، فطانت

اور قابلیت کے سامنے ناکارہ کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ یہ محض مالک کی ذرہ نوازی تھی“۔

دارالعلوم دیوبند میں حضرت نے وقت کے بڑے بڑے ماہرین فن اور تاریخ دارالعلوم کے مایۂ ناز اساتذہ سے استفادہ کیا تھا، ان ارباب عمل وفضل کے فیوض وبرکات سے آپ کی خداداد صلاحیت میں مزید نکھار آگیا، ہم ذیل میں حافظ محمد صدیق صاحب سے مستعار لیتے ہوئے ان برگزیدہ ہستیوں کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں، اور یہ بھی دکھاتے جاتے ہیں کہ حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب نے دارالعلوم میں کن کن اساتذہ سے کون کون سی کتابیں پڑھی تھیں:

(۱) مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف پڑھی۔

(۲) ترمذی شریف، امور عامہ، اور اشارات مولانا محمد ابراہیم بلیاوی سے۔

(۳) مسلم شریف مولانا فخر الحسن مرادآبادی سے پڑھی۔

(۴) ابوداؤد مولانا بشیر احمد خان بلند شہری سے پڑھی۔

(۵) ابن ماجہ مولانا ظہور احمد دیوبندی سے پڑھی۔

(۶) سنن نسائی مولانا خلیل احمد کیرانوی سے پڑھی۔

(۷) طحاوی شریف مولانا عبدالاحد دیوبندی سے پڑھی۔

(۸) موطا امام مالک وموطا امام احمد مولانا مبارک علی سے پڑھی۔

(۹) بخاری شریف کا کچھ حصہ مولانا فخر الدین مرادآبادی سے پڑھی۔

(۱۰) حجۃ اللہ البالغۃ، ملفوظات تھانویؒ، قاری محمد طیب صاحبؒ سے پڑھی۔

(۱۱) تلخیص المفتاح، مختصر المعانی، عروض المفتاح مولانا اعزاز علیؒ سے پڑھی۔

(۱۲) اقلیدس مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ سے پڑھی۔

(۱۳) قانونچہ مولانا حکیم عبدالقدوس صاحب سے پڑھی۔

اور بھی چند حضرات اساتذہ سے آپ نے خوب خوب استفادہ کیا تھا، جن میں قابل ذکر یہ ہیں:

(۱) مولانا محمد حسین بہاری۔

(۲) مولانا محمد نعیم دیوبندی، مولف کمالین شرح جلالین۔

(۳) مولانا سید حسن دیوبندیؒ مولف مصباح المعانی شرح ملاجامی۔

(۴) مولانا میاں اصغر حسین دیوبندیؒ۔

(۵) مولانا فیض علی شاہ ہزارویؒ۔

(۶) مولانا محمد سالم، صاحب زادۂ گرامی قاری محمد طیب صاحبؒ۔

راقم سطور نے ۱۹۹۰ء میں دارالعلوم دیوبند کا سفر کیا تھا، دراں حالیکہ وہ اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھا، اس سفر کے دوران دارالعلوم دیوبند کے بغل میں رہائش پذیر حضرت مولانا محمد حنیف گنگوہی سے ملاقات کی، جب مولانا کو معلوم ہوا کہ راقم کا تعلق ارکان سے ہے، تو مولانا گنگوہی نے حضرت مولانا عبدالسبحان صاحب کا تذکرہ کیا، اور فرمایا کہ وہ ان کے ہم سبق تھے، اور بڑے بلند الفاظ میں حضرت کی علمی صلاحیت وقابلیت واستعداد کا تذکرہ کیا، مزید فرمایا کہ مولانا عبدالسبحان بڑے بلند اخلاق کے فاضل دیوبند ہیں۔

حافظ محمد صدیق کے مطابق مولانا محمد حنیف گنگوہی کے علاوہ بھی محدث صاحب کے دیگر ناقابل فراموش ساتھی تھے، جن میں سے چند کے اسمائے گرامی درج کردیتے ہیں:

(۱) مولانا حافظ خورشید عالم صاحب دیوبندی استاد دارالعلوم دیوبند۔

(۲) مولانا فیض الحسن کشمیری، استاد دارالعلوم دیوبند۔

(۳) مولانا احمد شفیع صاحب چاٹگامی، مدیر دارالعلوم معین الاسلام ہاٹہزاری۔

(۴) مولانا نیک عبدالعزیز ملایاوی، صوبائی وزیر اعلیٰ کلنتان اسٹیٹ، ملائشیا۔

سند فراغت حاصل کرتے ہی مولانا وطن واپس آئے، اور تدریسی وتعلیمی خدمات کے ساتھ مشغول ہوگئے۔ وطن میں آنے کی بعد رمضان المبارک تک چند مہینے دارالعلوم علی تانجو میں تدریسی خدمات کیں، اس کے بعد اگلے سال ۱۹۵۸ء میں جامع العلوم شقدار پارہ میں پڑھائی، پھر ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء دوسال مدرسۃ مظاہر علوم گرھاخالی میں تدریسی فرائض انجام دئے۔

اس کے بعد آپ نے مولمین کا سفر کیا، اور مولمین کی معروف دینی درس گاہ مدرسۃ اشاعت العلوم میں ایک سال تعلیم دی۔ ایک سال کے بعد آپ پھر وطن آگئے۔ 1962ء میں گرھاخالی کی درس گاہ میں پھر مسلسل تین سال تعلیم دی۔ پھر ۱۹۶۴ء کے اواخر میں دارالعلوم علی تانجو تشریف لے گئے، یہاں مسلسل چار سال تدریسی فرائض انجام دیئے۔ بعد ازاں ۱۹۶۸ء میں دارالعلوم مرنگلوا چلے گئے، جہاں

دوسالوں تک پڑھاتے رہے تھے۔

حضرت مولانا ۱۹۷۰ء میں شمالی منگڈو کی معروف دینی وعلمی درس گاہ دارالعلوم میانجان پورتشریف لے گئے، یہاں چارسال تک دورۂ حدیث کی کتابیں پڑھائیں، پھر ۱۹۷۴ء کوحضرت مولانا مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ کے انتظامیہ کے پرزوراصرار پر یہاں آگئے، یہاں آپ نے ۱۹۸۹ء تک مسلسل پندرہ سال درس وتدریس کے منصب عالی پرجلوہ افروز رہے۔

۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا مدرسہ اشرف العلوم اودنگ تشریف لے گئے، یہاں آپ نے ۲۰۰۹ء جنوری تک صحیح بخاری کا درس دیا، حضرت نےؒ ۱۹۶۵ء میں پاکستان کا سفر کیا، اور عارضی طور پر کراچی کا نامور علاقہ ناظم آباد کی جامع مسجد میں امامت وخطابت فرمائی، اس حوالے سے حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

’’محدث صاحب ۱۹۶۵ء میں بغرض سیاحت کراچی تشریف لے گئے تھے اور عارضی طور پر ناظم آباد نمبر 2 کمرشیل ایریا کراچی کی جامع مسجد میں امامت وخطابت فرمائی تھی۔ خود تحریر فرماتے ہیں کہ: ’’ایک دن میں مولانا احتشام الحق تھانویؒ سے ملاقات کے لئے گیا تھا، مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے پرتپاک انداز میں ملاقات کی، اور کسی مدرسہ میں مدرس ہونے کی خواہش ظاہر کی، لیکن مجھے چوں کہ کراچی میں زیادہ عرصہ ٹھہرنے کا ارادہ نہیں تھا اس لئے مسترد کردی۔ چنانچہ میں اس سال ۱۹۶۵ء رمضان المبارک سے قبل واپس ارکان آگیا‘‘۔

مولانا عبدالسبحان صاحب یوں بھی ظاہر ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے تلمیذ خاص تھے، ساتھ ہی مرید خاص بھی۔ آپ نے فراغت تعلیم کے بعد حضرت کے ہاتھ میں بیعت کی تھی ۔

مولاناؒ کوتبلیغی جماعت سے حددرجہ عقیدت اور محبت تھی، ارکان میں پائے جانے والے اپنے وقت کے بڑے بڑے اکابرین جماعت تبلیغ آپ سے ملنے گاہے گاہے آیا کرتے تھے، آپ روداد تبلیغ سن کر بڑے خوش ہوتے تھے، اور جہاں تک معلوم ہوا کہ حضرت کو’’جماعت اسلامی‘‘ سے گویا چھیڑ تھا، اس حوالے سے آپ کی ایک تحریر پیش کی جارہی، جس سے اندازہ ہوگا کہ حضرت مولانا جماعت اسلامی کوکس نظر سے دیکھتے تھے:

’’میں عقیدہ اور عمل کے اعتبار سے اہل سنت والجماعت سے ہوں، جن کے عقائد اور طرز عمل سلفا وخلفا جناب رسولؐ سے صحابہؓ نے، ان سے تابعین نے، ان سے تبع تابعین نے، ان سے دین کے ہر شعبے کے اکابر نے لیا، جن میں آئمہ مجتہدین، فقہاء، محدثین ومتکلمین وصوفیائے کرام شامل ہیں، جن کے عقائد واعمال کا کبرا عن کابر منتقل ہوکر سند الہند الامام شاہ ولی اللہ تک پہنچے اور ان کے اخلاف راشدین کے ذریعے دارالعلوم دیوبند پہنچے، اب دیوبندیت جس عقیدہ کا نام ہے وہ بعینہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے، جس کی تفصیل ہمارے اکابر نے مستقل تصانیف میں بیان فرمائی ہے، اس سلسلے میں حضرت شیخ مدنیؒ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی متعدد مستقل تصانیف ہیں، حالاً بھی ایک رسالہ بنام " مسلک اہل دیوبند" زیر مطالعہ ہے۔ بعض زائغین واہل اہواء نے اصل سے کٹ کر جو الگ الگ راہیں نکالی ہیں جن کی مثالیں قدیم میں بھی ہیں جیسے معتزلہ، خوارج، روافض وغیرہ، ان کی مکمل تاریخ کتابوں میں مذکور ہے، اور جدید میں بھی ہیں، جنہوں نے اپنے ذلیل اور دنیا پرستانہ اغراض کے ماتحت اپنے زور بیان اور چرب زبانی سے الگ الگ فرقے بنالئے ہیں، مثلاً مودودیت، پرویزیت، قادیانیت، مہدویت، نیچریت، بہائیت اور خاکساریت وغیرہ، ان سے ہم اور ہمارے اکابر بالکل بری اور بیزار ہیں۔

شریعت اسلامی کی روشنی میں ان میں سے بعض کو درجۂ کفر میں اور بعض کو درجۂ فسق میں قرار دیا گیا ہے، ان کی تصانیف ہم مطالعہ کرتے ہیں، برائے استفادہ نہیں بلکہ برائے تقابل اور انتقاد کے، چوں کہ آج کل مودودیت کا غلبہ ہے اور بدقسمتی سے کچھ اپنوں کے واسطے سے ہمارے ملک میں آگھسی ہے اور اہل علم کے درمیان اس کا دھوم مچ رہا ہے، اس لئے مزید مطالعہ کرتے ہیں، تاکہ سادہ لوح مسلمانوں کو ان کے دام فریب سے بچایا جاسکے، حاصل مطالعہ یہ نکلتا ہے کہ کچھ تاریخ اور جغرافیائی معلومات ہیں اور کچھ ان کے نظریات باطلہ، انہی معلومات

کے استفادہ کے لئے بحمد اللہ ہمارے اکابرین کچھ کم نہیں، یہ دیس علانیہ کسی کی تردید کا نہیں ہے، دوستانہ اور خیر خواہانہ طور پر سمجھانے سے آجائے تو فبہا ورنہ "لکم دینکم ولی دین" ہے، مزید چھیڑ چھاڑ سے تشتت وتفرق اور دشمنوں کے ناجائز فائدہ اٹھانے کا اندیشہ ہے، جو ہمارے ذاتی اور وطنی مسئلہ کے بالکل خلاف ہوگا، اللہ تعالی ہم سب کو صحیح عقیدہ وعمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین"۔

مولانا عبدالسبحان صاحبؒ دیوبندی مکتب فکر کے بہت ہی بڑے جلیل القدر حنفی عالم دین تھے، مولانا سید الامین کے ہم عصروں میں حضرت کا شمار وقت کے دیگر ہم عصروں کی قطار میں نہایت ہی بلند تر تھا، دونوں حنفی اور مدرسہ دیوبند کے خوشہ چین تھے، بظاہر علمی، فکری، ثقافتی، مسلکی اور مشربی اختلاف نہیں تھا، مگر افتاد طبع، مزاج اور بعض فکری نقطۂ نظر میں قدرے اختلاف بھی دیکھا گیا ہے، یوں گئی صدی کی آخری دہائی میں دونوں بزرگوں کے درمیان ایک اختلاف دیکھا گیا، اس حوالے سے جہاں تک معلوم ہوا کہ مولانا سیّد الامین صاحب عیدین کے مواقع میں عیدگاہوں کو سجانے سنوارنے کے حق میں ایک فتوی کے ذریعے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا، جبکہ مولانا عبدالسبحان صاحب عیدگاہ کو بنانا سنوارنا، اور پھولوں سے اراستہ کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے، بالآخر بات یہاں تک پہنچی تھی کہ اس مسئلہ پر عوام تو عوام علمائے کرام بھی دو گردپوں میں تقسیم ہوگئے، مولانا سید الامین کی رائے سامنے آئی تو لوگوں نے مولانا عبدالسبحان سے استفتاء کیا تھا، راقم سطور نے بہت ہی کوشش کی کہ حضرت مولانا سید الامین صاحب کا فتوی ہاتھ آئے، اس فتوی کے محرر حضرت مولانا شبیر احمد صاحب سے بھی رابطہ کیا گیا، مگر افسوس آخر کار یہ فتوی حاصل نہیں کیا جاسکا، یوں تو مولانا شبیر صاحب مولانا سید الامین کی سوانحی معلومات کے حوالے سے حد درجہ مخلص اور کوشاں ہیں، نہ جانے فتوی کے حوالے سے حضرت کیوں خاموش ہیں، اس خاموشی کی دو وجہ ہوسکتی ہیں، یا تو وہ فتوی سرے سے ضائع ہوگیا، یا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت مولانا عبد السبحان کے فتوی جاری ہونے کے بعد خود مولانا شبیر احمد صاحب پر یہ بات واضح ہوگئی کہ مولانا سید الامین صاحب کے خیالات اس حوالے سے محل نظر تھے، اور نہیں چاہتے کہ چھاپ کر وہ فتوی از سر نو منظر عام پر آجائے۔ بالآخر راقم نے فیصلہ کرلیا کہ مولانا عبدالسبحان والی رائے جو فتوی کی شکل میں چھاپ کر منظر عام پر آگئی ہے،

اسے یہاں درج کردیا جائے، تاکہ ناظرین کرام کو اتنا اندازہ ہوسکے کہ مولانا سید الامین کا نقطہ نظر کیا تھا، یعنی جانب مخالف کی رائے سے جانب موافق کی رائے کو بھانپ لیا جاسکتا ہے۔ کاش مولانا سید الامین والی رائے میرے سامنے ہوتی تو خود دونوں پر علمی اور فکری نقطۂ نظر سے تبصرہ کرنا آسان ہو جاتا، مولانا عبدالسبحان والا فتوی جو ذیل میں نقل کیا جارہا ہے ذرا طویل ہے، مسئلہ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے قارئین کرام تھوڑے صبر سے کام لیں، اس حوالے سے ایک بات اور واضح رہے کہ جس وقت ان دونوں بزرگوں کے فتوے سامنے آرہے تھے اس وقت منگڈ ٹاؤن شپ کے صدر برائے امور مذہی کونسل جناب ڈاکٹر نور الحق صاحب تھے، یوں دونوں بزرگوں کے فتوے ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے، آپ ابھی دیکھیں گے کہ مولانا عبدالسبحان صاحب نے خطاب بھی ڈاکٹر صاحب کو کیا تھا، تاکہ ان کے واسطے سے یہ فتوی حضرت مولانا سید الامین صاحب کے پاس پہنچے:

''بجانب مستطاب عنایت فرمایم، محترم المقام ڈاکٹر نور الحق صاحب ساسنائے کونسل منگڈو! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔۔۔اما بعد:

خیریت سے ہوکر آپ کے لئے دعائے خیر کرتا ہوں، معروض ہے کہ کل پرسوں ایک لفافہ ملا، جس میں مرسل کی جگہ ساسنائے کونسل منگڈو برمیز میں لکھا ہوا ہے، نہ آپ کا نام ہے نہ سیل مہر، لفافہ کے اندر ایک فتوی ہے، جس کو مولانا شبیر احمد صاحب مدرس مدرسہ توحید یہ منگنما نے تخریج فرمائی ہے، تصدیق کنندہ کی جگہ عالی جناب الحاج شیخ الحدیث منگنماوی مدظلہ (مولانا سید الامین صاحب) کا دستخط ہے، دستخط کے اوپر یہ عبارت تحریر ہے: ''احقر کو اس میں کسی کے ساتھ مباحثہ ومجادلہ ہرگز مقصود نہیں ہے، بلکہ ایک شرعی حکم عام مسلمانوں کے سامنے واضح کردینا مقصود عام ہے، اگر یہ خلاف شرع ہو اور کسی حضرت کو اس کے خلاف دلیل مل جائے تو عرض ہے کہ احقر کو اطلاع دی جائے تاکہ اس سے رجوع کرکے اعلان کرسکے''۔

مطالعہ کے بعد بہت تعجب ہوا کہ جو بات مفتی صاحب کو لکھنے چاہئے تھی، وہ مصدق نے کیوں لکھی، فتوی نویسی کے اسلوب متعارف سے عدول کرنے کا مطلب یہ سمجھ میں آیا کہ دراصل مصدق ہی مخرج ہے، کسی مصلحت کی بناء پر یہ

طریقہ اختیار کیا گیا ہے، مولانا کی اس عبارت پر اعتماد کر کے بموجب حدیث **"الدین النصیحة"** کچھ خیر خواہانہ مشورہ دینے کو جی چاہتا ہے، الحمد للہ مشورہ دینے میں اپنے دل کو بالکل صاف پاتا ہوں، انشااللہ جو کچھ عرض کروں گا خالصۃ لوجہ اللہ کہ میرے احباب ومخلصین اور عامۃ المسلمین کی خیر خواہی اور بہبودی کے سوا اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

مشورہ کا حکم شرعی سب کو معلوم ہے کہ جاننا اور عمل کرنا ضروری نہیں ہے، اختیار ہے۔ بھائی صاحب! آپ کے پاس قلم اٹھاتے وقت بہت سی باتیں دل میں موجزن تھیں کہ اپنی کہانی خود اپنی زبانی سناؤں، کیوں کہ آپ کو ایک سلیم الطبع، معتدل مزاج، عاقل اور میرا خیر خواہ سمجھتا ہوں، مگر طوالت کے خوف سے نیز آپ کے ذوق کے ناموافق ہونے کے اندیشے سے نظر انداز کرتا ہوں، مختصرا اصل مدّعا عرض کرتا ہوں، عیدگاہ کو کاغذی پھولوں سے سجانا یہ مطلوب ومقصود شرعی نہیں ہے، اس وجہ سے میرے محدود علم میں قرآن وحدیث، فقہ وتاریخ میں کہیں بھی اس کا ذکر صراحۃً موجود نہیں ہے، یہ منگڈو کے چند آزاد منش جوان طبقہ کا زائدہ نومولود ہے، باقاعدہ مخاصمہ اور مجادلہ کے ساتھ شریعت کا ایک عظیم شعار قرار دے کر فتاوی کی نشر واشاعت کر کے اس کو علم اور عالم گیر بنانے کا منصوبہ زمانہ سابق میں کسی کے دل میں پیدا نہیں ہوا، عربی ضرب المثل ہے "عسی النویر ان یکون عبوسا" بعض چیزیں بظاہر خوش نما نظر آتی ہیں، مگر اس کے باطن میں بہت ہی مہلک اور خطرناک چیزیں مضمر ہوا کرتی ہیں، اس کو بھی میں ایسا ہی سمجھتا ہوں، یہ سامنے جا کر پورے علاقے میں جھگڑا، فساد، قتل وقتال، بغض وحسد اور باہم لگائی بجھائی کا سبب بنے گا، کیوں کہ سب لوگ ایک بات پر متفق ہونا قریب ناممکن ہے۔

اس کے خلاف فتاوی نکل جائیں گے، آج کل تو ایسا ہی مفتی اور قاضی ہیں، نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں یقینا تفریق ہو جائے گی، معاملات کچھری در کچھری ہو کر مسلمان قید وجیل کھائیں گے، اور ان کے گاڑھے خون پسینے کی کمائی غیر قوم چٹ

کر جائے گی، مسئلہ مبحوث عنہا کے متعلق حدیث شریف سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عیدین کی نماز صحراء یعنی آبادی کے باہر میدان میں جا کر ادا فرماتے تھے، جس کی بے شمار مصلحتیں اپنی جگہ مذکور ہیں، اس زمانے میں مسجد نبویؐ کے سامنے وادیٔ بطحان عظیم الشان صحراء تھا، اس کے ایک قطعہ میں آپؐ نماز عیدین ادا فرماتے تھے، حدیث کے راوی حضرت ابن عباسؓ ہیں، وہ اس زمانے میں چھوٹے تھے، چناں چہ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت اپنی کم عمری کی وجہ سے نہ جا سکتا، صرف حضورؐ کی قرابت کے سبب جانا نصیب ہوا، ظاہر سیاق عبارت سے ایسا لگتا ہے کہ کثیر ابن صلت اس وقت بھی موجود تھا، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں، کثیر ابن صلت ویسے آپؐ کے زمانے میں پیدا ہوئے، مگر صحابی نہیں، بڑے درجہ کے تابعی ہیں، اس کا نام قلیل تھا، بقول اصح حضرت عمر ابن الخطابؓ نے اس کا نام کثیر میں بدل دیا، کثیر ابن صلت نے اس عیدگاہ کے قریب ایک مکان بنادیا تھا، جو کہ مشہور تھا، حضرت ابن عباسؓ اپنے بوڑھاپے کے زمانے میں جب دنیا کے استاد ہو چکے، اپنے بچپن کے حالات تلامذہ کے سامنے بیان فرماتے ہیں، بہر حال آپؐ کے زمانے میں کثیر ابن صلت کا دار موجود نہیں تھا، وسیع وعریض صحراء ہی صحراء تھا، اطراف واکناف سے لوگ آتے تھے، تردد ہوا کہ نہ معلوم آپؐ اس عظیم صحراء کے کون سے کونے میں نماز ادا فرمائیں گے، تو آپ نے سب کی معرفت کے لئے ایک نشانی کھڑی کروادی تھی، تاکہ لوگ عیدگاہ کو پہنچان سکیں۔

حضرت ابن عباسؓ واقعہ بیان کرتے وقت کثیر ابن الصلت کا دار موجود ہے، اس لئے معرفت کے لئے اس کا ذکر کیا ہے۔ **"ھذا کله مستفاد من کتب شتی، اکثرہ من العین ومن حاشیة النسائی"** حضور نے معرفت کے لئے کیا نشانی قائم فرمائی تھی اس کو کسی مورخ نے متعین کر کے بیان نہیں کیا، بلکہ اجمالاً یوں کہا کہ وہ کوئی ستون ہوگا یا کوئی پتھر گاڑ دیا گیا تھا، یا مکان بنادیا گیا تھا۔ جیسا کہ مفتی صاحب نے حاشیہ میں بیان کیا ہے **"ھو الشئ الذی عمل من بناءٍ او وضع**

حجر او نصب عمود ونحوه ليعرف به المصلى "فتح الباری میں ہے" **وهوالشی الشاخص** "یعنی کوئی کھڑی کی ہوئی چیز، خط کشیدہ عبارت " **ليعرف به المصلى** "، عمل کی علت بن کر کس قدر صراحت اور وضاحت کے ساتھ بتا رہی ہے کہ نشانی سے قائم کرنا صرف عیدگاہ کی معرفت کے لئے تھا نہ کہ عیدگاہ کے تجمل (خوب صورتی) کے لئے، بھلا ایک پتھر گاڑ دینے سے کیا تجمل ہو سکتا ہے، مفتی صاحب کا لفظ تجمل سے عیدگاہ کے سجانے پر استدلال کرنا عجیب بات ہے "**والله هذا من بليغ الاجتهاد**"۔

ہماری عیدگاہ ہیں مشہور ومعروف ہیں، خاص کر منگڈو کی عیدگاہ کو کون نہیں جانتا، اہل بستی صدیوں سے اس میں عید پڑھتے آرہے ہیں، باشندگانِ منگڈو کے علاوہ پورے علاقے کے لوگ اس کو عیدگاہ کر کے جانتے ہیں، پھر بھی اس میں کاغذی پھول لٹکا کر معرفت کرانے کی کیا ضرورت ہے؟ حدیث میں لفظ "**العلم**" ہے شاید مفتی صاحب نے اس سے خاص جھنڈا مراد لیا ہے، جیسا کہ سوال کی عبارت اور فتوی کی آخری عبارت سے ظاہر ہے۔ اثنائے فتوی جو تفسیر حاشیہ میں نقل فرمایا ہے یعنی "**هوالشى الذى عمل**" اس میں جھنڈے کا ذکر نہیں ہے، دراصل "**العلم**" کے متعدد معانی میں ایک جھنڈا بھی ہے۔مگر حضورؐ نے جو علم قائم فرمایا تھا وہ جھنڈا نہیں تھا، جیسا کہ مفصّل گزر چکا ہے، الحمد للہ شارحین نے تفسیر فرمادی، اگر نہ بھی فرماتے تو ذوقاً بھی جھنڈا مراد لینا مناسب نہیں لگتا، کیوں کہ "بدأ الآذان" کے موقع پر جب ناقوس، قرن اور نار کا ذکر آیا تھا وہاں جھنڈا کا ذکر بھی آیا تھا، تو آپؐ نے عجمی کا شعار کہہ کر مسترد فرمایا تھا، پھر آپؐ نماز کے لئے جھنڈا کیسے نصب فرمائیں گے؟

آپ حدیث تجمل کا مطلب سنئے! امام بخاری نے **باب ماجاء فی العیدین والتجمل فيها** "کے تحت جو حدیث لائی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں "**أخذ عمر جبة من استبرق تباع فى السوق فأخذها فاتى بها رسول الله ﷺ فقال يارسول الله ابتع هذه لتجمل بها للعيد والوفود الخ** " حضرت عمرؓ نے درخواست کی کہ

یارسول اللہؐ آپ اس جبہ کو خرید لیجئے اور اس کے ذریعے زینت حاصل کیجئے عید اور مہمانوں کی آمد کے موقع پر، آپؐ نے جواب دیا "**انما يلبس هذه من لا خلاق له فى الآخرة**" یہ تو ریشم کا کپڑا ہے، اس کو تو وہی لوگ پہنتے ہیں جن کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، ظاہر ہے کہ حدیث کا مطلب حضور کا خود اس کپڑے کو زیب تن فرما کر خوب صورتی حاصل کرنا مراد ہے نہ کہ عیدگاہ کو سجا کر مزین کرنا۔

تعجب ہوتا ہے کہ مفتی صاحب نے "**کما فی البخاری**" کہہ کر صحن گھر، لباس، جسم اور عیدگاہ کے مزین کرنے کو بخاری کی حدیث سے کس طرح ثابت فرمایا ہے، حدیث آپ کے سامنے ہے، مطلب ظاہر ہے، دنیا کے مشہور شارحین حدیث حافظ بن حجر عسقلانیؒ، حافظ بدر الدین عینیؒ اور امام نوویؒ وغیرہ جنہوں نے حدیث سے مستنبط مسائل کو ایک ایک کر کے بیان کیا ہے، کسی نے یہ مسئلہ بیان نہیں کیا، پندرھویں صدی میں آکر بغیر کسی مناسبت کے حدیث سے مسائل کا استنباط بے جوڑ، بے ربط، بے مناسبت، اس کو ہماری بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جائے، آگے چل کر مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ "عیدگاہ میں پھول لگانا فطری ہو یا مصنوعی کیلے کا درخت صرف محمود ہی نہیں بلکہ شعار دین میں داخل ہے" بندہ کہتا ہے کہ قرآن کریم میں "شعائر اللہ" کا لفظ کئی جگہ آیا ہے، ہر جگہ اس کی تفسیریں موجود ہیں، من جملہ ان میں سے ایک یہ ہے "**هى العلائم التى ندب الله اليها وامر بالقيام بها**" یعنی وہ چیزیں جن کے ادب واحترام کے تحفظ کے لئے اللہ نے کچھ احکام مقرر کر دیئے ہیں اور وہ دین کی عظمت اور سربلندی پر دلالت کرتے ہوں۔ (تفسیر ماجدی، ص:٦٠)

خلاصہ یہ ہے کہ شعائر اللہ مامور بہ بلکہ موکد مامور بہ ہونا ضروری ہے، شعائر دین کی بے حرمتی اور ترک بہت بڑا گناہ ہے، "**قال الله تعالىٰ لا تحلوا شعائر الله**" **ومن يعظم شعائر الله فانها من تقوى القلوب** "مفتی صاحب کے اس فتوی سے جناب رسولؐ فداہ ابی وامی سے لے کر صحابہ وتابعین وتبع تابعین اور تمام ائمہؒ

مجتہدین اور آج تک تمام علماء وصلحاء امت جنہوں نے عیدگاہ میں کاغذی پھول نہیں لگایا سب کے سب شعائر دین کی بے حرمتی کرنے والے قرار پائیں گے ''**اعاذنا اللّٰہ منہ ، اللھم احفظنامن ھذا الاجتھاد**'' اچھا اگر علمی حیثیت سے ہم نہیں جان سکے، مگر جاننے والے تو دنیا میں بہت گزرے ہیں، اگر یہ شعائر دین ہوتا تو دنیائے اسلام کے مراکز میں ضرور اس کا تعامل ہوتا، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، دار العلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارنپور، ہاٹھزاری، پٹیہ، بستی نظام الدین دہلی، رائیونڈ کہیں بھی اس کا عمل نہیں ہے، کیا وہ سب گنہ گار رہیں؟۔

اب اس کے جواز اور عدم جواز کے متعلق کچھ احکام مختصرًا سنئے! ظاہر ہے کہ اس کام میں ضرورت شرعی بالکل نہیں ہے، اس کی بناء ہی فخر ومباہات اور ریا کاری ہے، نظر کی خوش نمائی اور دل کی فرحت کے سوا اور کوئی سبب نہیں ہے، جو کام فخر وریا کاری کی بناء پر ہو، وہ شرعًا ممنوع اور باطل ہے، نیز یہ کام بہت سے لوگوں کے مشترکہ چندوں سے انجام پذیر ہوتا ہے، لوگوں کے دل سب یکساں نہیں، کوئی خوشی سے دے گا، کوئی اثر وجبر سے، اور کوئی شرماشرمی سے، ایسا مال لینا شرعًا حرام ہے، حدیث میں ہے'' **لایحل مال امرا لا بطیب نفسه** '' نیز یہ کام مفضی الی النزاع ہونا یقینی ہے، چنانچہ نزاع وقوع میں بھی آچکا ہے، آئندہ رہتی دنیا تک گھر گھر، محلہ محلہ بلکہ ہر سوسائٹی اور ادارہ میں جھگڑا فساد کا دائم اور مستمر رہنا یقینی ہے، جو کام مفضی الی النزاع ہو اس کا ناجائز اور باطل ہونا کتب فقہ میں مذکور ہے، ''**فی مواضع لاتحصی**'' ۔

نیز یہ کام غیر قوموں کے تہواروں کے ساتھ مشابہ ہے، اسلامی اور روحانی عبادت کا جنازہ نکال کر ایک خالص مادی تماشا بن جائے گا، طریقہ عبادت میں غیر قوموں کے ساتھ تشبہ اختیار کرنا حرام ہے، نیز غیر ضرورت شرعیہ بے فائدہ مال خرچ کرنا شرعًا ممنوع ہے، جس کو قرآن پاک نے اسراف اور تبذیر سے تعبیر فرمایا ہے، اہل علم آیات ذیل کی مفصل تفسیر مطالعہ فرمائیں گے، جو میرے خیال میں اس کی

حرمت کے قائل ہونے میں کچھ بھی تأمل نہ ہوگا ''**کلوا من ثمرة واتوا حقه یوم حصاده ولا تسرفوا**'' ''**وآت ذالقربی منه والمسلمین وابن السبیل ولا تبذرتبذیرًا ۔انّ المبذرین کانوا اخوان الشیاطین، وکان الشیطان بربه کفورًا**'' نیز عیدین کا سرور جہاں کہیں مذکور ہے شرعی کی قید لگی ہوئی ہے، میں مفتی صاحب سے بعد ادب عرض کرتا ہوں کہ شاید آں جناب کو غیر معمولی مصرفیات کی وجہ سے اس زمانہ کے نوجوان طبقہ خاص کر حکمران طبقہ اور غیر مسلم حکمران طبقہ کے ساتھ مخالطت کرنے والے مسلمان جوان طبقہ کی علمی اور اخلاقی حالات سے تفصیل کے ساتھ واقفیت نہیں ہے۔

آج کل عام طور پر شراب نوشی، جوا کاری، فحاشی اور ناجائز لہولعب کے ذریعے عید کی خوشیاں منائی جارہی ہیں، کئی سال سے جوان لڑکے گاڑیوں پر سوار ہوکر کس حیاسوز طریقے سے خوشیاں منارہے ہیں، جس سے انسانیت شرما جاتی ہے، جوان لڑکے لڑکیاں بے حجابانہ نہروں میں جاکر نہاکر خوشیاں منارہی ہیں، تاہم عیدگاہ اب تک ان کی دست درازی سے محفوظ ہے، اگر عیدگاہ بھی ان کے حوالے کردی جائے تو نہ معلوم کیا قیامت آجائے گی، یقینا عید کیا ہوگی ہندوؤں کی دیوالی بن جائے گی، لہذا قطع نظر دیگر دلائل سے صرف اس فتنہ کے پیش نظر سدًا للذرائع یہ کام ممانعت کے تحت آئے گا:

اندکے پیش باتوگفتم غم دل ترسیدم+ کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

بھائی ڈاکٹر صاحب برائے کرم اس خط کو ممدوحی جناب محدث مولانا عبد اللطیف صاحب سے پڑھوا کر سمجھ لیں، اس کے بعد شیخ الحدیث منگنماوی کے پاس بھیج دیں، آپ کے نام اس لئے لکھا گیا کہ ترسیل میں سہولت ہو۔ والسلام ۔

محمد عبد السبحان/

اودنگ مدرسہ۔ ۲۴/ذی قعدہ ۱۴۱۱ھ/۱۹۹۱ء

حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ اپنے مسلک ومشرب پر بڑے پکے تھے، آپ سرزمین ارکان میں

حنفی پھر دیوبندی علماء کے سرخیل تھے، فقہ حنفی میں آپ کو عبور حاصل تھا، ان باتوں پر مشتمل درج ذیل اقتباسات قارئین ملاحظہ کر سکتے ہیں:

''صحاح ستہ کے مصنفین چوں کہ اکثر شافعی المسلک ہیں، اس وجہ سے مسائل فقہیہ میں بعض احادیث صحاح حنفی مسلک کے مخالف ہوتی ہیں، اس وجہ سے بعض اوقات حنفی مسلک کے اثبات میں بڑی دشواری پیش آتی ہے، آپ صحاح ستہ ہی میں سے ایسی حدیثیں نکال کر بتلاتے تھے، جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حنفی مسلک منشائے حدیث کے عین مطابق ہے، اور بعض اوقات حنفی مسلک کی مخالف احادیث کا ایسا جواب دیتے جو خوب دل نشین ہوجاتے تھے، اور حضرت والا فرماتے کہ حضرت مولانا (یعنی حضرت مدنی) ایسا فرماتے تھے، اسی طرح حدیثوں کی لمبی تقریر کے بعد جب خلاصہ تقریر بیان فرماتے تو کہتے کہ حضرت مولانا مدنی اس طرح بیان فرماتے ہیں، اکثر باتوں میں حضرت مولانا کا حوالہ دیتے اس سے مراد مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ ہوتے ہیں۔ اور ''حضرت والاؒ ترمذی میں خاص طور پر بڑی مسبوط تقریر فرماتے تھے، مسئلے کے ہر ہر گوشے کو واضح کر دیتے تھے، اسناد ومتون پر سیر حاصل گفتگو فرماتے تھے، ایک ایک لفظ کی تشریح کرتے تھے اور مسلک امام اعظمؒ کو ساتھ ہی ساتھ ثابت کرتے جاتے تھے، بعض اہم مسائل میں تنقیحات بھی قائم فرماتے تھے، اور ایک ایک تنقیح پر خوب دل کھول کر تقریر فرماتے تھے، بالآخر مسلک امام اعظمؒ کو بڑی خوبی کے ساتھ راجح کر دیتے تھے ، بسا اوقات ایک ایک حدیث کئی کئی دن میں حل فرمائی ہے، اور مسلک امام اعظم کو خاص طور پر روز روشن کی طرح ظاہر کر دیا ہے، طلباء چاروں طرف سے شبہات واعتراضات وارد کر رہے ہیں، اگر چہ ان میں بعض اعتراضات مہمل بھی ہوتے ہیں لیکن بہت سے وزنی بھی ہوتے ہیں، حضرت رحمۃ اللہ علیہ خندہ پیشانی کے ساتھ جوابات دے رہے ہیں اور مطمئن کر رہے ہیں، کبھی نہیں دیکھا کہ اعتراضات کی بوچھاڑ سے منقبض یا مکدر ہوئے ہوں''۔

اور:

''حضرت محدث ارکان کو اکابرین دیوبند سے بے حد عشق تھا، اس لئے حضرت اپنی پوری زندگی میں حضرت مدنی کا ذکر کرتے ہوئے اس طرح فرماتے تھے کہ ''مولانا نے یہ کہا، مولانا نے یہ کہا'' مولانا کے ذکر سے رطب اللسان تھے، حضرت محدث صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت مدنی کے ساتھ والہانہ محبت وعقیدت تھی، اپنے نقوش حیات میں لکھا کہ'' ۱۹۵۱ع /۱۳۷۱ھ میں پردیس (ہند) کا رخ کیا، تمام اساتذہ مظاہری ہونے کے علی الرغم دیوبند جانے کا شوق اس لئے پیدا ہوا کہ بچپن سے فطری طور پر حضرت شیخ الاسلام مدنیؒ کے ساتھ محبت پیدا ہوچکی تھی، دعا کرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ ان سے استفادے کی توفیق عطا فرمائے، اللہ نے دعا قبول فرمائی، وہاں جا کر مختلف کتابیں پڑھ کر آخر میں حضرت شیخ الاسلام مدنی سے بخاری شریف پڑھنے کا جو داعیہ بچپن سے قلب میں جوش مار رہا تھا وہ پورا ہوا، حضرت مدنی سے بخاری شریف مکمل کی قرأت وسماعت اور جملہ علوم وفنون کی اجازت اور حضرت ہی کے دست حق پر بیعت طریق نصیب ہوئی۔ **الحمدللہ والمنۃ**'۔

مولانا بڑے فقیہ النفس عالم دین تھے، جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ فقہی معاملہ اور اصدار فتوی کے حوالے سے آپ کا بعض عمل رخصت پر نہیں بلکہ عزیمت پر رہا، اس حوالے سے انگنت شہادتیں سامنے آئیں، ان میں سے ایک شہادت مولانا ابوالفیاض دامن کھالوی کی تحریر میں ملاحظہ کیجئے۔

''فقہی علوم میں مولانا اپنے علاقے کے مرجع خلق تھے، تجربے اور مہارت کے لحاظ سے جو امتیازی شان مولانا کو حاصل تھی اس کی افادیت بھی عام تھی، ایک بلند پایہ عالم کی شہرت میں جتنے عناصر ملے ہوتے ہیں، اس میں فقہی معلومات اہم عنصر کی حیثیت سے شامل تھیں، بحث وتجربہ میں حکمت ودانش مندی کے ساتھ سلیقہ اپنانے کا تجربہ تھا حنفی مسلک کی عام کتابوں میں موجود مسائل کے احاطہ واستحضار میں کمال ذہنیت کی علامت تھی، ماشاء اللہ اس کے علاوہ تمام کاروبار زندگی میں نت نئے مسائل اور پیش آنے والے خطرات میں عام وخاص کی نظریں مولانا کی طرف

دوڑتی تھیں،مولانا کی زندگی میں ہزاروں واقعات ہوں گے ۔

زندگی کی آخری دہائیوں میں ایک واقعہ پیش آیا،جس کا ذکر یہاں مناسب ہوگا، کیوں کہ اس میں درحقیقت در پردہ باطل ذہنیت کا فرماتھی،شازش ایسی پھلتی پھولتی کامیاب ہوتی ہے،مولانا نے ایسی درپیش سازش کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا،اللہ تعالیٰ جہاد کا رتبہ عطا کرے،اس کی تفصیل یوں ہے کہ کسی تہوار میں ایک اعلی افسر موجود تھا ،ملکی پرچم کی تعظیم میں موجود تمام حاضرین کو سر جھکانا ضروری ہوتا ہے بعض غیور با ضمیر مسلم اساتذہ اسکول نے عملاً اس جیسی خلاف شریعت تعظیم سے انکار کر دیا،یعنی سرنہیں جھکایا،موجود اعلی افسر نے دیکھا،اساتذہ کو اس کی سزا بھگتنی پڑی اور نوکری سے ہاتھ دھونا پڑا،جو تاریخ کا واقعی ایک درخشاں باب ثابت ہوا،باری تعالیٰ اجر عطافرماتے ، اب یہ سوال کے طور پر درپیش ہوا کہ آیا تعظیم میں سر جھکانا شرعًا جائز ہے یا نہیں ؟ بعض علماء نے جھکانے کی حد مقرر کرنے کی کوشش کی جو سجدہ ورکوع تک نہ پہنچتا ہو،حضرت شیخ الحدیث نے اپنی باریک زاویۂ نگاہ سے مطلقًا عدم جواز کا فتوی صادر فرمایا،حدود وقیود اور اضطراری حالات کے لحاظ سے یک سرانکار کر دیا،مزید یوں فرمایا کہ جھکاؤ جیسی تعظیم اسلام میں شانِ عبادت سے ہے، اس کے لائق صرف اور صرف خالق ارض وسماء سے ہے،نہ فنا ہونے والی چیزیں ہیں،اہمیت کا حامل ہے کہ سر جھکانا اسی جیسی محفل میں تشبہ اور اعمال وثنیہ سے ہے جو سراسر باطل عقائد اور کفر ہے،اور ”**من تشبہ بقوم فھو منھم** “الحدیث میں شامل ہوگا گو اضطراری حالت میں شرعًا جائز ہے لیکن اس کی سلبی جوانب خطرات کا حامل ہوں تو شریعت میں اس کا تدارک اور بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے،اس کا جواز زمان ومکان اور شخصیات کی اہمیت اپنے اندر ملحوظ رکھا ہے،یہ ایسا وقت ہے اور ایسا مکان ہے،جس میں اضطراری اپنی حد تک قائم نہیں رہے گی،اگلی نسل کے لئے تقلید واتباع ہی متصور ہوگا “۔

حضرت غالبًا پوری زندگی میں دومرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینۃ الرسول سے سرفراز ہوئے ،

پہلی مرتبہ ۱۹۷۷ء میں اور دوسری مرتبہ ۲۰۰۵ء میں۔

مولانا سرزمین ارکان کے دور آخر میں بڑے جلیل القدر عالم دین،متقی ، پرہیزگار انسان تھے، بیک وقت مفسر ، محدث ، فقیہ غرض منقولات ومعقولات کے سنگم صاحب علم وبصیرت مجمع الکمالات تھے ،اور نصف صدی سے زیادہ درس وتدریس اور رشد وہدایت میں زندگی گزار بالآخر ۲۷ محرم الحرام ۱۴۳۳ھ / ۲۳ دسمبر ۲۰۱۱ء میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

حضرت کی گیارہ اولاد ہیں ، ان میں چھ بیٹے اور پانچ بیٹیاں ہیں ،لڑکوں میں تین عالم دین ہیں،صاحب زادہ حضرت مولانا عبدالرحمن صاحبؒ راقم کے قریبی دوستوں میں تھے،اللہ تعالی ان سب کی حیات دراز کرے،آمین۔

حضرت مولانا کی تدریسی خدمات کا گوشوارہ

عدد	مواقع وجائے خدمات	سن	سن
1	مدرسہ امدادالعلوم علی تانجو	1957	1958
2	جامع العلوم شقدار پارہ منگڈو	1958	1959
3	مدرسۃ مظاہر العلوم گھڑاخالی	1959	1960
4	مدرسہ اشاعت العلوم مولمین	1960	1961
5	مدرسۃ مظاہر العلوم گھڑاخالی	1962	1964
6	مدرسہ امدادالعلوم علی تانجو	1965	1968
7	مدرسہ دارالعلوم مرنگلوا	1968	1970
8	دارالعلوم میانجاپور منگڈو	1970	1974
9	مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ پارہ	1974	1989
10	مدرسہ اشرف العلوم ادونگ	1989	2009

مولانا مفتی سلطان احمد صاحب ریدویؒ منگڈوی:

مولانا سلطان احمد صاحب بن امام شریف کی پیدائش ۱۹۰۲ء میں شمالی منگڈو کے ریدہ نامی گاؤں میں ہوئی، بستی ریدہ کو جو بلی بازار اور سعد اللہ چر کے درمیان واقع ہے آپ کی ذات عالی صفات سے بڑا فخر حاصل ہے، آپ کی پیدائش کے حوالے سے بطور مبشرات حافظ مولانا محمد صدیق رقمطراز ہیں کہ:

''عامۃ الناس کو تو پتہ نہیں تھا کہ یہ لڑکا ایک دن مفتی اعظم ارکان کہلائے گا، لیکن اس کا اندازہ حضرت کی والدہ محترم کو تھا، کیوں کہ انہوں نے ولادت سے قبل بہت سے خواب اور مبشرات دیکھے تھے، اس لئے حضرت کو انتہائی ناز و نیاز سے پالا گیا تھا۔ مفتی صاحب کی والدہ کا بیان ہے کہ لڑکا پیٹ میں تھا، ایک بزرگ جبہ اور عمامہ میں ملبوس خواب میں آئے، اور مجھے شاباش دی اور کہا کہ اسے نجات دہندہ سمجھو، اسی طرح اور بھی بہت سے خواب نظر آئے، جن سے میرا دل مطمئن ہو گیا تھا کہ یہ کام کا آدمی ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا''۔

راقم سطور کو حضرت مولانا موصوف کے متعلق ''مفتی اعظم ارکان'' ہونے کا پتہ تو نہیں، یہ بھی معلوم نہیں کہ آیا اس قسم کا عظیم خطاب قوم نے دیا یا اور کسی شخص نے، یہ تو عیاں حقیقت ہے کہ سرکاری طور پر اس قسم کا خطاب تو کجا یہاں تو ایک بڑے عالم دین یا صرف عالم ہو کر جینا بھی دشوار تھا اور اب بھی ہے، پھر جہاں تک ''نجات دہندہ'' کا تعلق ہے وہ کس اعتبار سے تھا وہ بھی میرے سمجھ سے باہر ہے، تاہم یہ سچ ہے کہ آپ نے تعلیمی اور تدریسی میدان میں اپنے وطن میں نمایاں خدمات انجام دیں، اسی طرح بعض اعتبار سے آپ بڑے کام کے آدمی تھے۔

حضرت مفتی صاحب موصوف نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے کے مدارس میں حاصل کی، کچھ بڑے ہوئے تو اعلیٰ تعلیم کے لئے ہندوستان کی راہ لی، اور سیدھے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے حضرت مولانا حسین احمد مدنی، علامہ سید انور شاہ کشمیری، مولانا ابراہیم احمد بلیاوی، مولانا اصغر حسین دیوبندی، مولانا اعزاز علی وغیرہ سے خوب خوب استفادہ کیا، طالب علمی کے زمانے کے بعض خصائل و عادات کے متعلق حافظ محمد صدیق صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''مفتی صاحب کے رفقاء کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں دارالعلوم دیوبند میں برما کے چھ طالب علم ایسے تھے، جن کے نام سلطان احمد تھے، ہر ایک اپنے مخصوص اخلاق و اطوار کی حیثیت سے معروف تھا، ان میں مفتی صاحب کم گو، با اخلاق کی حیثیت سے مشہور تھے، اور اکثر فرماتے تھے کہ میرا ذہن کمزور ہے، اس لئے مجھے کھیل کود و دیگر لہو لعب سے دور رہنا چاہئے۔ مفتی صاحب کی محنت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ رات کو گلے میں رسی باندھ لیتے تھے، اور رسی کا دوسرا کنارا چھت کے ساتھ باندھا ہوتا تھا، تاکہ نیند نہ آنے پائے۔ مفتی صاحب کے اندر یہ خصوصیت نمایاں تھی کہ وہ جو کہتے تھے کر گزرتے تھے، گویا آیت ربانی ''یا ایھا الذین آمنو لم تقولون مالا تفعلون'' پر عمل پیرا تھے۔ اور امتحان ہال میں جب تشریف لے جاتے تو پورے وقت لکھتے تھے، گویا امتحان ہال سے نکلنے والا یہ آخری طالب علم ہوتا تھا، بڑے آرام سے لکھتے تھے''۔

جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا ذرا کند ذہن کے آدمی تھے، البتہ بڑے محنتی طالب علم تھے، اللہ تعالیٰ ان کی محنت میں برکت دی، اور خاصے کامیاب ہو کر وطن لوٹے تھے، اس حوالے سے حافظ محمد صدیق صاحب کہتے ہیں کہ:

''دوران تعلیم کسی نے مفتی صاحب سے پوچھا کہ غبی ہو، پڑھ کر کیا کروگے، مفتی صاحب نے جواب دیا کہ کم از کم اپنی اصلاح کر سکوں گا، اچھے برے کی تمیز تو آجائے گی، اور مغز کو چھلکے سے امتیاز کرنے کا سلیقہ تو آجائے گا''۔

حضرت موصوف کے استفادہ کے حوالے سے حافظ محمد صدیق صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

''ایک طرف مفتی صاحب علوم نبوت کی دولت حاصل کرنے میں مصروف تھے، تو دوسری طرف بین الاقوامی سیاست دانوں کے سیاسی افکار اور دنیائے کفر کی شاطرانہ چالوں کو بھی قریب سے دیکھ رہے تھے، تاج الہند مولانا ابوالکلام آزاد کی مضمون نگاری وزیر کی، قائد اعظم محمد علی جناح کی قائدانہ صلاحیت، مسٹر جواہر لال نہرو کی

عیاری اور مسٹر اونگ سائنگ کی مکاری مفتی صاحب کے سامنے تھی، جن سے مفتی صاحب نے بہت کچھ سیکھا''۔

ہمارے سادہ لوح سوانح نگار مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کے بیان کے مطابق آزاد کی زیرکی، جناح کی قائدانہ صلاحیت، نہرو کی عیاری، اور اونگ سان کی مکاری سے پتہ نہیں حضرت مولانا محمد سلطان صاحب نے کیا کچھ سیکھا تھا؟ اگر سیکھا تھا تو بڑا خوب اور داد دیئے جانے کے قابل، تاہم آزاد کی مضمون نگاری سے استفادے کا جہاں تک تعلق ہے، وہ تو ظاہر ہے کہ مولانا کی پوری زندگی قرطاس وقلم کی جھنجٹ سے پوری طرح پاک تھی، بھلا اونگ سان کی مکاری اونگ سان کے لئے مبارک ہو، ہمارے اس عظیم عالم دین کی پوری زندگی تو اخلاص وللّٰہیت، صفائے قلبی اور جلائے روحی سے عبارت ہے، انہوں نے اپنی پوری زندگی میں جس اخلاص و پاک نفسی کا مظاہرہ کیا وہ ہمارے سامنے سورج کی طرح عیاں ہے، اللہ تعالی حضرت موصوف کی مرقد مبارک پر رحمت کی برسات برسائے، اوران کے قلب وروح کو شانتی اور سکون مل جائے۔

محترم کرم فرما مولانا حافظ محمد صدیق صاحب حضرت مفتی صاحب کی طالب علمی کے زمانے کے ایک بہت اہم اور نہایت حساس سیاسی کردار کا تذکرہ حضرت مولانا پیر مظفر احمد صاحب مینگزدی سے روایت کرتے ہیں کہ:

''جولائی ر ۱۹۴۷ء میں برمیوں کا ایک وفد مسٹر اونگ سائنگ کی قیادت میں برطانیہ گیا تھا۔۔۔آزادئ برما کے سلسلے میں برطانیہ کی عائد کردہ چھ شرائط پوری نہیں کی گئیں، اس لئے مذاکرات ناکام ہوئے، اور مسٹر اونگ سائنگ کف افسوس ملتا ہوا شاہی محل سے نکل گیا، اس کے بعد انجمن خدام الاسلام اور مسٹر اونگ سائنگ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا، جس کے تحت اراکین خدام الاسلام نے مسٹر اونگ سائنگ کی تائید اور مدد کی، اسی تائید کی وجہ سے مسٹر اونگ سائنگ کو آزادی کا پروانہ مل گیا، جس کی تفصیل راقم الحروف کی کتاب ''اشک مسلمانانِ ارکان برما'' ص ۶۰ پر ہے، انجمن خدام الاسلام کے اس وفد میں مفتی صاحب بھی شریک تھے، بلکہ اس

میں اہم کردار مفتی صاحب کا ہی تھا۔ یہ واقعہ راقم الحروف کو مولانا پیر مظفر احمد صاحب مینگزدی بن جناب حاجی فضل الرحمن فارغ التحصیل۔۔۔دارالعلوم دیوبند نے مولوی فارہ مکہ المکرمہ میں ایک انٹرویو کے دوران ۱۹۹۸ء میں بیان کیا۔ اس میں سوال یہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب تو ۱۹۴۴ء میں فارغ التحصیل ہوکر برما واپس آگئے تھے، تو مفتی صاحب ۱۹۴۷ء میں ہونے والے مذکورہ مذاکرات میں کیسے شریک ہوئے؟ اس سوال کا صحیح جواب میرے پاس نہیں ہے، ممکن ہے کہ مفتی صاحب دوبارہ تشریف لے گئے ہوں، یا فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ فنونات کے لئے ٹھہر گئے ہوں، **واللہ اعلم حقیقۃ الحال و لایخفی علیہ ذرۃ مثقال**''۔

یہ کہیں مولف نے الف لیلۃ ولیلہ کی داستان سرائی تو نہیں ہے؟ صرف زبانی جمع وخرچ کے لئے بڑے انسان ہونے کی ضرورت نہیں، یہ کام ہرکس وناکس کے لئے بہت آسان ہے لیکن اب مصیبت یہ آن پڑی کہ اب ہم مذکورہ واقعہ کی تصدیق کریں یا تکذیب، تصدیق کرینگے تو زمانہ کہنے لگے گا کہ آیا تمہاری عقل پر کیڑے پڑ گئے ہیں یا دماغ کا توازن بگڑ گیا ہے؟ اور تکذیب کرینگے تو ہم اپنے شیخ و قلندر پر حرف شکایت لانے کے ملزم ٹھہریں گے، کیوں کہ اس پورے بیان میں یکے بعد دیگرے چند سوالات خودبخود ابھر آتے ہیں، مثال کے طور پر:

(۱) اونگ سان کی قیادت میں بیان کے مطابق ایک وفد برطانیہ گیا، مذاکرات ہوئے لندن میں، پھر اونگ سان کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے طلبہ کا معاہدہ کہاں، کیسا، کس وقت تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مہابھارت کے حدود کے اندر کوئی دوسرا برطانیہ بھی تھا، آیا اطراف دیوبند میں لندن نامی کسی گمنام مقام پر اونگ سان اور خدام الاسلام کے وفد (جس کی قیادت حضرت مولانا سلطان صاحب کررہے تھے) کے درمیان مذاکرات اور معاہدہ ہوا ہو، ورنہ تطبیق وجمع کی راہ تو نکالئے نا!

(۲) بیان کے مطابق اونگ سان اور خدام الاسلام نامی تنظیم کے درمیان معاہدہ ہوا تو خدام الاسلام اونگ سان کی تائید کی، ویسے اونگ سان پر عائد کردہ چھ شرائط پوری ہوئیں تو اس کے نتیجے میں برما کو آزادی کا پروانہ مل گیا، ظاہر ہے کہ بڑی اہمیت کی حامل تنظیم اور بڑے بڑے پتے اور آن بان کے قائدین

تھے۔ گویا ایسا ہوا کہ برما کو صرف اونگ سان نے نہیں بلکہ خدام الاسلام نامی تنظیم جس کے سرغنہ حضرت مولانا سلطان صاحب تھے نے ''نجات'' دلائی ہو، اتنی اہمیت کی حامل تنظیم اور اس کے قائدین سے برما کے باشندے نہ سہی کم سے کم ارکان کے وہ دل جلے حضرات کو جنہیں سیاست و قیادت، قوم وملت کے مسائل اور مشکلات سے دلچسپی ہے، واقفیت کی بڑی ضرورت تھی اور اب بھی ہے، افسوس ہے کہ ہم اس تنظیم سے واقف ہیں نہ اس کی قیادت کی قائدانہ صلاحیت و کردار سے متعارف، نہ جانے حضرت مفتی سلطان احمد صاحب کے ساتھ مذکورہ مذاکرات میں کون کون شریک و سہیم تھے، نہ جانے اتنی اہمیت کی حامل تنظیم کے ساتھ اونگ سان کا معاہدہ کتنے دفعات پر مبنی تھا، نہ جانے اب وہ دستاویز جس پر قوم کی تقدیر نوشتہ تھی کس لائبری، کس میوزم یا کس خیالی جزیرہ کی زینت بنی ہوئی ہے؟

(۳) اتنے اہم اور حساس مذاکرات، اتنا نازک اور اہمیت کا حامل معاہدہ، جس کی بنیاد پر مولانا صدیق صاحب کے بیان کے مطابق برما کو آزادی نصیب ہوئی ہو، آخر طلبہ کے ساتھ کیوں؟ حافظ صاحب کے الفاظ میں جن کے سرخیل کا ذہن کمزور، زندگی کھیل کود لہولعب سے دور، جنھی اپنی غباوت کا اقرار، اپنی عدیم الفرصتی کی ایسی شکایت کہ ''گلے میں رسی باندھ لیتے تھے، تاکہ نیند نہ آجائے'' معاہدہ، مذاکرات، سیادت وسیاست سے کیا لینا دینا؟ آیا ایسے اہم اور نازک مذاکرات کے دوران سرزمین ارکان کے تمام سیاسی لیڈران حضرات اصحاب کہف کی طرح کسی نا مانوس غار کے نذر تو نہیں ہو چکے تھے؟ پھر اونگ سان کی وہ کونسی مجبوری تھی کہ طلبہ دار العلوم (جو اپنے وطن اور اپنی سرزمین سے ہزار میل دور قال اللہ قال الرسول کی تعلیم میں مگن تھے) سے معاہدہ کرنا پڑا تھا؟، ظاہر ہے کہ اونگ سان مکار تھا، تو اس کی ''مکاری'' وہ اور اس کی قوم کے لئے مبارک، ہم اپنے روشن ضمیر طلبائے دار العلوم دیوبند پر حرف غلط آنے نہیں دے سکتے، دار العلوم دیوبند جیسا علمی وفکری ادارہ، جہاں کے بانیان، ارباب بست وکشاد، علماء وفضلاء نہ صرف بلکہ طلباء تک کی فراست وبصیرت ہمارے لئے قابل فخر سرمایہ ہے، کیا یہاں کے ساختہ پرداختہ برمی طلباء کی عقل میں کیڑے یا گن لگ گیا تھا کہ وہ ایسے نازک، حساس اور پرکٹھن سیاسی مراحل

میں ایک پوری قوم کے مستقل اور تقدیر سے بچوں کا کھیل کھیل سکتے تھے؟، برما کی آزادی کے حوالے سے ان طلبا کے کردار وعمل کو سراہنے کی شکل میں مذکورہ بیان کو ہم ان کی عزت نوازی ہرگز نہیں کہہ سکتے، بلکہ ان کی آبرو کا جنازہ نکالنا ضرور کہہ سکتے ہیں، جناب حافظ محمد صدیق صاحب ! خاکم بدہن اور گستاخی معاف۔

(۴) ہم کیا، پوری دنیا کے سامنے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ ۱۹۴۷ء میں پیلونگ کے مقام پر برما کی آزادی کے حوالے سے مذاکرات اور تاریخی معاہدہ (جس میں ارکانی مسلمانوں کو دانستہ طور پر نمائندگی کا حق نہیں دیا گیا تھا) کے نتیجے میں برما کو آزادی ملی، جبکہ یہاں ہمارے مورخ صاحب رٹ لگا بیٹھے ہیں کہ ''خدام الاسلام کی تائید ومدد کی وجہ سے مسٹر اونگ سان کو آزادی کا پروانہ مل گیا تھا'' ایسے بیانات پر جتنے بھی روئے رلائے جائے تو بھی کم ہے۔

(۵) محترم مورخ حافظ محمد صدیق صاحب کے مطابق ظاہر ہے کہ معاہدہ اور مذاکرات برما کی آزادی کے حوالے سے تھے، آج تک ساٹھ ستر سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا کہ اس معاہدہ اور مذاکرات کے حوالے سے ساری باتیں پردۂ راز میں رہ گئیں، کیوں اور کیسے؟ اب حضرت شیخ نے مکہ المکرمہ میں انٹرویو کے دوران اپنی عمر کے آخری سرا میں آکر اس راز کو فاش کردیا ہے۔ اگرچہ مورخ صاحب نے اس شبہ کا اظہار کیا کہ مفتی صاحب ۱۹۴۴ میں دار العلوم دیوبند سے فارغ ہو چکے تھے، اس معاہدہ اور مذاکرات میں شریک کیسے ہوئے؟ (یعنی آپ فارغ ہوکر وطن پہنچ چکے تھے، مذاکرات میں شریک کیسے ہو سکے) حضرت شیخ کے سامنے نہ سہی بعد کے فقرے میں اظہار کردیا ہے، لیکن ضرورت تھی کہ یہ شبہ حضرت شیخ کے سامنے برملا اظہار کردیتے، تبھی شاید یہ بن سکتا کہ حضرت شیخ مورخ کے شبہ کا فورا ازالہ کردیتے، یا اور کوئی راز کی بات بتادیتے، اس کے بجائے مورخ صاحب نے ''دوبارہ تشریف لے گئے ہوں، یا فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصہ فنونات کے لئے ٹھہر گئے ہوں'' جیسے الفاظ میں جو بیان کیا ہے، اس سے ان کا کیا مدعا ہے؟ پھر بھی کیا یہ سوال اپنی جگہ جوں کا توں نہیں رہ جاتا کہ حضرت شیخ نے اتنی اہم بات اتنے عرصہ تک پردۂ راز میں کیوں رکھ دی؟ حضرت مفتی صاحب یا اس معاہدہ و مذاکرات میں شریک وسہیم کسی نے قلمی طور پر نہ سہی زبانی طور پر کبھی کچھ نہ کہا تو کیا ہم انہیں مرفوع القلم

کہہ سکتے ہیں؟۔حضرت شیخ تو سیاسیات کی گلی کوچوں سے واقف انسان تھے،ان کی زبان مبارک پر اتنی مدت تک تالے کیوں اور کیسے پڑے ہوئے تھے؟ حضرت شیخ کے لئے پوری قوم کے سامنے نہ بن سکی تو بھی زعماء وقائدین قوم کے سامنے بیان کر دینے میں کونسی مشکلات کی دیوار کھڑی تھی؟ حضرت شیخ تو ایک صاحب بصیرت عالم دین، صاحب فراست شیخ طریقت تھے، اب ہم حضرت شیخ کی یاد داشت کے متعلق یہ تصور کیسے کر سکتے ہیں کہ آپ کو یہ بات تقریبا ساٹھ ستر سال گزرنے کے بعد اچانک سرزمین مقدس میں یاد آگئی ہو، اور یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے کہ آپ کی پوری زندگی جذب و مستی کی حالات میں گزر گئی ہو اور سیاست کی جھنجھٹ سے ٹکڑ لینے کا ایک بار بھی موقع نہیں مل سکا ہو، جبکہ حضرت شیخ تو حضرت مولانا مدنی کے تلمیذ اور ان کے مجاز بیعت تھے، حضرت مدنی اور ان کے خلفاء کے احوال سے کون اہل نظر واقف نہیں، پھر بھی حضرت شیخ پر جذب کی حالت طاری ہوگئی تو سوال آتا ہے کہ پورے ساٹھ ستر سالوں تک؟ ان باتوں کا جواب کون دے سکتا ہے۔ تاہم حضرت شیخؒ کے متعلق ہمارے قارئین میرے اس تبصرے پر برہم و برگشتہ ہوں تو خاکم بدہن اور گستاخی معاف!

بات تھی مفتی صاحب کی تعلیم کے حوالے سے، بہر حال آپ نے دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۴۴ء میں فراغت حاصل کر کے سیدھے وطن واپس آگئے، آپ نے دارالعلوم دیوبند کے طرز پر ایک ادارہ کی بنیاد میانجانفور میں رکھی، اس ادارہ کی تاسیس میں آپ کے ساتھ مولانا عبدالحکیم صاحب، مولانا عبدالودود صاحب اور مولانا محمود الحسن صاحب بھی شریک وسہیم تھے، روایت کے مطابق حضرت مفتی صاحب نے اس ادارہ کی تاسیس اور تعمیر و ترقی کے لئے حضرت مولانا عبدالجبار المعروف بہ فقیر مولوی صاحب کو مرشد مانا تھا، ہر کام میں ان کے اشارے کو اشارۂ غیبی سمجھتے رہے تھے، الحاصل اس ادارہ کی تعمیر ترقی ملت اسلامیہ ارکان کے لئے کسی روشن چراغ سے کم نہ تھی، اس ادارہ سے بے شمار شمعیں روشن ہوئیں اور نہ صرف ارکان بلکہ برما کے علاوہ ہندو پاک میں بھی اس شمع کی کرنیں منتشر ہو کر اپنی روشنی اور ضیاپاشی سے امت کو راستہ دکھایا، اور اب بھی ماشاء اللہ اس درسگاہ کی برکات ملک کے طول وعرض میں پھیلی دکھائی دے رہی ہیں، مفتی صاحب اس دنیا سے چلے گئے، مگر ان کا بنا کردہ ادارہ اب بھی مصروف عمل ہے، اللہ تعالی اس ادارہ کو دوام بخشے اور مفتی صاحب کی روح کو ہر وقت ٹھنڈک پہنچے۔

عام طور پر تو دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور سے فارغ ہونے والے طلبہ وہیں کسی شیخ سے بیعت ہو کر آتے ہیں۔ مگر مفتی صاحب کے متعلق بیعت کی کوئی روایت نہیں ملتی، البتہ حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب نے ''تذکرۂ عزیز'' میں ایک واقعہ نقل کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مفتی صاحب ارکان میں پہنچنے کے بہت ہی مدت بعد مولانا میر احمد صاحب کی معیت میں حضرت مولانا مفتی عزیز الحق صاحب سے بیعت کی تھی۔

حافظ محمد صدیق صاحب نے آپ کے چند معاصرین کا تذکرہ کیا ہے، جو مندرجۂ ذیل ہیں=

(۱) مولانا مفتی عبدالحمید صاحب شجاع فاروی فاضل دارالعلوم دیوبند۔

(۲) حضرت مولانا میر احمد مبارک معروف بہ ناظم صاحب، سابق استاذ الحدیث میانجانفور۔

(۳) مولانا مفتی امیر حسین صاحب قادر بیلوی فاضل دارالعلوم دیوبند۔

(۴) مولانا عبدالسلام مرنگلوی، فاضل دارالعلوم ڈابھیل گجرات، ہند۔

(۵) مولانا عبدالمتین صاحب فاضل مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور، یوپی، انڈیا۔

بلاشبہ حضرت مفتی صاحب کے معاصرین میں مذکورہ جن حضرات علمائے عظام کے نام لئے گئے ہیں، سب کے سب اپنے وقت میں عظیم المرتبت ہستیاں تھے۔ ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق ملک وملت قوم ووطن عزیز کی خدمات کیں، مگر ان تمام ہستیوں میں حضرت مفتی صاحب کی شخصیت دار العلوم میاں جانفور کی خدمات کی وجہ سے نمایاں نظر آتی ہیں، انہوں نے اس درسگاہ میں بیٹھے علم وفن کی دنیا میں جو ضیاپاشی کی، ان کے معاصرین میں سے کسی دوسرے کے لئے شاید ممکن ہو سکا ہو، علاوہ ازیں ان کی شخصیت اس حیثیت سے بھی منفرد نظر آتی ہے کہ انہوں نے قوم کے خلاف آئے دن ہونے والے بعض مظالم کا بے جگری سے مقابلہ کیا تھا، اس حوالے سے انہوں نے رخصت کے بجائے ہمیشہ عزیمت پر عمل کیا تھا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بعض نامور تلامذہ کے نام درج کر دیے جائیں، تا کہ ناظرین کرام کو اندازہ ہو کہ انہوں نے اس درسگاہ میں بیٹھے دین کی کتنی شمعیں روشن کی تھیں:

(۱) مولانا دین محمد شہید فرندگی رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) مولانا محمد حنیف راغبؔ ارکانی ثم فرندگی۔

(۳) مولانا سید عالم صاحب سابق مہتمم دارالعلوم میانجانفور مرحوم۔

(۴) مولانا سید عالم صاحب بن تاج الملوک نینو باساوی فاضل مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری۔

(۵) مولانا شمس العالم صاحب، مہتمم جامعہ اسلامیہ برمی کالونی کراچی، پاکستان۔

(۶) مولانا جعفر احمد صاحب استاد جامعہ اسلامیہ برمی کالونی، کراچی، پاکستان۔

(۷) مولانا رحمۃ اللہ صاحب مدیر جامعہ اشرفیہ حقانیہ برمی کالونی، کراچی، پاکستان۔

(۸) مولانا نور احمد صاحب سابق نائب مہتمم دارالعلوم میانجانفور، بلی بازار، ارکان۔

(۹) مولانا مسلم صاحب استاد مدرسہ مدینۃ العلوم، نارتھ ناظم آباد، کراچی، پاکستان۔

(۱۰) مولانا کمال الدین قاسمی، صدرالمدرسین جامعہ اشرفیہ حقانیہ لانڈھی، کراچی، پاکستان۔

مفتی صاحب رخصت پر نہیں ہمیشہ عزیمت پر عمل کرتے تھے، ان کی زندگی میں بہت سے واقعات ایسے نظر آتے ہیں کہ جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک مرد مجاہد کی طرح میدان میں دشمن سے مقابلہ کرنے سے کبھی نہیں تھکتے تھے، اس باب کا ایک واقعہ حافظ محمد صدیق نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے، تو لیجئے تفصیل حاضر خدمت ہے:

''دسمبر ۱۹۹۳ء میں حکومت برما کی طرف سے ایک سمن (حکم نامہ) جاری ہوا، جس کا خلاصہ یہ تھا کہ منگڈو کے آس پاس کے علاقوں میں سے بیس بیس خوبصورت غیر شادی شدہ کنواری دوشیزائیں میرکھالی فوجی چھاؤنی میں پہنچادی جائیں، ہر ایک لڑکی کو اس کا باپ یا محرم لے کر آئے۔ ان لڑکیوں کو چھ ماہ تک اس چھاؤنی میں رہنا ہوگا اور کسی کو بھی ان سے ملنے کی اجازت نہ ہوگی، نہ یہ لڑکیاں باہر جاسکیں گی، اس مدت میں انہیں صنعت وحرفت اور دستکاری وغیرہ ہنر سکھائے جائیں گے۔ نیز بیس دسمبر بروز پیر تک یہ لڑکیاں مع والد چھاؤنی میں پہنچ جائیں، خلاف ورزی پر سخت ترین کاروائی کی جائے گی۔ اس حکم نامہ میں مطلوبہ تمام لڑکیوں کے نام درج تھے، جس میں مولویوں کی لڑکیوں کے نام سرفہرست تھے، جب والدین لڑکیوں کو لے جانے کے بجائے فوجی چھاؤنی میں خود پہنچ گئے تو ان پر ظلم وستم کے جو پہاڑ

ڈھائے گئے وہ وہی جانتے ہیں، چشم فلک نے آج تک اس قسم کی پٹائی نہ دیکھی ہوگی، مسولینی، ہٹلر، چنگیز خان اور ہلاکو ہان کو بھی اس کی حیا سوز سخت کاروائی کی نہ سوجھی ہوگی۔ یوں تو اس چکی میں بہت سے لوگ پیسے گئے، خاص کر جن علماء کو سخت سزا ہوئی اور داڑھی منڈوادی گئی ان کے نام یہ ہیں:

مفتی اعظم مولانا محمد سلطان صاحب، فاضل دارالعلوم دیوبند۔

تبلیغی امیر جناب نبیہ حسین صاحب۔

مولانا جعفر علی صاحب۔

مولوی ظفر احمد صاحب۔

مولوی ابوالحسن صاحب۔

مولانا نور احمد صاحب۔

مولانا ضیاء الحکیم صاحب داماد مولانا مفتی میر احمد صاحب۔

علاوہ ازیں مولانا محمد اسلام صاحب پر جو قیامت بپا ہوئی اس کی تفصیل صاحب البیت مولانا ضیاء الحکیم صاحب کی زبانی ماہنامہ ''الرباط'' جمادی الاولی ۱۴۱۵ھ مطابق نومبر ۱۹۹۴ء میں طبع ہوچکی ہے، بالجملہ جن فوجیوں نے مفتی اعظم ارکان کو زدوکوب کیا، داڑھی کاٹی، ننگا کیا، مادرزاد حالات میں پٹائی کی اور دیگر حیاء سوز ایسے مظالم کئے جن کے نام لینے سے انسانی سر شرم سے جھک جاتا ہے، انہیں فوجیوں نے علاقے کے بہت سے دیگر علماء کو ان مظالم پر مطلع کیا، اور مشاہدہ بھی کرایا، تاکہ (ان کے مطابق) عبرت حاصل ہو، جب دیگر علماء نے مفتی اعظم ارکان کی ناقابل بیان حالات دیکھے تو انہوں نے ایک فتوی جاری کیا، جس میں مکتوب تھا کہ مفتی اعظم ارکان چونکہ کبرسنی سے گزر رہے ہیں، اس لئے ان کا دماغی توازن درست نہیں ہے، وہ پاگل ہیں، ان کا رقم کردہ فتوی ٹھیک نہیں ہے، فلہٰذا ان کے جاری کردہ فتوے پر انہیں زدوکوب کا نشانہ بنانا ناروا سلوک ہے۔ مفتی اعظم ارکان کا فتوی یہ تھا

کہ پردہ ضروری ہے، مذکورہ طریقہ کے مطابق لڑکیوں کو بلا محرم وہاں چھوڑ دینا ناجائز ہے۔جن علمائے کرام نے مفتی اعظم ارکان کے فتوی کو غلط اور مفتی صاحب کو پاگل کہا، ان کا مقصود مفتی صاحب کو بچانا تھا، کیونکہ مفتی صاحب پر بے تحاشا ظلم ہورہا تھا، بال کٹوادئے گئے تھے، داڑھی منڈوادی گئی تھی، اور انہیں کال کوٹھری میں مادرزاد حالات میں رکھا گیا تھا۔اس کے بعد مفتی صاحب نے علمائے کرام کو بلاکر فرمایا کہ ۹۲ سال کی طویل عمر عیش وعشرت میں گزر گئی ہے، جب امتحان کا موقع آیا اور آزمائش کی گھڑی آپہنچی، توتم مجھے پاگل قرار دیتے ہو، واہ! شاباش اس بوڑھے مفتی کی استقامت اور عزیمت پر کہ جان جاسکتی ہے لیکن رخصت پر عمل نہیں ہوسکتا اور نہ دامن سنت چھوڑ سکتا''۔

شوال/۱۴۲۰ھ کے اواخر میں حضرت مولانا علاج کے سلسلے میں بنگلہ دیش تشریف لائے تھے دریں حالیکہ راقم سطور ''دارالانصار الخیریہ'' میں مدرس تھا (دارالانصار اس وقت حوالی شہر چاٹگام میں تھا) غالبا دار کے مدیر محترم حضرت مفتی مولانا سعید عالم سید حسین نے آپ کو اس درسگاہ میں آنے کی دعوت دی تھی، کہ آپ تشریف لائے تھے، آپ کی تشریف آوری پر ایک مختصر سا جلسہ کیا گیا تھا، آپ نے طلباء اور مدرسین کے سامنے چند کلمات بیان کئے، سکت بالکل نہیں تھی، آواز پست ہوچکی تھی، پھر بھی میں نے ان کے کلمات سے جتنا اخذ کیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

''علماء اور طلباء کو بتانا چاہتا ہوں کہ حصول علم اسلام میں فرض ہے، اگر علمائے دین علم سے دور رہیں گے تو یہ میدان خالی رہ جائے گا، دین کے کام میں اخلاص وللّٰہیت ہے تو اللہ تعالی کی برکت شامل رہے گی''۔

بعد ازاں علاج کے بعد وطن تشریف لے گئے، اور ۲۷/ذی الحجہ ۱۴۲۰ھ/۳/اپریل/۲۰۰۰ء میں انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبداللطیف صاحب کھُر بیلیؒ، منگڈوی:

حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کی ولادت ۱۹۰۷ء میں سرزمین ارکان کے قدیم دارالحکومت پتھری قلعہ میں ہوئی، جہاں تک پتہ چلاہ حضرت کی نشونما اور ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی تھی، اعلی دینی تعلیم کے لئے آپ نے ہندوستان کا سفر کیا، اور دہلی کی معروف درس گاہ مدرسہ امینیہ میں جاداخلہ لیا، روایت کے مطابق آپ نے اس درس گاہ میں ۱۹۳۱ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک تعلیم حاصل کی، اور موخر الذکر سن میں آپ نے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ وطن واپس آئے اور ۱۹۳۵ء سے لے کر ۱۹۴۲ء تک اپنے وطن میں دین کی مختلف خدمات انجام دیں، پھر ۱۹۴۲ء کے معرکہ کرب وبلا کے دوران آپ کسی طرح جان بچا کر بوسیدنگ کے معروف علاقہ سیوفارہ پہنچے، پھر وہیں سے کواربیل، اور بعد میں کھُر بیل میں مستقل سکونت اختیار کی، ان تمام حالات کے متعلق مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

''سرزمین ارکان کی مایۂ ناز ہستیوں اور مسلم بزرگوں میں مولانا عبداللطیف صاحب کھُر بیلوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں، پیر صاحب کے آباء واجداد پتھری قلعہ (روہانگ) کے ہیں، پیر صاحب کی پیدائش بھی وہیں ۱۹۰۷ء میں ہوئی، ۱۹۴۲ء کے قتال مگھ ومسلم (مگھ کاٹاکاٹی) میں یہ حضرات ہجرت کرکے سیو پارہ بوسیدنگ آئے، پھر وہیں سے کواربیل، پھر کھُر بیل آگئے، پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی، پھر ہندوستان تشریف لے گئے، ہندوستان کی مشہور معروف درس گاہ جامعہ امینیہ دہلی (کشمیری گھٹ) میں لگ بھگ ۱۹۳۱ء میں داخل ہوئے، اور وہیں سے لگ بھگ ۱۳۳۵ھ میں فراغت حاصل کی''۔

فراغت کے بعد پیر صاحب ارکان تشریف لائے اور درس وتدریس میں مصروف ہوگئے، پیر صاحب کو جب احساس ہوا کہ منازل سلوک طے کرنے، شیطان پر غالب آنے، تزکیہ نفس اور اصلاح باطن کے لئے اصلاحی تعلق اور بیعت لابدی (ضروری) ہے تو پیر صاحب کسی اللہ والے کی تلاش میں

نکلے، اتفاق سے بلی بازار (غالبا مولانا کو تسامح ہوا ہے کہ یہ بلی بازار نہیں بلکہ شاپ بازار یا صاحب بازار والے پیر صاحب شاہ محمد ہاشم رحمۃ اللہ علیہ (جن کی سوانح عمری ایک الگ عنوان کے تحت ہے) سے ملاقات ہوگئی۔

حضرت ممدوح رحمۃ اللہ علیہ نے شاہ صاحبؒ سے چند سوالات پوچھے، جب ان کے صحیح جوابات شاہ صاحبؒ نے دیدئے تو ممدوح شاہ صاحب کے گرویدہ ہوگئے، قلیل عرصہ میں حضرت شاہ صاحب نے پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو سند خلافت عطا کی، اور وصیت کی کہ آئندہ یہ سلسلہ جاری رکھنا۔

مولانا عبداللطیف صاحب رحمۃ اللہ نے درس وتدریس، رشد وہدایت اور تبلیغ وتلقین پر اپنی زندگی گزاری، راقم سطور نے حضرت کو دیکھا اور مجلس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خلیفہ مجاز زندہ دل بزرگ عالم دین حضرت مولانا نثار احمد صاحب چاؤفرانگی بوسیدنگی راقم سطور کے استاد ہیں، ان سے حضرت پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق بہت ساری باتیں سننے میں آئی تھیں، میرے قابل قدر استاد کی ان باتوں سے جتنی باتیں میرے سمجھ میں آئیں، ان سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ حضرت مولانا عبداللطیف صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے صاحب سوز دروں بزرگ تھے، کشف وکرامات، خرق عادت اور روحانی تصرفات کی بھی بہت ساری باتیں سننے میں آئی تھیں۔

مولانا نثار احمد صاحب اللہ تعالی ان کی حیات میں برکت دے، ان کے ذریعے اللہ تعالی نے بہت سارے بندوں کی ہدایت کی ہے، ماشاء اللہ بوسیدنگ کے علاقے میں آپ نے مولانا عبداللطیف صاحب کے سلسلے کو جاری رکھا ہے بہت سارے لوگ روحانی اعتبار سے ان سے وابستہ ہیں۔ مولانا نثار احمد صاحب کے علاوہ راقم سطور نے حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے اور ایک خلیفہ کو دیکھا، جن کا نام مولانا حافظ محمد طیب صاحب ہے، مولانا طیب صاحب عنفوان شباب اور جوانی کے عالم میں ایک مشہور قوال کی حیثیت سے معروف تھے، اللہ تعالی نے ان پر رحم فرمایا اور کشاں کشاں ان کو حضرت مولانا عبداللطیف صاحب کے دربار سے وابستہ کردیا تھا، مولانا نے حضرت سے بیعت کی، اور روحانی منازل سبقا سبقا طے کر کے بالآخر خلافت سے سرفراز ہوئے تھے، مولانا کا تعلق بھی حضرت مولانا نثار احمد صاحب کی طرح بستی چاؤفرانگ سے ہے، مولانا نے بھی سلسلہ کو جاری کیا، ہمارے علاقے بلکہ رشتے داروں میں درجنوں حضرات ایسے تھے اور اب بھی ہیں جو روحانی طور پر مولانا محمد طیب صاحب

سے وابستہ تھے اور ہیں۔ مولانا نے دو ایک حج بھی کئے، اور سفر حج کے دوران مکہ مکرمہ میں وفات پائی۔

ان دونوں مذکورہ خلفاء کے علاوہ بھی اور خلیفے ہوں گے، سر دست مزید معلومات نہیں ہیں، البتہ حضرت مولانا قاری حافظ محمد صدیق صاحب کے بیان کے مطابق حضرت کے اور چار مشہور خلفاء بھی ہیں، جن کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت مولانا سید الامین صاحب منگنماوی، منگڈو۔

(۲) حضرت مولانا عبدالغفور صاحب فانسی، بوسیدنگ۔

(۳) حضرت مولانا احمد حسین صاحب فانسی، بوسیدنگ۔

(۴) حضرت مولانا سعید اللہ صاحب ناکھوروی، منگڈو۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ کی وصیت کے مطابق پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی خانقاہی نظام کا باقاعدہ آغاز کیا، اور بہتوں کو راہ راست پر لے آیا، پیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سے حضرات کو خلافت دی، جن میں سے مذکورہ حضرات (پیر صاحب کے خلفاء) کا تذکرہ مولانا عبدالقدوس مجاہد ہاتھی پاروی (جو پیر صاحب کے نواسہ ہیں) نے بھی کیا ہے۔

مولانا عبداللطیفؒ ماشاءاللہ صاحب اولاد بزرگ تھے، آٹھ صاحبزادے اور تین صاحب زادیاں ہیں، اور تینوں صاحب زادے عالم دین بھی ہیں۔ چنانچہ مولانا حافظ محمد صدیق لکھتے ہیں کہ:

"پس ماندگان میں ایک بیوہ، آٹھ صاحب زادیاں اور تین صاحب زادے ہیں، الحمدللہ تینوں صاحب زادے عالم دین ہیں۔

(۱) مولانا عبدالحی فاضل جامعہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ چاٹگام۔

(۲) مولانا حافظ عبدالحق فاضل قاسم العلوم پٹیہ یہ راقم سطور کے ہم کلاس ہیں، انتہائی ذہین وفطین ہیں، عنفوان شباب میں یہ منطق کی اس مثال کے مصداق تھے کہ "شریر لڑکا ذہین ہوتا ہے" فی الحال سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

(۳) مولانا نور الحق فاضل مدینہ یونیورسیٹی سعودی عرب"۔

مولانا محمد علی صاحب معروف بہ ٹھنڈا مولوی کھلاربیلی ؒ منگڈوی:

مولانا محمد علی معروف بہ ٹھنڈا مولوی صاحب کی پیدائش شمالی منگڈو کی بستی کھلاریل میں ہوئی۔ آپ کی ابتدائی تعلیم علاقہ میں ہوئی، بعد میں متوسطہ اور اعلی دینی تعلیم کے حوالے سے ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے ازہر ہند دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے جماعت ششم سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم پائی۔ آپ حضرت العلامہ مولانا محمد اعزاز علی صاحبؒ اور حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے تلمیذ خاص تھے، آپ کے ہم سبقوں میں دوسروں کا تو پتہ نہ چلا، البتہ مولانا شبیر احمد صاحب کے مطابق حضرت العلاّمہ مولانا منظور الحق صاحب ملتانی مہتمم دارالعلوم عیدگاہ کبیر والا آپ کے ہم سبقوں میں سے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ سیدھے وطن واپس آئے، اور اپنی آبائی بستی کھلاربیلی میں قائم کردہ مدرسہ سے دینی تعلیم کا آغاز کیا، چند سال کے بعد اپنی آبائی بستی سے تقریباً تین کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک دینی ادارہ قائم تھا، اس میں آپ کا تقرر ہوا، اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''مولانا محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد ارکان تشریف لائے اور اپنی آبائی بستی کھلاربیل میں دینی درس وتدریس کا آغاز کیا، یہاں ایک دینی مدرسہ پہلے سے قائم تھا، جسے مقامی بعض علمائے کبار نے قائم کیا تھا، اس وقت شیر ارکان وحید زمان رئیس المعقولات والمنقولات مولانا سید الامین صاحبؒ کا تعلیمی زمانہ تھا، چنانچہ آپ نے بھی اسی زمانہ میں مولانا محمد علی صاحب سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، یہی وجہ تھی کہ مولانا تادم آخر مولانا سید الامین کو نام لے کر پکارتے تھے، چوں کہ شرف تلمذ حاصل تھا، اسی لئے مولانا سیّد الامین صاحب بھی ہمیشہ اپنے استاد کی توقیر کرنے میں کسی قسم کی کسر باقی نہیں رکھتے تھے۔ بعد میں کھلاربیل کا یہ مدرسہ قائم نہ رہ سکا تو آپ بڑا گوجربیل میں قائم شدہ دینی درس گاہ میں منتقل ہوگئے موخر الذکر یہ مدرسہ اس زمانے میں بڑی شہرت کا حامل تھا، جسے شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب چالی فرانگیؒ فاضل دارالعلوم دیوبند (والد ماجد مولانا شیخ رشید احمد مقیم حال جدۃ کیلو اربعۃ عشر سعودی عرب) نے قائم کیا تھا، جس کا نام الجامعۃ الاسلامیہ بڑا گوجربیل رکھا گیا تھا، جہاں اس وقت جماعت سوم تک کی تعلیم ہوتی تھی، بڑا گوجربیل کھلاربیل سے تقریباً تین کیلومیٹر کے فاصلے پر بہت پرانی ایک مسلم بستی ہے۔ مولانا رحمۃ اللہ روز کھلاربیل سے پیدل آتے جاتے تھے، روز صبح آٹھ بجے مدرسہ پہنچتے اور شام بعد نماز عصر اپنے گھر چلے جاتے تھے، راقم سطور اس وقت ابتدائی درجہ کا طالب علم تھا، آپ سے علم الحساب سیکھتا تھا۔ بعد میں بڑا گوجربیل والے اس مدرسہ کا بار اٹھا نہ سکے تو یہ مدرسہ بھی قائم نہ رہ سکا تھا''۔

راقم سطور کے خیال میں یہ دینی درسگاہ ختم نہیں ہوئی تھی، البتہ دوسری جگہ منتقل ہوگئی تھی، اور مولانا شبیر احمد صاحب کے مطابق بھی یہ بات واضح ہوجاتی ہے۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں کہ:

> ''شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالجلیل نور اللہ مرقدہ کے زیر اہتمام بڑا گوجربیل والا مدرسہ چل رہا تھا، بعد میں بستی والے اس کی بوجھ اٹھا نہ سکے تو مدرسین کے آپس میں مشورہ ہوا کہ اب کیا کیا جائے اور مدرسہ کہاں منتقل کیا جائے؟ مولانا عبدالجلیل صاحبؒ بہت ہی ضعیف ہوچکے تھے، ہمت کام نہیں کررہی تھی۔ چنانچہ سرزمین ارکان کے یہ شیر دل عالم دین مولانا محمد علی صاحبؒ اٹھ کھڑے ہوئے، اور ایک زوردار خطبہ کے دوران فرمایا کہ: ''ہمارا یہ دینی ادارہ ہستی سے نیستی کو جا نہیں سکتا، ہم اور ہمارے بزرگوں کی کوشش اور محنت رائگاں نہیں جاسکتی، اس ادارہ کی باگ ڈور انشاء اللہ ثم انشاء اللہ خاک پائے علمائے دیوبند محمد علی ہی سنبھالے گا، مولانا تو ظاہر ہے کہ سرزمین ارکان میں اس وقت کے خطیب اعظم تھے۔ مولانا کی تقریر میں بڑی تاثیر تھی، چنانچہ مولانا کے عجیب وغریب بیان نے پورے مجمع کو مسحور کر ڈالا تھا۔ اور طے ہوا کہ مدرسہ کھلاربیل منتقل کیا جائے گا، یوں یہ مدرسہ کھلاربیل منتقل

ہوگیا تھا۔ اور صرف بستی کے نام کی تبدیلی ساتھ اس مدرسہ کو ''الجامعۃ الاسلامیۃ کھلا ربیل'' رکھا گیا تھا''۔

مولانا محمد علی صاحب نے اس مدرسہ کی تعلیم، تعمیر وترقی کی خاطر دن رات کو ایک کردیا تھا، اطراف کے چند علماء کو یہاں تعلیم دینے کے لئے جمع کیا تھا، جن میں حضرت العلامۃ مولانا بدرالاسلام کھلا ربیلی کے علاوہ مولانا ابوالقاسم رامیوربیلی، مولانا سید عالم صاحب چالی فرانگی جیسے علماء کے اسمائے گرامی سر فہرست ہیں۔ مولانا نے اس مدرسہ کی مالی حالت کو درست کرنے کے لئے دور دراز کا سفر کیا، ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی، آپ نے اس درس گاہ کے لئے اپنی زندگی کو وقف کردیا تھا، ان سارے حالات پر مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ :

''جامعہ اسلامیہ کھلا ربیل مولانا محمد علی کی زیر اہتمام اور مولانا بدرالاسلام کھلا ربیلی کی زیر نظامت نہایت نظم ونسق اور بڑے حسن وخوبی سے چل رہا تھا۔ چنانچہ کئی سال بعد حالت نے انگڑائی لی، قحط سالی کی وجہ سے بستی کے بہت سارے باشندے ادھر ادھر بھاگ گئے، ایسے حالات میں حضرت مولانا قاری بدالاسلام صاحب بھی وطن کو خیر باد کہہ کر بنگلہ دیش چلے گئے۔ مولانا محمد علی صاحب نے مولانا ابوالقاسم رامیوربیلی اور مولانا سید عالم صاحب چالی فرانگی کو جامعہ کی تعلیمی اور انتظامی ذمے داریاں سونپ کر دور دراز کے سفر کے لئے کمر باندھ لی، جامعہ کے لئے چندہ کی خاطر اکیاب، رنگون، کراچی پاکستان، بنگلہ دیش اور سعودی عرب کے مختلف سفر کئے تھے، ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کی پاکستان سے علیحدگی کے دوران آپ کراچی میں تھے، تبادلۂ باشندگان کے قبل آپ کو اپنا وطن لوٹنا ضروری ہوگیا تو آپ کراچی سے لاہور آئے، پھر دریائے ستلج کو پار کیا اور دنیا کے بے مثال ریگستان کو نہایت مشقت اور ہزار دقت سے عبور کرکے پنجاب کے معروف شہر امرتسر پہنچے، آپ کے ساتھ مولانا بلال صاحب بھی تھی، یہاں سے بنگلہ دیش تشریف لائے اور بالآخر اپنے وطن آ پہنچے تھے''۔

مزید لکھتے ہیں کہ:

''مولانا نے وطن پہنچتے ہی جامعہ کا انتظام پھر سے اپنے ہاتھ میں لیا، آپ بڑے محنتی انسان ثابت ہوئے۔ کسی بھی حالت میں آپ نے جامعہ سے دور رہنا گوارہ نہیں کیا تعلیم کو جان دار بنانے کی خاطر اساتذہ خود اختیار فرماتے تھے، اور اساتذۂ کرام کی تدریسی حالت پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ ایسے میں سالوں سال گزر گئے تو عمر کے آخری حصے میں بستی کے کچھ حاسد بن کی نظر کرم آپ پر لگی، مولانا شبیر صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا محمد علی صاحب نے جامعہ کی ترقی کے لئے دن رات کو ایک کردیا تھا، بڑی محنت اور کوشش سے خدمات انجام، اساتذہ خود مقرر کرتے رہے، یوں جامعہ کی تعلیمی وتربیتی حالات آئے روز درست ہوتے گئے۔ آخر بستی کے کچھ لوگ مخالفت پر اتر آئے جو جامعہ کی اعانت وتعاون سے دست بردار ہوگئے، اب حضرت کی جسمانی حالت درست نہ رہی، عمر کا آخری حصہ تھا، ضعف بڑھتا گیا، ایسے حالات میں سالانہ جلسہ منعقد کیا گیا تو دعوت عام تھی۔ لوگ ایک بھی جلسہ گاہ نہیں آئے۔ باوجودیکہ آپ کی جسمانی حالت صحیح نہیں تھی، آپ نے میکروفون ہاتھ لے کر ایسا زوردار خطاب شروع کیا کہ سارے لوگ دھنگ رہ گئے تھے۔ حمد وصلوۃ کے بعد بڑی دل سوز آواز میں نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پھر دینی ترانے گانے لگے، اور قرآن وسنت کی روشنی میں تقریر شروع کی تو بستی کے لوگ جن میں مرد عورت، بوڑھے اور جوان شامل تھے مستانے ودیوانے بنے جلسہ گاہ آ گئے، یوں بڑے جوش وخروش سے جلسہ کامیابی سے ہم کنار ہوگیا تھا''۔

حاسدین میں سے کچھ عناصر اب بھی آپ کے پیچھے پڑے ہوئے تھے، وقت گزرتا گیا، آپ کے قوی مضمحل ہوتے گئے، مخالفین مخالفت سے بڑھ کر عداوت پر اتر آئے تو آپ نے جامعہ سے مکمل علیحدگی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ پھر بھی بعض احباب اور رفقائے کار نے آپ کو علیحدگی سے باز رہنے کا مشورہ دیا تھا مگر آپ نے انتظامیہ کے سامنے اپنا استعفی نامہ پیش کردیا۔ اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''کچھ عناصر کی مخالفت پھر عداوت ناقابل برداشت ہوچکی تھی، چنانچہ اس وجہ سے

حضرت مولانا جامعہ سے علیحدہ اور مستعفی ہوگئے تھے۔مگر علیحدگی کے بعد بھی حضرت اس گلستان دینی کی خوش بوسونگھنے ہمیشہ آتے جاتے رہے،ایسی حالت میں حضرت کی روح انور اپنی قفس عنصری سے پرواز کرگئی،اناللہ وانا الیہ راجعون،یوں آپ ہم سب کو یتیم بنا کر دار فانی سے دار بقاء کو چل دیئے ۔اللہ تعالیٰ آپ سے راضی ہوجائے،اوراپنی جنت کے اعلی درجہ میں جگہ عطافرمائے،آمین''

آپ کی نماز جنازہ میں ملک کے بڑے بڑے علمائے کرام،طلبۂ دینی درس گاہ اورعوام الناس کے ٹھاٹے مارتا سمندر نے شرکت کی تھی،برسات کا موسم تھا،پھربھی اتنے لوگ جمع ہوگئے کہ جس کا حساب نہ حد،نماز جنازہ جامعہ اسلامیہ کھلاربیل کے احاطے میں پڑھی گئی تھی۔عمر کے آخری حصے میں حضرت کی زبان مبارک میں یہ شعرورد زبان کی طرح رہتا تھا کہ:

حدود زندگانی میں جبھی مشکل مقام آیا
نہ غیروں نے توجہ دی نہ کوئی اپنا کام آیا

مولانا محمد علی رحمۃ اللہ علیہ جسمانی اعتبار سے بہت ہی مضبوط اورنہایت بارعب انسان تھے۔یوں بھی عالم دین،دارالعلوم دیوبند کے فاضل،مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی نوراللہ مرقدہ کے تلامذہ ٔخاص میں سے تھے توعوام توعوام علماء اور دانش وران بھی بچوں کی طرح پیش آتے تھے۔علاوہ ازیں اخلاقی اعتبار سے بھی مولانا حقیقت میں ہمارے اکابرین اور بزرگان دین کے وارثین میں سے تھے ۔مولانا شبیر احمد صاحب سے سنیئے:

''آپ فاضل دیوبند ہیں،شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے تلامذہ میں سے تھے،آپ جسمانی اعتبار سے مضبوط،طاقت ور،بلند قامت اور گنجان داڑھی والے بارعب اورحشمت ودبدبہ والے انسان تھے،خندہ رو اور کشادہ وکتابی چہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت دل کش وجاذب نظر شخصیت کے مالک بھی۔آواز میں کشش بھی تھی اورخطابت میں تاثیر بھی،ملنسار بھی تھے اور سخاوت میں یکتائے روزگار بھی،آپ کے علم اورخطابت سے ہزاروں باشندگان ارکان فیضیاب ہوئے۔آپ کی نصیحت ووعظ سے ہزاروں بندگان خدا کو راہ

ہدایت ملی،آپ کے بیانات ہمیشہ قرآن وسنت کی روشنی میں ہوتے،تقریر کی تاثیر سے مجمع ہل جاتا اور سننے والے مسحور ہوجاتے تھے۔موقع موقع پردل سوز اور مدبھری آواز سے شیخ سعدی شیرازی اورعلامہ جلال الدین رومی کے اشعار پڑھتے توسامعین میں آہ وبقا کا عالم ہوجاتا تھا''۔

مولانا محمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے بہادر اورنڈر انسان تھے۔یوں بھی جس طرح عرض کی گئی ہے کہ آپ کی شخصیت میں رعب اور جاذبیت تھی،مزید برآں آپ ہر کام میں ہمت اور بلند حوصلگی سے کام لیتے تھے۔آپ کے سامنے جو بھی آتا مرعوب ہوجاتا تھا۔اس حوالے سے ایک دوواقعہ مختصر طور پر مولانا شبیر احمد صاحب کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''آپ کی شخصیت بڑی حشمت اور دبدبہ والی شخصیت تھی،ایک روز کا واقعہ ہے کہ آپ کو کسی وجہ سے منگڈو کی عدالت میں بلایا گیا تو آپ وقت پر حاضر ہوتے ہی حاکم جسے عدالت صاحب کہا جاتا تھا سے فرمانے لگے کہ تم نے مجھے کیوں بلایا، جلدی جلدی بتادو، دیر ہورہی ہے، مجھے جانا ہے تو آپ کی جرأت ہمت اور بلند حوصلگی کو دیکھ کر حاضرین تو کیا خود حاکم یعنی عدالت صاحب بھی دم بخود ہوگئے تھے ۔یوں آپ کو باعزت چھوڑ دیا گیا تھا''۔

اورایک واقعہ ملاحظہ کیجئے :

''ایک دفعہ حضرت مولانا اکیاب کے سفر میں تھے، بوسیدنگ سے بذریعۂ جہاز اکیاب پہنچے تو ابھی جہاز اکیاب کی بندرگاہ پہنچی تو سارے لوگ جہاز سے اترنے لگے تھے۔مگرمگوں نے مسلمانوں کو ایک جگہ پر جمع کرکے مطالبہ کرنے لگا کہ تم لوگ مسلمان ہوں،اس لئے ہمیں پیسے دیئے بغیر جہاز سے اترنہیں سکتے،اب مولانا آگے بڑھے اور گرج دار آواز سے فرمایا کہ تم کون ہوتے ہو ہمیں روکنے والے۔یہ وطن صرف تمہارا نہیں ہمارا بھی ہے،مگرمصیبت تو یہ ہے کہ ہمیں تم جسے نامرد، بزدل اور ہے آدبوں کے پالا پڑا ہے۔ہم کیا تمہارے باپ کے زرخرید غلام ہیں؟ ہٹ جاؤ ہمارے سامنے۔مگ لوگ مولانا کی باحشمت شخصیت اور گر

جدار آواز سے کانپنے لگے، اور سب مسلمانوں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے''۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ بڑے پارسا، عابد اور زاہد عالم دین تھے۔ آپ کے مطالعہ وعبادات کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب اپنے چشم دید حالات یوں لکھتے ہیں کہ:

''راقم نے حضرت مولانا سے 'نور الایضاح'' نامی کتاب پڑھی، بعد میں اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے پاکستان کا سفر کیا، اور حضرت شیخ الاسلام مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے شرف تلمذ حاصل کیا، مولانا بنوری خاتم المحدثین حضرت العلامہ محمد انور شاہ کشمیری کے تلمیذ خاص تھے۔ فراغت کے بعد وطن واپس آیا تو حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ نے راقم کو اپنا جامعہ ''جامعہ اسلامیہ کھلا ربیل ''میں بحیثیت مدرس تعین کیا' دراں حالیکہ حضرت قاری محمد یوسف رامپور بیلیؒ (فاضل جامعہ بنوری ٹاون کراچی) بھی وہیں مدرس تھے۔ راقم نے آٹھ سالوں تک مسلسل جامعہ کھلا ربیل میں تعلیمی فرائض انجام دیئے۔ راقم نے حضرت مولانا محمد علی کو جہاں تک دیکھا کہ آپ ساڑھے تین یا زیادہ سے زیادہ چار بجے رات کو جامعہ تشریف لاتے، اساتذہ اور طلبہ کو بیدار کرتے، تاکہ کتب بینی کر سکے اور تہجد ادا کر سکے۔ اور حضرت بھی بذات خود تہجد ادا کرتے اور صبح کی آذان تک مسجد میں بیٹھے بیٹھے دربار الٰہی میں آہ وزاری کرتے تھے۔ گویا تہجد اور نالہ' آہ سحر گاہی آپ کی زندگی کا معمول تھی، روتے آنسو بہاتے، اور مولانا جلال الدین رومی کے مثنوی پڑھتے تھے''۔

غالباً ۱۹۸۶ء میں راقم سطور چاٹگام کی ایک عظیم دینی درس گاہ میں زیر تعلیم تھا، مدرسہ کی چھٹی ہوئی تو وطن واپس لوٹنے کی راہ پر ٹیکناف کی ایک بستی ''زادی مورا'' پر پہنچا، یہ بستی دریائے ناف کے مغربی کنارے پر بالکل لب دریا بستی ہے۔ عصر کی آذان ہوئی تو اسی بستی کی ایک چھوٹی سی مسجد میں ادائے صلوۃ کی خاطر داخل ہوا تو دیکھا بہت ہی لمبی اور گھنی داڑھی والے کتابی چہرہ بلند قدوقامت اور بارعب ایک عالم دین مسجد میں تشریف فرما ہیں، ابھی نماز مکمل ہوئی تو بستی کے لوگ حلقہ بناتے ہوئے آپ سے عرض کر رہے ہیں کہ حضرت ہمیں اپنی نصیحت سے سرفراز فرمائیں۔ راقم بھی اس حلقہ میں شامل ہو گیا، نصیحت حضرت نے شروع کی تو محسوس ہوا کہ یہ کوئی معمولی عالم دین نہیں ہیں، سر پر بہت بڑا عمامہ

کاندھے پر سفید رومال، گرجدار مگر دل نشین آواز حضرت کی ہر بات دل میں اترنے والی تھی۔ پند ونصیحت کے بعد آپ مسجد سے نکلے تو دیکھا کہ نصف ساق کا جبہ اور ہاتھ میں بہت بڑی لاٹھی لئے ایک عظیم المرتبت انسان راہ پر چل رہا ہے، راقم بھی ساتھ نکلا، ابھی حضرت مسجد سے نکلے تو پیچھے موڑ کر مجھ سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ بیٹا تم کہاں کے ہو اور کہاں پڑھتے ہو اور آج تمہیں کدھر جانا ہے؟ میں نے ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے بتایا کہ میں دریا کے اس پار ارکان کا ہوں، چاٹگام کی ایک دینی درسگاہ میں زیر تعلیم ہوں، اور آج چھٹی کے موقع پر وطن جانے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ تو حضرت نے فرمایا کہ بیٹا! میں بھی ارکان کا ہوں، آج شام بعد دریا پار کر کے وطن جانے والا ہوں، اگر تم چاہو تو ہمارے ساتھ چل سکتے ہو، مغرب کے متصل مجھے لینے کے لئے وطن سے کشتی آنے والی ہے، انشاء اللہ ہم مغرب کے بعد کشتی پر سوار ہوں گے۔ میں نے حضرت کی اس پیش کش کو غنیمت جانا اور آپ کے ساتھ ہونے کے لئے ہاں کر دی۔

مسجد مذکور کے تھوڑے فاصلے پر لب سڑک ایک چائے کی دکان تھی، حضرت اس میں داخل ہوئے تو لوگ آپ سے کچھ سننے کے لئے یہاں بھی بے تاب، تو یہاں بھی آپ نے چائے پیتے پیتے لوگوں کو نصیحتیں کیں۔ مغرب کی آذان ہوئی تو دوبارہ آپ مسجد میں تشریف فرما ہوئے۔ نماز کے بعد خبر ملی کہ کشتی آ پہنچی اور آپ کی منتظر ہے۔ اسی سفر میں حضرت کا ایک صاحب زادہ بھی تھا اور دو طالب علم بھی، غرض کشتی پر ہم سب سوار ہوئے، چاندنی رات تھی اور دریائے ناف کی طوفانی لہریں، حضرت میری طرف متوجہ ہوئے، اور اپنی تعلیمی زندگی کے حالات بیان کرنے لگے۔ حضرت کی ساری باتیں تو یہاں زیر تحریر لانے کی گنجائش تو نہیں، البتہ کچھ باتیں یہاں درج کر دیتا ہوں:

''تعلیم کے حوالے سے دار العلوم دیوبند پہنچا تو مجھے یہاں کے دینی اور علمی ماحول سے محسوس ہونے لگا تھا کہ اب میں علم ودانش کے حوالے سے دنیا کی سب سے بڑی درس گاہ میں آ پہنچا۔ یوں تو دار العلوم کے ہر ایک اساتذہ علم وعمل کے اعتبار سے درخشاں ستارے تھے، مگر میں نے ذاتی طور پر دو بزرگوں سے استفادہ کیا، ان میں سے ایک شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ اور دوسرا حضرت العلامۃ مولانا اعزاز علی صاحبؒ۔ موخر الذکر سے نفحۃ الیمن کے علاوہ

بھی ادب عربی کی بہت ساری کتابیں پڑھیں، اللہ اللہ یہ کیسے بزرگ تھے، ہر ایک دین کا چراغ، اللہ ان سے راضی ہو جائے‘‘۔

دوران گفتگو حضرت سے میں نے پوچھا کہ آپ نے دارالعلوم میں کتنے سال تعلیم حاصل کی؟ فرمایا کہ سات سالوں تک، یعنی جماعت ششم سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم یہاں سے حاصل کی تھی ابھی ہم محو گفتگو تھے کہ کشتی دریا کے پار لگی، تو حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ بیٹا رات ہوگئی ہے، کدھر جاؤ گے؟ میں نے بتایا کہ یوں تو مجھے بوسیدنگ جانا تھا، مگر جا نہیں سکتا۔ اس لئے کہ وہاں کے جاسوس میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، اب مجھے اپنے دادیہال کی بستی ’’نائن چنگ‘‘ جانا ہے۔ تو حضرت نے فرمایا کہ رات ہمارے غریب خانے میں کاٹ کر صبح سویرے چلے جانا۔

یوں حضرت کے گھر پہنچا، کھانا کھلایا، مہمان نوازی میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا تھا کہ حضرت مولانا طلباء دین سے بہت ہی محبت سے پیش آتے ہیں۔ صبح سویرے ناشتے کرائے اور مجھے ایک حقیقی بیٹے کی طرح الوداع کیا۔

اس کے بعد طالب علمی کے زمانے میں حضرت سے دو مرتبہ مختصر ملاقاتیں ہوئیں، آخری ملاقات ۲۰۰۰ء میں چاٹگام کا معروف تجارتی مقام خاتون گنج میں ہوئی تھی۔ مولانا جامعہ کے چندہ فراہمی کے لئے یہاں آئے تھے، یہاں اگر چہ مختصر سہی مولانا کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا، شاید یہ واقعہ قارئین کرام کی دلچسپی کا باعث بنے گا، اس لئے درج کر دیتا ہوں:

’’رمضان المبارک کا مہینہ تھا، چاٹگام میں پائے جانے والے اس وقت روہنگیا برادری کے چند بڑے اہل خیر نے باہمی مشورہ سے طے کیا کہ چندہ فراہمی کے حوالے سے وطن سے بہت سارے حضرات آئے ہوئے ہیں، ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون صحیح اور کون غلط ہے، اس لئے جسے طاہر جمال ندوی تصدیق کریں گے ہم اسے چندہ دیں گے، نماز ظہر کے بعد کسی تنظیمی ضرورت کی بنیاد پر میں خاتون گنج گیا، اور بھائی نور محمد صاحب نیا فاروی کے تجارتی دفتر میں جا بیٹھا تو ارکان سے آئے ہوئے دس بارہ علماء مجھ سے آملے، جن میں مولانا محمد علی صاحب بھی تھے، ہر ایک تصدیق نامہ کا طالب تھا، میں نے ہر ایک کو تھوڑی جانچ کے بعد تصدیق نامہ لکھ

دیا، ایسے میں چند لوگوں نے ایک مولوی صاحب کو پکڑ کر میرے سامنے حاضر کیا اور کہنے لگا کہ اس کے پاس کوئی مدرسہ نہیں ہے، بس اپنے پیٹ کی خاطر جعلی چندہ اصول کرتا ہے، میرے بغل والی کرسی میں مولانا محمد علی صاحب تشریف فرما تھے، آہستے سے میرے کان میں فرمایا، بھائی ٹھیک ہے کہ مولوی صاحب کسی مدرسہ کا مندوب نہیں ہیں، مگر جہاں تک میں جانتا ہوں کہ یہ بے چارہ بہت ہی نادار ہے، چند بیٹیا ہیں، شادیاں بھی نہیں ہو پائیں، اس پر مستزاد کہ گزارے کے حوالے سے وہ بہت ہی پریشان حال ہے۔ حضرت کی یہ بات سن کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے، اور میں نے جھٹ سے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اس بے چارے غریب کو بچا لیا، اس سے اندازہ ہوا تھا کہ مولانا محمد علی صاحب بہت ہی فراخ دل اور انسانوں کے دکھ درد میں شریک ہونے والے بزرگ ہیں، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے سرزمین ارکان میں ایسے لوگ اور بھی پیدا کرے۔ آمین‘‘۔

حضرت مولانا نے دو شادیاں تھیں، صاحب زادوں میں مولانا محمود الحسن صاحب معروف ہیں، شاید یہ وہی صاحب زادہ ہے، جسے میں نے مذکورہ کشتی والے سفر کے دوران حضرت کے ساتھ دیکھا تھا۔ مولانا محمود الحسن صاحب ابھی مکۃ المکرمۃ میں مقیم ہیں، اور اخلاف کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب کا ایک مختصر بیان ملاحظہ فرمائیے !

’’حضرت مولانا محمد علی صاحبؒ کا ایک صاحب زادہ مولانا محمود الحسن ہے، ارض مقدسہ مکۃ المکرمۃ میں مقیم ہے، ان کے علاوہ بھی اور چند صاحبزادے ہیں، اور کئی صاحب زادیاں بھی، بڑی صاحب زادی کی شادی مولانا بشیر اللہ صاحب کھلاریلی سے ہوئی، جو حالیہ ارکان کے چوٹی کے علمائے دین میں شامل ہیں، اور اس صاحب زادی کا ایک بیٹا مولوی تقی الرحمن صاحب بڑے جیّد نوجوان عالم دین ہیں۔ حضرت مولانا محمد علی نے خدمت کی خاطر اور ایک شادی بھی کی، جس سے کئی بیٹے اور بیٹیاں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک صاحب زادہ حافظ القرآن بن کر علم دین حاصل کر رہے ہیں‘‘۔

مولانا مفتی ابوالفضل صاحب لمبابیلی، بوسیدنگؒ:

حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب بن عبدالجلیل بن عبدالمجید کی پیدائش قصبۂ علی چنگ ،بوسیدنگ کی بستی لمبابیل میں ۱۹۰۰ء میں ہوئی، شنید ہے کہ آپ کے والد ایک کاشتکار تھے، لیکن نہایت سادہ سیدھا اور عالم دوست بزرگ تھے، اور والدہ بھی نہایت نیک سیرت اور پاکیزہ خاتون تھیں، اللہ تعالی ان بزرگوں کو جنت الخلد میں جگہ عطا فرمائے۔

مفتی صاحب نے اپنی تعلیمی سفر کا آغاز اپنی بستی کے مکتب سے کیا، دینیات کی مبادیات کے علاوہ ناظرۂ قرآن کریم اپنی بستی سے مکمل کر کے سرزمین ارکان میں اس زمانے کی شہرۂ آفاق دینی و تعلیمی درس گا ''اشرف المدارس راجاربیل، علاقۂ راسیدنگ) میں جا داخلہ لیا، جہاں آپ نے وقت کے بڑے بڑے ارباب فضل وکمال علماء ومشائخ حاملانِ علوم وفنون سے اپنی علمی پیاس بجھائی، یہاں آپ نے مسلسل چندسال تعلیم حاصل کی، اور ایک روایت کے مطابق درس نظامیہ کی جماعتِ ویوم تک کی تعلیم بڑی امتیازی شان سے پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے ''مدرسہ قاسم العلوم شاہی مرادآباذ'' میں داخل ہوئے، جہاں سے آپ نے درس نظامیہ کہ بقیہ ساری متداول کتابوں کی پڑھائی ختم کر کے سند فراغت حاصل کی، کہتے ہیں کہ درس نظامیہ سے فراغت کے بعد آپ نے دیگرفنون کی طرف توجہ دی، اور فن معقولات کی تمام متداول کتابوں پر عبور حاصل کیا، اس کے بعد شعبۂ افتاء میں داخلہ لیا، اسی طرح افتاء سے بھی فراغت کے بعد وطن کا رخ فرمایا، ظاہر ہے کہ اسی وقت برصغیر میں برطانوی راج تھا، تو آپ کسی قدر امن وسکون کے ساتھ اپنے وطن پہنچ گئے تھے۔

مدرسہ قاسم العلوم شاہی مرادآباد میں حضرت مفتی صاحب نے بطور خاص حضرت مولانا فخرالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے استفادہ کیا، دوران تعلیم آپ رہ رہ کر دارالعلوم دیوبند جایا کرتے تھے، جہاں بطور خاص حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے درس میں بیٹھ کر اپنی علمی پیاس بجھایا کرتے تھے، غرض سرزمین ارکان کے یہ قابل رشک طالب علم گلشن مرادآباد میں شبانہ روز محنت، جدوجہد اور جفاکشی پھر اللہ تعالی کے فضل وکرم سے اپنے سینے میں علوم اسلامیہ کا ایک سمندر سمیٹے اپنے وطن ارکان آ گئے۔

مفتی صاحب ابھی اپنے گاؤں میں پہنچے تو حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب تنگ بازاری نے آپ کو ان کی بناء کردہ دینی درس گاہ مدرسہ تنگ بازار میں خدمت کی دعوت دی، تو آپ نے بڑی خوشی سے لبیک کہا، یوں حضرت نے یہاں سالوں تک درس دیا، اس کے بعد مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ کے اصرار پر آپ تمنگ چنگ تشریف لائے، جہاں آپ نے ایک روایت کے مطابق ۱۹۵۲ء تک تعلیم دی، اور ہزاروں تشنگان علوم دین کی سیرابی کرائی، یہاں آپ کی خدمات کے حوالے سے اس علاقے کے بہت سارے لوگوں سے بار ہا سنا۔

بعد ازاں ۱۹۵۳ء میں آپ نے سرزمین ارکان کے ایک محسن عالم دین حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب پکتلوی اور حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی سے مل کر ''مدرسہ عالیہ بوسیدنگ'' کی بنیاد ڈالی، اور اس نئی درس گاہ کی خدمت میں مگن ہو گئے، اور درمیانی دو ایک سالوں کو چھوڑ کر اپنی زندگی کے آخری دم تک اسی درس گاہ کے لئے ہو گئے، یہاں آپ نے درسیات کی ابتدائی کتابوں سے لے منتہی کتاموں تک کی ساری کتابیں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ پڑھائیں، اور ایک طویل مدت تک شیخ الحدیث کے منصبِ جلیلہ پر فائز بھی رہے، یوں اس منصب پر رہتے ہوئے جنوری ۱۹۸۴ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مفتی صاحب ایک ذہین وفطین ایک ذی لیاقت واستعداد طالب علم تھے۔ اور جید الفکر وجلیل القدر عالم دین بھی، دیگر متداول کتابوں کے علاوہ آپ کے درس بخاری شریف کی شہرت ملک کے گوشے گوشے میں پھیلی ہوئی تھی، آپ سے پڑھنے کے شوق لے کر تشنگان علوم نبوت وطن کے کونے کونے سے آپ کے گرد جمع ہوتے اور اپنی اپنی پیاس بجھا کر واپس چلے جاتے تھے۔

اسی طرح مفتی صاحب نہایت مستند فقیہ اور بڑے معاملہ فہم قاضی اور گوہر شناس معلم ہونے کے ساتھ ساتھ کتاب وسنت کے عملی ذوق کے حامل عالم دین تھے، زہد وورع اور فہم وفراست کے حوالے سے یکتائے روزگار تھے، آپ کی زندگی سادگی میں پرکاری تھی، اور شخصیت میں دل کشی، جاذبیت اور دلاویزی بھی، ہمارے زمانے میں آپ جہاں بیٹھتے تو میر مجلس آپ ہی ہوا کرتے تھے، یوں حضرت مفتی صاحب اپنے زمانے میں ہر کسی علمی اور فکری مجالس کے گوہر شبِ چراغ تھے، جس کی روشنی اور ضیا پاشی سے اس زمانے میں ہمارے علمی اور فکری ایوان منور اور تاباں تھے۔

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک صاحب تحقیق مفسر قرآن اور نکتہ رس محدث، اور نکتہ سنج فقیہ واصولی انسان تھے، علمی اعتبار سے آپ کی ذاتِ گرامی میں خاص جامعیت پائی جاتی تھی، دیگر علوم وفنونِ دینیہ کے تہ بتہ احادیث نبویہ صلوات اللہ علیہ وسلامہ پر آپ کی نظر بڑی گہری اور عمیق تھی، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ کو بارگاہِ خداوندی سے جس طرح صالحیتِ بے بہا سے نوازا گیا، اسی طرح صلاحیتِ بے پایاں کی دولت سے بھی مالا مال کیا گیا تھا، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

گزری صدی اور آج کے ارکان کے مسلمانوں کے حالاتِ دگرگوں سے کون واقف ہیں؟ ارکان کے مسلمانوں پر عموما اور وہاں کے علمائے دین پر خصوصا یہاں جو مظالم ڈھائے گئے، اور اب بھی جا رہے ہیں، ان کے اجمال وتفصیل سے ساری دنیا واقف ہے، جن کی وجہ سے اور تو اور اس سرزمین کے بڑے بڑے جید اور نامور علمائے کرام نے اسے ہمیشہ کے لئے خیر باد کہا، اور دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اپنی اپنی مستعار زندگی کے بقیہ حصے گزار کر اس جہانِ فانی سے رخصت لی، جن میں حضرت مفتی صاحب کے معاصر حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب پکتلوی، حضرت مولانا محمد حسین صاحب تنگ بازاری، حضرت مولانا محمد صالح صاحب زوفرانگی ثم یونگ چنگی، حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی سرفہرست بزرگانِ دین ہیں، لیکن حضرت مفتی صاحب نے کبھی بھی اور کسی بھی حالت میں اپنے مادری وطن کو چھوڑنے اور بعض حضرات کے الفاظ میں ''ہجرت کرنے'' کا نہیں سوچا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ مفتی صاحب مسلمانانِ ارکان پر بیتنے والے ایسے حالات میں بطور خاص علمائے کرام کے اس بے دردی سے وطن چھوڑنے کو ایک طرح کی بزدلی اور فرض ناشناسی سمجھتے تھے، اس حوالے سے آپ کی رائے تھی کہ اگر علمائے کرام اپنے بھائی بند اور وطن عزیز کے بے یار و مددگار مسلم عوام کو چھوڑ چھاڑ کر اپنے بچاؤ کے لئے کہیں چلے جائیں گے تو یہاں کے مسلم عوام کی رہی سہی ہمت بھی جاتی رہے گی، اور یہ سراسر بے سہارے ہوئیں گے، جس کے نتیجے میں وطن کلی طور پر خالی ہوجائے گا، حضرت کی رائے میں یہاں کے علمائے کرام کو وطن کے مسلم عوام کی ہر حالت میں رہنمائی ناگزیر تھی، ویسے آپ نے اپنے وطن کو نہیں چھوڑا، اور آخر کار وطن ہی کی زمین کو اپنے سینے سے لگالیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب اپنے زمانے میں سرزمین ارکان کی معروف دینی وعلمی شخصیتوں میں درجۂ اول میں شمار تھے، آپ کے اعمال، سرگرمی وکردار یہاں کے مسلم عوام کے لئے مثالی درجہ رکھتے تھے،

اور آپ کی شخصیت ایک حیثیت سے مرجع کا درجہ رکھتی تھی، ویسے حضرت کی سلامتِ طبع اور جودتِ فکر و عمل کا نتیجہ تھا کہ آپ کے تلامذہ کے علاوہ آپ کے احباب اور خوشہ چینوں میں بھی آپ کی شان نمایاں طور پر نظر آتی تھی، اور تو اور علاقۂ بوسیدنگ اور بطور خاص شہر کے چیدہ حضرات آپ کو ایک مثالی انسان مان کر آپ کی نہایت عزت اور توقیر کیا کرتے تھے، آپ کے اعمال اور کردار کی خوشہ چینی کو قابل فخر خیال کرتے تھے، یہ چیزیں جہاں ایک طرف حضرت کی عظمت و رفعتِ شان کی دلیل تھیں، وہاں عوام میں آپ کی مقبولیت کا بین ثبوت بھی۔

حضرت مفتی صاحب کو میں نے عرصۂ دراز تک بہت ہی قریب سے دیکھا، آپ کی علمی وفکری صحبت سے اپنی بساط بھر استفادہ کرنے کی توفیق بھی ہوئی، جہاں تک دیکھا کہ آپ کی جلوتیں قال اللہ و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گزریں اور شبانہ خلوتیں اپنے خالق کے سامنے سربسجود عبادت گزاریوں میں بسر ہوئی تھیں، آپ ایک دلِ زندہ دار عالم دین ہونے کے علی الرغم بڑے فقیہ النفس انسان تھے، آپ کی زندگی پوری کی پوری ایک مثالی زندگی تھی، اور ہمارے بہت سارے اساتذہ حضرت کے تلامذہ میں سے تھے، جن کی زندگیوں میں جہاں تک محسوس کیا، حضرت مفتی صاحب کا رنگ بھرا دیکھا تھا۔

میرے علمی استفادہ کے حوالے سے ایک ضروری بات بتاتا چلوں کہ اگرچہ میں نے حضرت مفتی صاحب کو جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ عرصۂ دراز تک بہت ہی قریب سے دیکھا تھا، لیکن علمی استفادہ اتنا نہیں ہوسکا، جتنا ہونا چاہئے تھا، وجہ یہی تھی کہ میں جس وقت ہفتم وششم کا طالب علم تھا، تب حضرت درجۂ علیاء کے استاد بلکہ شیخ الحدیث تھے، بطور خاص بخاری شریف کا حصۂ اول اور ترمذی شریف کامل جیسی کتابیں آپ کے حصے میں تھیں، لیکن فرصت ملتے ہی میں حضرت کے درس بخاری میں کہیں چپکے سے بیٹھ جایا کرتا تھا، اور آپ نے اپنے عزیز خادم کو کبھی اس طرح کے بیٹھنے سے منع بھی نہیں فرمایا، علاوہ ازیں بعض خاص وعام علمی مجالس میں آپ کے نفع بخش ارشادات، فرمودات اور علمی وفکری گفتگو سننے اور ان سے اپنی بساط بھر اخذ نتائج کرنے کی توفیق ضرور ہوئی تھی۔

راقم سطور کے علم ومعلومات کے مطابق حضرت مفتی صاحب مشرقی طرز کے عالموں، خدا رسیدہ درویشوں کا ایک اچھا نمونہ تھے، خوب صورت عمامہ، نفیس سے نفیس ترین جبہ، اور سفید چادر میں ملبوس

ہاتھ میں لاٹھی تھامے عالمانہ اور درویشانہ چال چلتے ہوئے اب بھی میری نظروں کے سامنے ہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ حضرت کی تعلیم وتربیت مشرقی درس گاہوں میں مشرقی انداز میں ہوئی، آپ نے علوم دینیہ واسلامیہ کے مطالعے مشرق کی مثالی درس گاہوں میں کئے، مشرق کے تعلیمی، اخلاقی اور روحانی گنجینوں سے خوب خوب مستفید تھے، یوں آپ کے تمام اعمال وکردار میں مشرق کے صالح بزرگوں اور شریفوں کی نورانی جھلکیاں اور رعنائیاں نمایاں طور پر نظر آتی تھیں۔

راقم کو حضرت مفتی صاحب سے ایک طویل مدت تک خاص لگاؤ رہا، حضرت کو جبھی کسی لازمی چیز کی ضرورت پیش آتی تو اسے پورے کرنے کا مجھے حکم ہوا کرتا تھا، جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا کہ حضرت اپنے تلامذہ اور خوشہ چینوں کو عموماً اور راقم کو خصوصاً بڑی شفقت بھری نظروں سے دیکھتے تھے، اور ہمیشہ اس ناچیز کو علم وعمل توفیق ہونے کی دعائیں دیا کرتے تھے، آہ! آج آپ اور آپ جیسوں کی کفش برداری کے تذکار کے سوا اور کوئی راستہ باقی نہیں بچا ہے، آپ ہمیں اس غربت وبے کسی میں چھوڑے خالقِ حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالی آپ کو غریقِ رحمت کرے اور آپ کے درجات کو بلند فرمائے۔

حضرت مفتی صاحب نے تین شادیاں کیں، جو درج ذیل ہیں:

۱۔ زرینہ خاتون بانگونوی، بوسیدنگی مرحومہ: والدۂ مسٹر عبدالمتین وغیرہ۔

۲۔ کلثوم خاتون رنگیادنگی مرحومہ: والدۂ حضرت مولانا حسین احمد صاحب وغیرہ۔

۳۔ مصطفی خاتون تمنگ چونگی: والدہ محمودہ خاتون مرحومہ۔

اب ضروری معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی اولاد کے مختصراً سہی تبصرہ یہاں کردیا جائے، تو حاضر خدمت ہے۔

حضرت کی پہلی بیوی کے بطن کی اولاد:

(۱) جناب عبدالمتین ابوالفضل صاحب مرحوم: آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پائی، اس کے بعد بوسیدنگ ہائی اسکول میں داخلہ لیا، جہاں سے آپ نے مٹرک تک تعلیم حاصل کی، وہاں آپ نے علم وعمل اور کردار کے حوالے سے بڑا نام پایا۔

جناب عبدالمتین کے متعلق مزید اتنی سی معلومات ہیں کہ آپ ایک ذی علم وشعور دانشور ہونے کے ساتھ ساتھ سرزمین ارکان کے حوالے سے زیر زمین کام کرنے والے انقلابیوں سے خاص لگاؤ رکھتے اور ان کو تعاون کرتے تھے، اس بارے میں مزید یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہمارے قومی قائد حضرت محمد

جعفر حبیب مرحوم (صدر روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کے ساتھ آپ کا ایک خاص لگاؤ تھا، علاوہ ان کے مرحوم شبیر حسین (BA) فوئمالوی (سابق مؤسس صدر ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) نے بھی آپ کو اپنا ایک قریبی ساتھی اور بڑے مخلص دوست مانتے تھے، ظاہر ہے کہ مذکورہ دونوں لیڈروں کا شمار ہمارے قومی لیڈروں میں ہے، ان دونوں کا آپ پر اعتماد اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قومی امور کے حوالے سے آپ کا مقام کتنا بلند تھا اور ہے۔

(۲) جناب عبدالحکیم ابوالفضل صاحب: آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پائی، برمیز چوتھی جماعت پڑھ کر مدرسہ میں داخلہ لیا، اور جماعت ششم تک دینی تعلیم حاصل کی، آج کل سعودی عرب میں مع اہل خانہ مقیم ہیں۔

(۳) جناب محمود الحسن ابوالفضل صاحب: آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی لمبابیل کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پاکر شہر بوسیدنگ کے مڈل اسکول میں داخلہ لیا، جہاں سے آٹھویں جماعت کی تعلیم پائی، اس کے بعد پاکستان چلے گئے، کراچی میں تاحال مع اہل خانہ مقیم ہیں۔

(۴) مسعودہ خاتون بنت ابوالفضل: شادی وخانہ آبادی کے بعد آپ مع اہل خانہ برما کے دار الحکومت رنگون پہنچیں، وہاں تادم تحریر مع اہل وعیال سلامت سے ہیں، اگرچہ وہاں کے حالات بڑے تشویشناک ہیں، لیکن اللہ تعالی کے فضل وکرم سے آپ کسی قدر خوش وخرم ہیں، اللہ تعالی ان کو سلامت سے رکھے۔

حضرت مفتی صاحب کی دوسری اہلیہ محترمہ کلثوم خاتو کے بطن کی اولاد:

(۱) جناب عبدالحق ابوالفضل صاحب مرحوم: آپ نے تعلیم آپنی آبائی بستی کے علاوہ بوسیدنگ ہائی اسکول میں پائی، یوں تو ماشاء اللہ بڑے ہشیار دانشور ہیں، لیکن ان کا وضع قطع ہمیشہ عالموں جیسا ہوتا ہے، گھر بار کے کام کاج میں مشغول تو رہتے ہیں، لیکن آپ کا چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا اور انداز واطوار بزرگوں جیسا ہے، آپ کو جہاں تک دیکھا کہ آپ جماعتِ دعوت وتبلیغ سے لو لگائے ہوئے ہیں۔ جسمانی اعتبار سے مجھے لگتا تھا کہ آپ اپنے چھوٹے بھائی حضرت مولانا حسین احمد صاحب کی تقریباً ہم شکل ہیں، ویسے آپ کو بہت ہی اچھا لگتا تھا، آپ کی اہلیہ محترمہ حضرت مولانا قاضی عبدالہادیؒ صاحب لمبابیلی کی پوتی ہیں۔

(۲) جناب الحاج عبدالغفار ابوالفضل صاحب مرحوم: آپ نے کچھ دینی وعصری تعلیم اپنی آبائی بستی میں حاصل کی۔ ۱۹۹۲ء کے دوران آں جناب کو میں نے چاٹگام میں عرصۂ دراز تک دیکھا، جہاں تک اندازہ کیا کہ آپ نہایت پاک باز، مخلص اور خداترس انسان تھے، کم گومگر حق گو تھے، آپ نے عرصۂ دراز تک زندگی سعودی عرب کی پاک سرزمین مدینہ منورہ میں گزاری، گئی صدی کی آخری دہائی میں مع اہل خانہ چاٹگام میں مقیم تھے، پھر اس کے بعد دوبارہ سعودی عرب گئے، جہاں آپ کا انتقال ہوگیا، اور مدینہ کی مقدس سرزمین میں مدفون ہیں۔

(۳) مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب: آپ سرزمین ارکان کے قابل فخر سپوت ہیں، دینی، علمی، فکری اور منہجی اعتبار سے یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ قحط الرجال کے اس عالم میں آپ ولی اللہی مکتبِ فکر کا ایک روشن ومنور، تابناک اور درخشاں چراغ ہیں، میرے نزدیک مولانا محترم زمانے کے ان نایاب اور انمول نوادر میں سے ایک ہیں، جن کی قدر و قیمت کا اندازہ عوام تو کجا خواص الخواص بھی لگانے سے قاصر ہیں، میں یہ بات سرعام بہانگ دہل کہنے پر تلا ہوا ہوں کہ سرزمین ارکان کی اس نادر روزگار، عبقری اور موہوبی شخصیت پر قلم اٹھانا اور اس فرض پر قلم اٹھا کر عہدہ برآ ہونا اور بجا طور پر ہوسکنا ایک کٹھن اور دشوار گزار کام ہے، کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ لیاقت وصلاحیت، بلند نظری اور بلند حوصلگی، اولوالعزمی وفکری پرواز، وسیع الخیالی اور دقیق النظری جیسی صفات وکمالات سے متصف انسانوں پر قلم اٹھانے کے لئے ان کی شخصیت کے عناصر ترکیبی اور ان کی زندگی کی تمام جوانب اور پہلوؤں سے گہری واقفیت، بصیرت اور آگہی کی ضرورت ہے، جو مجھ میں نہیں ہے، لیکن اس قحط الرجال کے عالم میں ایسے قلم کار لائیں تو کہاں سے لائیں؟ یوں راقم سطور نے اپنی تہی دامنی اور کور بینی کے باوجود مولانا کے ایک عزیز اور کسی قدر قریبی خوشہ چین اور نالائق تلمیذ ہونے کے ناطے ایک سعادت کے بطور آپ کی زندگی کے بعض پہلوؤں اور جوانب پر مشتمل کچھ چیزیں زیبِ قرطاس کرنے کی بساط بھر کوشش کی، خدا کرے تو اس ناچیز کی یہ کوشش بھی ایک ضخیم جلد کی شکل اختیار کرے گی، خدا کرے کہ ناچیز کی اس کوشش میں برگ و بار آئے، ساتھ ہی ساتھ مولانا کی زندگی میں برکت دے، اور آپ کا سایہ ہم جیسے مسکینوں پر تادیر باقی رکھے۔

مولانا محترم کی اولاد واہل تادم تحریر چاٹگام میں رہائش پذیر ہیں، اور آپ سرزمین مقدس مکہ مکرمہ

میں مسافرت کی زندگی گزار رہے ہیں، اللہ تعالی آپ کی تمام پریشانیوں کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ آپ کی اولاد واہل کو خوش وخرم رکھے، اور اپنے فضل وکرم سے آپ کی اولاد واخفاد کو ملی وقومی کاموں میں شریک ہونے کی سعادت بخشے، آمین۔

(۴) مولانا محمد جلیل ابوالفضل صاحب: اپنی آبائی بستی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول کے علاوہ اپنے والد بزرگوار سے پائی، کچھ بڑے ہوئے تو جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں جہاں آپ کے والد صاحب شیخ الحدیث تھے میں داخلہ لیا، جہاں سے درسیات کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پاکر اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگلا دیش کا سفر کیا، اور جامعہ اسلامیہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ میں داخلہ لیا، یہاں جماعتِ اولی کے علاوہ دیگر فنونات کی تعلیم پاکر پاکستان پہنچے، اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ وطن واپس آئے، اور تمنگ چنگ والی ایک نیک سیرت اور دین دار خاتون سے شادی کی، اس کے بعد آپ حجاز مقدس پہنچے، چند سال وہیں گزار کر پھر وطن آئے، اور کچھ دن کے بعد اپنے اہل خانہ سمیت ترک وطن کر کے چاٹگام میں رہائش پذیر ہوگئے تھے۔

مولانا محمد جلیل صاحب سے راقم کی طول طویل ملاقات رہی ہے، ۱۹۸۵ء کے دوران مولانا حسین احمد صاحب جس زمانے میں خطیبر ہاٹ، چاٹگام میں رہائش پذیر تھے، مولانا محمد جلیل صاحب بھی مع اہل خانہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے، دراں حالیکہ میں دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام میں طالب علم تھا، اور میرا اس رہائش گاہ میں سدا آنا جانا رہتا تھا، وہاں مولانا محمد جلیل صاحب سے کبھی اکیلے میں اور کبھی کبھار مولانا حسین احمد صاحب کی شمولیت میں طول طویل باتیں ہوتی تھیں، خاص طور پر علمی، فکری، ثقافتی اور روحانی مذاکرات ہوا کرتے تھے، اسی طرح رہ رہ کر حالات کی نزاکت کے پیش نظر سیاسی اور انقلابی امور میں بھی گفتگو چھڑتی تھی، لیکن مولانا محمد جلیل صاحب انقلابی اور سیاسی گفتگو میں بہت کم دل چسپی لیتے تھے، تاہم فکری اور ثقافتی موضوعات میں خاص دل چسپی لیا کرتے تھے، قومی اور ملکی حالات پر کافی فکرمند ہونے کے باوجود ان موضوعات پر گفتگو کرنے کا جہاں تک سوال ہے، آپ کا ان امور کی طرف ذہنی رجحان بہت کم دیکھا گیا، خاص طور پر مولانا حسین احمد صاحب کی موجودگی میں آپ ان موضوعات میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔

مولانا محمد جلیل صاحب بڑے ذہین وفطین اور بڑے زیرک عالم دین ہیں، لیکن میرے ناقص خیال میں فراغتِ تعلیم کے بعد ان کو ایک عالم دین کی شایانِ شان مطالعہ کرنے کی نوبت بہت کم ملی، ورنہ آپ کی شخصیت اور کمالات میں چار چاند لگ گئے ہوتے۔

طالب علمی کے زمانے میں مولانا محمد جلیل صاحب کو مولانا حسین احمد صاحب ایک جید طالب علم کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے، مولانا حسین احمد صاحب کے بیان کے مطابق آپ ان کے معیار میں نہیں اترتے تھے، لیکن بعد میں مولانا حسین احمد صاحب کی رائے میں کافی تبدیلی آئی، اس حوالے سے ایک واقعہ خود مولانا حسین احمد صاحب کی زبانی سنئے کہ:

> ''جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں حضرت مولانا انورالعظیم صاحب میرے اور محمد جلیل کے استاد تھے، محمد جلیل کی لیاقت واستعداد کے متعلق میں مطمئن نہیں تھا، نہ جانے کیسے کہ مولانا انورالعظیم صاحب میرے اس خیال سے واقف ہو گئے تھے، ایک روز آپ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ حسین احمد! تم محمد جلیل کی لیاقت واستعداد پر اپنی رائے میں نظر ثانی کرلو، کیوں کہ فنونات پڑھنے کے بعد وہ کافی مستعد ہو چکا ہے، حضرت کی اس تصدیق کے بعد مجھے محمد جلیل پر اطمینان ہوا''۔

۱۹۸۵ء کی بات تھی کہ مولانا محمد جلیل صاحب چاٹگام میں تقریباً ایک سال گزار کر دوبارہ سعودی عرب گئے، بعد اپنے اہل خانہ کو بھی وہیں منتقل کرلیا، جدہ میں نجی کاروبار شروع کی، اللہ تعالی نے آپ کی تجارت میں کافی برکت دی، تا حال کسی قدر خوش حال ہیں۔

(۵) <u>عبدالحلیم ابوالفضل</u>: مفتی صاحب کا یہ صاحب زادہ راقم کے قریبی دوستوں اور چاہنے والوں میں سے ایک ہے، ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول میں پاکر متوسطہ تک کی تعلیم بوسیدنگ میڈل اسکول سے حاصل کی، ذہین وفطین ہونے کے باوجود بعض وجوہات کی بنیاد پر آٹھویں کلاس سے آگے نہ بڑھ سکا، اسے کھیل کود سے کافی دل چسپی تھی، فٹ بال کا کامیاب کھلاڑی تھا، اندرونِ وطن کے علاوہ چاٹگام اور سعودی عرب کے سفر کے دوران راقم سے اس کی راہ ورسم بحال تھی، بعد میں نہ جانے کیوں کہ اس راہ ورسم میں کافی سرد مہری آگئی، اس نے سعودی عرب کے علاوہ ملائشیا کا بھی سفر کیا تھا، شنید تھا کہ چاٹگام کے قریبی علاقہ ''شانتیر ہاٹ'' میں مع اہل وعیال مقیم تھا، اس کا انتقال

عالم جوانی میں ۲۰۲۲ء میں ہوا، شانتیر ہاٹ میں مدفون ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس پر رحم کرے، اور اہل وعیال کو سدا خوش وخرم رکھے۔

(۶) <u>ساجدہ بیگم بنت ابوالفضل</u>: اپنی آبائی بستی میں پیدا ہوئی، نشوونما اور دینیات کی تعلیم بستی کے مکتب کے علاوہ اپنے والد گرامی سے پائی، لائق ہوئی تو اس کی شادی مولانا نور محمد صاحب خیر مورہ فاروی (برادر خورد حضرت مولانا ولی احمد صاحب) سے ہوئی، آج کل مدینہ منورہ میں مع اہل خانہ مقیم ہے، مولانا نور محمد صاحب بھی حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کے تلامذہ میں سے ہیں، راقم سطور کو چاہنے والوں میں سے ہیں، آپ سے راقم کی ملاقات تو تھی، لیکن زیادہ نہیں، جہاں تک اندازہ کیا کہ آپ جید الفکر عالم دین ہونے کے ساتھ قومی وملی امور کے متعلق کافی فکرمند ہیں، آپ کے حوالے سے زیر نظر کاوش میں ایک خاص عنوان کے تحت مزید گفتگو ہوگی، اگر چاہے خدا کرے۔

(۷) <u>عبدالشکور ابوالفضل</u>: حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کا یہ بیٹا آٹھ سال کی عمر میں داغِ فراغ دے گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(۸) <u>فاطمہ بنت ابوالفضل</u>: آبائی بستی میں پیدا ہوئی، کچھ دینیات کی تعلیم بستی کے مکتب کے علاوہ اپنے والد گرامی سے پائی، لائق ہوئی تو اپنی بستی کے ایک صاحب سے شادی ہوئی، خدا کو منظور تھا کہ شادی کے کچھ سال بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا، اس کے بعد خائندہ فارہ منگڈو کے ایک صاحب سے دوبارہ شادی ہوئی، عرصۂ دراز تک اپنے بھائی مولانا حسین احمد صاحب کے پاس چاٹگام میں رہی، بعد میں وطن چلی گئی تھی، آج کل کاکس بازار کے علاقے میں مہاجرت کی زندگی گزار رہی ہے۔

حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب نے مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ کے دوران تدریس ایک شادی کی تھی، اس اہلیہ کا نام مصطفی خاتون تھا، اس کے بطن سے حضرت کی ایک بیٹی پیدا ہوئی، جس کا نام محمودہ خاتون تھا۔ ادھر حضرت کی یہ صاحب زادی عنفوان شباب میں انتقال کر گئی تو ادھر بعض ناقابل بیان وجوہات کی بنیاد پر میاں بیوی کے درمیان ناچاقی ہو گئی، آخر نوبت طلاق تک پہنچ گئی تھی۔

شنید ہے کہ مصطفی خاتون نے دوسری شادی کر لی، وطن کو خیر باد کر کے مع اہل خانہ سعودی عرب چلی گئی، مدینہ منورہ میں مقیم ہے، مولانا حسین احمد کے مطابق مفتی صاحب کی بعض اولاد گاہ گاہ اس کی زیارت کو جاتی تو ان کے ساتھ باوجود یکہ مفتی صاحب سے علیحدگی ہو چکی، اپنی اولاد جیسا برتاؤ کرتی ہے، اللہ تعالی اسے خوش وخرم رکھے۔

مولانا محمد ہاشم صاحب بانگکونوی ؒ بوسیدنگی:

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب کی ولادت تقریباً ۱۹۰۵ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معروف بستی بانگکونہ (علی چنگ) بوسیدنگ میں ہوئی، آپ کے والد مرحوم کے متعلق بس اتنی سی بات معلوم ہو سکی کہ وہ ایک سادہ لوح، علم دوست اور نہایت عبادت گذار کاشتکار بزرگ تھے، اور والدہ بھی عابدہ و پارسا خاتون تھی۔

حضرت مولانا کی دینی تعلیم بستی کے مکتب (فرقانیہ) سے شروع ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو مدرسہ ''اشرف المدارس راجاربیل'' راسیدنگ میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے متوسطہ اور ایک روایت کے مطابق جماعت سیوم تک کی تعلیم پائی، اس کے بعد اساتذۂ کرام کے مشورے اور والدین کی خواہش پر اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور سیدھے دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے جماعتِ دوم سے لے کر دورۂ حدیث تک کی تعلیم پائی، بڑے ذہین وفطین طالب علم تھے، یوں بڑے سے بڑے اساتذہ کی نیک توجہ اور ذاتی محنت کے ساتھ اللہ تعالی کی رحمت شامل حال ہوئی تو علمی اعتبار سے آپ کی لیاقت واستعداد میں چار چاند لگ گئے، اور یہاں سے بڑی امتیازی شان سے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے معا بعد آپ وطن واپس آئے، اور بوسیدنگ میں پائے جانے والے اس وقت کے مختلف مدارس میں تعلیم دیتے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں بوسیدنگ کے عین شہر میں جامعہ اسلامیہ عالیہ کی بنیاد پڑی تو ایک روایت کے مطابق حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کی دعوت پر آپ یہاں تشریف لائے، اور مرتے دم تک کے لئے یہاں کے ہو گئے، آپ نے اس درس گاہ میں ابتدائی کتابوں سے لے کر منتہی کتابوں کی تعلیم دی، اور شیخ الحدیث جیسے منصب جلیلہ پر بھی فائز رہے۔

جس طرح سطور بالا میں عرض کی گئی ہے کہ مولانا محمد ہاشم صاحب ۱۹۵۳ء میں اس محسن ادارہ میں مدرس ہو کے آئے، اور مرتے دم تک کبھی بھی اس سے الگ نہیں رہے، میری طالب علمی کے زمانے میں آپ متوسطہ کی دو کتابیں سمیت دورۂ حدیث سے صحیح بخاری جلد دوم اور صحیح مسلم جلد اول پڑھایا کرتے تھے، مولانا کی زبان نہایت صاف شفاف اور اندازِ بیان بھی بڑا شان دار تھا، اور سادگی اور سادہ

لوحی میں اپنی مثال آپ تھے، شاگردوں کو اپنی اولاد سے بڑھ کر محبت اور شفقت کرتے تھے، آپ ایک جلیل القدر عالم دین، محدث، مفسر اور فقیہ وکلامی ہونے کے ساتھ ساتھ شب زندہ دار، عابد وزاہد بزرگ تھے، کسی بھی امور میں باتوں کے بتنگڑ بنانے والوں سے آپ کو چھیڑ تھی، آپ جو بھی فرماتے، صاف الفاظ اور واضح طریقے سے فرمایا کرتے، اور غیر ضروری باتوں سے نہایت پرہیز کیا کرتے تھے۔

حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب اور حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب دونوں جامعہ اسلامیہ عالیہ کے شیخین تھے، ہمارے زمانے میں بقیہ جتنے اساتذہ تھے، تقریباً تمام کے تمام ان دونوں کے تلامذہ میں سے تھے، اساتذۂ کرام اور طلباء اول الذکر کو مفتی صاحب، جب کہ ثانی الذکر کو شیخ صاحب کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ طرہ یہ کہ ان دونوں کے درمیانی بعض امور بڑے دل چسپ ہوا کرتے تھے، اکثر دونوں مدرسے میں براجمان اور باہم شیر وشکر بنے رہتے تھے، تاہم کبھی کبھار دونوں کے مابین تھوڑی بہت نا چاقیاں بھی ہو جاتی تھیں، ایسے حالات میں دونوں دیکھے جانے کے قابل ہو جاتے تھے، لطف کی بات ہے کہ ان دونوں کے ایسے حالات میں طلباء تو کجا، بلکہ اساتذۂ کرام میں سے کوئی بھی ان دونوں کے درمیان دخل دینے کی کوشش تک نہیں کرتے تھے، وہ اس لئے کہ مدرسے کے ہر ایک اس بات سے واقف تھے کہ ابھی ان دونوں کے درمیان کچھ نا چاقی ہے تو ابھی دونوں باہم شیر وشکر بن جاتے ہیں۔ تو اس حوالے سے ایک دل چسپ واقعہ کافی ہے کہ:

> ''ایک روز دوپہر کا وقت تھا کہ دونوں شیخین کے درمیان نہ جانے کس بات پر نا چاقی ہو گئی تھی، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ دونوں اپنی اپنی لاٹھیاں اٹھائے سنبھالے ہر ایک دوسرے کو اپنی طرف بلا رہے تھے، ان کی حالتِ غضب سے لگتا تھا کہ دونوں ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے ہیں، اب شام ڈھلے کیا دیکھتے ہیں کہ شیخ صاحب مفتی صاحب کے قریب بیٹھے ہیں اور دونوں سرگوشی اور کانا پوسی کے ساتھ پان چبا رہے ہیں، ان کی یہی حالت دیکھ کر ہمارے تعجب کی انتہا ہو گئی تھی، غرض ان دونوں کے مابین کے ناطے دیکھے جانے کے قابل تھے''۔

ظاہر ہے کہ حضرت مفتی ابوالفضل صاحب جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے بانیوں میں سے ایک

ہیں، لیکن آپ ہمیشہ حضرت شیخ صاحب کو اس ادارہ کے گویا وارث اور ایک عظیم محسن ہونے کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے، اس بات کے حوالے سے بطور استشہاد حضرت مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کا ایک بیان حاضر ہے کہ:

> ''حضرت مفتی صاحب کی موجودگی میں ایک روز جامعہ اسلامیہ عالیہ کے کسی ایک منتظم سے حضرت شیخ صاحب ناراض ہوکر جامعہ چھوڑنے جارہے تھے، اور ساتھ ساتھ فرما رہے تھے کہ اب تک بہت ہوگیا، مجھے مزید یہاں رہنا گوارہ نہیں۔ تو حضرت شیخ کی یہی حالت دیکھ کر حضرت مفتی صاحب آگے بڑھتے بڑھتے فرما رہے تھے کہ: شیخو! تم اپنی جگہ پر بیٹھے رہو، یوں اپنے مدرسے کو کن اوباشوں کے سپرد کئے جارہو؟ اب حضرت مفتی صاحب کی اتنی سی بات پر شیخ صاحب خاموش ہوکر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تھے''۔

یوں تو شیخ صاحب حضرت مفتی صاحب کی طرح ہمیشہ مدرسے میں رہتے تھے، کبھی کبھار ہی گھر جایا کرتے تھے، لیکن کبھی آنے میں دیر ہوجاتی تو مفتی صاحب تڑپ کر رہ جاتے تھے، اور طلباء واساتذہ سے پوچھنے لگتے کہ کہیں شیخ صاحب بیماری میں مبتلا تو نہیں ہوگئے؟ اسی طرح مفتی صاحب کے متعلق شیخ صاحب کی بھی یہی حالت ہوتی تھی۔

غرض حضرت شیخ صاحب نے اپنی مستعار زندگی کے آخری دم تک جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں قال اللہ وقال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درس دیتے ہوئے ۱۹۸۵ء میں انتقال فرمایا، اور اپنی آبائی بستی باغکونہ کی قبرستان میں مدفون ہوئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت کی نمازِ جنازہ میں ہزاروں لوگوں نے سوگوار شرکت کی، خود راقم اور مولانا حسین احمد صاحب کو بھی اس میں شرکت کرنے کی توفیق ہوئی تھی، علاوہ ازیں اس میں علماء اور طلبائے دینی مدارس کی بھاری اکثریت دیکھی گئی تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالی اپنے خاص فضل وکرم سے حضرت شیخ کی مغفرت کے ساتھ آپ کے درجات بلند فرمائے، آمین۔

مولانا سعید اللہ صاحبؒ لمبابیلی، سیدنگی:

حضرت مولانا سعید اللہ صاحب کی پیدائش قصبۂ علی چنگ، بوسیدنگ کی بستی لمبابیل میں ہوئی، سنا ہے کہ آپ کے والد صاحب نہایت دین دار ہونے کے علاوہ بڑے علماء دوست بزرگ تھے، اور والدہ بھی بڑی نیک صفات خاتون تھی۔

مولانا کی مکتب نشینی اپنے گاؤں کے مکتب میں ہوئی، مزید پڑھنے کے قابل بنے تو اشرف المدارس راجاربیل، راسیدنگ میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے متوسطہ تک کی تعلیم پائی، اس کے بعد آپ کلکتہ گئے، اور مدرسہ عالیہ کلکتہ میں داخل ہوکر علوم اسلامیہ کی تکمیل کی۔

ہمارے علاقہ بھر میں ایک بات یہ مشہور تھی کہ کلکتہ کے دورانِ تعلیم آپ علالت میں مبتلا ہوگئے تھے، جس کی وجہ سے آپ کی پڑھائی میں کافی خلل پیدا ہوگیا تھا، راقم سطور اگرچہ آپ کا تلمیذ ہے، لیکن کبھی بھی اس حوالے سے آپ سے پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

مولانا بڑے قابل اور پائے کے عالم دین تھے، علوم اسلامیہ میں ید طولی رکھتے تھے، علاوہ اس کے آپ انگریزی زبان وادب میں خاصی مہارت بھی رکھتے تھے، ہم نے اپنے عنفوان شباب میں جہاں تک دیکھا کہ ہمارے پورے علاقے میں دو عالم دین ایسے تھے جو بیک وقت عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان وادب میں ید طولی رکھتے ہوں، ان میں سے ایک حضرت مولانا سعید اللہ صاحب، جب کہ دوسرا محدث العصر والفقیہ حضرت علامہ سلطان احمد فوئمالوی۔ ویسے علماء میں ان دونوں کی عزت تو تھی ہی، علاقے بھر کے دانش وران بھی ان دونوں کو بڑی توقیر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، میں اپنی تہی دامنی کے باوصف اس حوالے سے مزید کچھ لکھنا چاہوں تو بہت کچھ لکھ سکتا ہوں، لیکن طوالت کا خوف ہے۔

حضرت مولانا سعید اللہ صاحب کو جہاں تک دیکھا اور ان کے بیانات اور گفتگو سننے کا جہاں تک موقع ملا، ان تمام چیزوں سے اندازہ ہوا کہ آپ بڑے پائے کے عالم دین اور انگریزی زبان وادب میں مہارت رکھنے کے علاوہ بین الاقوامی سیاسی حالات اور ملک کے داخلی سیاسی نزاکت سے بخوبی آگاہی رکھنے والا انسان تھے، تو اسی وجہ سے بھی ہمارے علاقہ بھر کے سیاست سے دلچسپی رکھنے والے حضرات آپ کو ایک علم دین ہونے کے ساتھ ایک جہاں دیدہ سیاسی اور مفکر سمجھتے تھے، اس

حوالے سے ہر ایک آپ کی گفتگو کو بڑے غور سے سنتے تھے۔

علاوہ ازیں وقت کے جید سے جید ترین علماء آپ سے ڈرتے تھے، وجہ یہی تھی کہ ظاہر ہے کہ عام طور پر ہمارے اس وقت کے علمائے کرام عالمی اور داخلی سیاسیات سے اتنے واقف نہیں تھے، جتنے آپ تھے، تو سیاسیات کے موضوع پر جہاں بھی گفتگو چھڑ جاتی تھی، وہاں علمائے کرام کی آراء پر آپ کی رائے بھاری پڑ جاتی تھی، اور لوگ کہتے تھے کہ عالم ہو تو مولانا سعید اللہ صاحب جیسے، یوں علماء آپ سے دب جانے کے ڈر سے بھی آپ سے پہلو تہی کیا کرتے تھے۔

مولانا کی علوم عصریہ یعنی سائنس اور ٹکنالوجی پر بھی خاصی نظر تھی، علمائے کرام کے لئے آپ ان فنون کو سیکھنا ضروری سمجھتے تھے، اس حوالے سے میرے ایک سینئر ساتھی مولوی عبید اللہ صاحب پانچکری بیلی کا یہ بیان آج بھی جوں کا توں یاد ہے کہ:

> ''میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا، آئے دن میری حضرت مولانا سعید اللہ صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھی، ایک دن کا واقعہ تھا کہ بوسیدنگ شہر میں آپ سے ملاقات ہوگئی، تو حضرت نے مجھ سے پوچھا کہ لندن سے ریڈیائی گفتگو یہاں والے کیسے اور کس وجہ سے سن سکتے ہیں؟ تو میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ حضرت یہ تو سائنس اور ٹکنالوجی کی بات ہے، جس سے میں ناواقف ہوں، تو حضرت نے فرمایا کہ تم لوگ اسے سیکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟ تو میں نے جواب دیا کہ حضرت! اس قسم کے علوم تو ہمارے مدارس میں سکھائے نہیں جاتے، تو حضرت نے فرمایا کہ تم کہاں سے سیکھو گے، خود تمہارے اساتذہ ان علوم وفنون سے ناواقف اور بے خبر ہیں۔ آپ کی اتنی سی بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا، اور دل سے دل نے کہا کہ واقعتاً ہمارے علمائے کرام کو بھی ان علوم کا سیکھنا ضروری ہے''۔

صحت اور تن درستی کی حالت میں مولانا روز اپنی بستی سے شہر بوسیدنگ جایا کرتے تھے، صبح نو دس بجے گھر سے نکل کر پیدل بوسیدنگ پہنچا کرتے تھے، (اس زمانے میں شاید اب بھی ہو کہ مواصلات کے کوئی بھی ذرائع نہیں تھے) اور شام ہونے آتی تو آپ گھر لوٹ آتے تھے، جہاں تک میں نے دیکھا کہ بوسیدنگ شہر میں آپ کے خاصے چاہنے والے تھے، جن کو روز انتظار ہوتا تھا کہ مولانا تشریف

لائیں گے اور اپنی مفید باتوں سے مستفید کریں گے، اور جس دن آپ نہیں آتے تو لوگ سمجھتے تھے کہ آپ کو ضرور کوئی بیماری لاحق ہوگئی ہے، مرتے دم تک آپ کا یہی معمول بحال تھا، ویسے آپ آج بھی میری نظروں کے سامنے ہیں، مدبرانہ چال چلتے ہوئے آپ کو بوسیدنگ جاتے اور آتے دیکھ رہا ہوں، میں جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں پڑھتا تھا، راستے پر کہیں آپ سے ملاقات ہو جاتی تو آپ میرے ساتھ بڑی شفقت اور پیار کا مظاہرہ کرتے تھے۔

اس ضمن میں چلتے چلتے ایک بات یاد آگئی ہے کہ ۱۹۸۴ء کے دوران مولانا سعید اللہ صاحب کے بڑھاپے کا عالم تھا، دھوپ کی شدت تھی پھر بھی آپ اپنے روزانہ کے معمول کے مطابق صبح نو دس بجے پیدل بوسیدنگ جا رہے تھے، ادھر پیچھے سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب اور راقم سطور لمبا بیل سے بوسیدنگ کو نکلے (یاد رہے کہ اسی زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب بنگلا دیش سے واپس آکر اپنی بستی لمبا بیل میں مقیم تھے) دیکھتے ہیں کہ بستی لمبا بیل اور چانچکری بیل کی درمیانی سڑک پر حضرت مولانا سعید اللہ صاحب بڑھاپے کی دھیمی چال چلتے ہوئے بوسیدنگ جا رہے ہیں، ظاہر ہے کہ میں نوجوان اور حضرت مولانا حسین احمد صاحب پورے جوان تھے، ہم دونوں کی چالیں تیز تھیں، ہم آگے بڑھے تو مولانا سعید اللہ صاحب کو راستے میں پالیا، ہم دونوں آپ کے پیچھے تو ہو گئے، لیکن مولانا حسین احمد صاحب چاہتے نہیں تھے کہ آپ کو کسی بھی طرح کراس کر کے آگے نکل جائیں، ادھر آپ کو خبر نہیں تھی کہ ہم دونوں آپ کے پیچھے ہیں، ویسے کافی وقت گزر جانے کے بعد شاید ہماری آہٹ پر ہو کہ اچانک آپ پیچھے مڑے، تو ہم نے آپ کو سلام مسنون کیا، تو سلام کے جواب کے معا بعد آپ نے فرمایا کہ ''میں تو ایک بوڑھا، ضعیف اور کم زور آدمی ہوں، یوں میری چال بڑی دھیمی ہے، جب کہ تم جوان ہو، آگے نکل جاؤ، کوئی مضائقہ نہیں'' ویسے نہ چاہتے ہوئے بھی تعمیل حکم پر ہم دونوں آگے نکل گئے تھے۔ اب چلتے چلتے مولانا حسین احمد صاحب فرمانے لگے کہ: دل نے یہ تک گوارہ نہیں کیا کہ چچا جان (مولانا حسین احمد صاحب آپ کو چچا جان کہہ کر پکارا کرتے تھے) سے اجازت لوں کہ آپ کو پیچھے چھوڑ کر ہم دونوں آگے نکل جائیں، لیکن کیا کروں کہ آپ کی تعمیل حکم کی بات ہو چکی ہے۔ مجھے اس واقعہ سے بزرگوں کے ساتھ ادب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب کے ایک بلند اخلاق کا اندازہ ہوا۔

مولانا حسین احمد صاحب کے گھر اور مولانا سعید اللہ صاحب کے گھر کے مابین تھوڑا سا فاصلہ تھا۔

۱۹۸۴ء کے دوران راقم سطوران دونوں سے پڑھتا تھا،مولانا حسین احمد صاحب سے عربی اوراردوانشاء کے علاوہ علم وفکر کے حوالے سے دیگر کتابیں بھی پڑھاتے تھے،جن میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی کتاب ''روائع محمد اقبال''اورسیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب ''رسول رحمت'' ناقابلِ فراموش ہیں،اور مولانا سعیداللہ صاحب سے انگریزی ریڈرز کے ساتھ گرامر کا بھی درس لیا کرتا تھا۔ایک روز مولانا سعیداللہ صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ تم حسین احمد سے کیا پڑھتے ہو؟جواب میں میں نے مذکورہ چیزیں بتائیں،توآپ نے فرمایا کہ انشاء کی کون سی کتاب تمہارے سامنے ہوتی ہے؟تو میں نے جواب دیا کہ یہاں تو انشاء کی کوئی معیاری کتاب ملنی مشکل ہے،اس لئے مولانا اپنے طور پر اپنی یادداشت سے پڑھاتے ہیں،میرے اس جواب پرآپ پریشان ہوگئے،اورفرمایا کہ انشاء کے لئے کوئی کتاب کا ہونا بہت ضروری ہے،ورنہ فائدے مطلوبہ حد تک نہیں ہوسکتے۔

جہاں تک میری معلومات ہیں کہ مولانا سعیداللہ صاحب کے پاس کچھ خاندانی جائدادیں تھیں، جن کی آمدن سے آپ کا گزارا ہوتا تھا،سردی کے موسم میں آپ اپنے گھر کی سامنے والی زمین میں کھیتی باڑی کیا کرتے تھے،بڑھاپے کے زمانے میں بھی کبھی کبھار دن چڑھے اس میں کام کاج کرتے تھے، میں پڑھنے جاتا تو آپ اکثر کھیتی میں ملتے،مجھے دیکھتے ہی کھیتی کے بیچ میں بیٹھ جاتے،اوردورانِ درس کبھی کبھی یہی فرمایا کرتے تھے کہ پڑھنے والوں کے لئے ہرکہیں پڑھائی میسر ہوجاتی ہے،کسی خاص جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی،طلب اورتڑپ کا ہونا شرط ہے۔

مولانا بڑے آن بان اورشان کے بزرگ تھے،عبادت وبندگی گویا آپ کی طبیعتِ ثانیہ بن چکی تھی،ہرکسی کے ساتھ بڑی خوش اخلاقی سے ملتے تھے،تاہم بعض علمائے کرام کواس حوالے سے کوستے تھے کہ آپ کے نزدیک ہمارے یہاں کے علماء نہ خود پڑھائی کی طرح پڑھتے اور نہ مسلمانوں کے بچوں کو مفید اورضروری پڑھائی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ویسے بعض علماء کو بھی آپ سے یہی شکایت تھی کہ آپ علمائے کرام کے پاس لحاظ بہت کم کرتے ہیں،جس کی وجہ سے علماء کے خلاف دانش وروں کے علاوہ عوام کی زبانیں تک کھل جاتی ہیں۔

مولانا نے بھرپورعمر پائی،تقریبا اسی سال کی عمر میں ۱۹۸۷ء میں داعئ اجل کو لبیک کہا،اورخاکِ لمبابیل میں مدفون ہیں۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا میر احمد مبارک ایوب سری،منگڈویؒ:

سرزمین ارکان کے جلیل القدر عالم دین مولانا میراحمد بن مبارک علی بن امیر علی معروف بہ ناظم صاحب کی ولادتِ باسعادت ۱۹۰۶ء(۱) میں شمالی منگڈو کی بستی ایوب سر میں ہوئی،یہ بستی سعداللہ سر کے بالمقابل فورماندی کے مغرب میں مسلم بستی کی حیثیت سے صدیوں سے آباد ہے،اور یہ بستی دارالعلوم احمدیہ سعداللہ سر کی جانب مغرب تقریبا ڈیرھ کیلومیٹر پرواقع ہے،اس بستی کی آبادی چار خاندانوں پر مشتمل ہے،جن میں '' بلقیسر بافورو'' خاندان کو مولانا جیسی علمی وعملی شخصیت کی نسبت سے فخر واعتزاز حاصل ہے۔

اللہ تعالی نے مولانا میراحمد صاحب کے والد مبارک علی کو دین کی دولت کے ساتھ ساتھ بے پناہ مال ودولت سے نوازا تھا،جنہوں نے بعض روایات کے مطابق اپنے مال ودولت کو علم دین کے میدان میں صرف کیا،یوں پورے علاقے میں وہ ایک علم دوست،کریم النفس اورسخی انسان کی حیثیت سے معروف تھے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم مرحوم ماسٹر امیر علی سعداللہ سری سے پاکر متوسطہ کی تعلیم مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ اور دارالعلوم برگیابیل سے حاصل کی،اس کے بعد آپ نے اعلی دینی تعلیم کے لئے ہندوستان کا سفر کیا اوردارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا،یہاں آپ نے خاص طور پر حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ کے علاوہ حضرت مولانا اعزاز علی صاحب سے استفادہ کیا،یوں ۱۹۳۶ء میں دورۂ حدیث کا امتحان اعلی نمبرات کے ساتھ پاس کرکے سندفراغت حاصل کی،اس کے بعد دار العلوم دیوبند میں فقہ وفتاوی کے فن میں مزید پڑھا تھا۔

---

(۱) مولانا کے سن ولادت کے متعلق صدیق مکرم مولانا نورالاسلام سعیدی مقیم حال مکہ مکرمہ نے اپنے مقالہ ''حیات میر''میں مذکورہ تاریخ درج کی ہے،لیکن اگرچہ حافظ محمد صدیق صاحب نے ۱۹۱۴ء/ ۱۳۳۴ھ لکھی ہے،اس تاریخ پر خود حافظ صاحب کو بھی شبہ ہے،اس لئے میں نے مولانا نورالاسلام سعیدی صاحب کے بیان کی ترجیح دی ہے،چوں کہ مولانا سعیدی صاحب مولانا میراحمد صاحب کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے اوران کے مطابق یہ تاریخ ولادت خود مولانا مرحوم کی زبانی انہوں نے سنی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کی تعلیمی زندگی کے دوران آپ کو بڑے بڑے فضلاء کی رفاقت حاصل تھی، جن کی فہرست بڑی طویل ہے، ان میں سے بعض حضرات کا تذکرہ کہیں کہیں ملتا ہے، تاہم ارکان کے جن فضلائے کرام کی رفاقت آپ کو حاصل تھی وہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت مولانا مفتی سلطان احمد صاحب ریدوی، شیخ الحدیث ومفتی جامعہ اسلامیہ دار العلوم میانجانفور۔

۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد حسین صاحب تنگ بازاری، صدر مدرس ورئیس دار الافتاء مدرسہ تنگبازار، متوفی کراچی، پاکستان۔

۳۔ حضرت مولانا محمد سلیمان بن تراب الدین صاحب ساتکانیہ فارہ ارکان۔

۴۔ حضرت مولانا تجمل حسن صاحب نینوباساوی، والد خطیب ارکان مولانا سید عالم صاحب۔

۵۔ حضرت مولانا جلال احمد صاحب انڈانگی، والد ڈاکٹر/محب الدین عبدالسبحان واعظ۔

۶۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب، والد شیخ زاہد شاہ، کلرک رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ۔

ہماری تاریخ میں بہت سارے بزرگوں کو دیکھا گیا تھا کہ ہندوپاک سے فراغت کے بعد وطن واپس نہیں لوٹے تھے، لیکن ان کے برعکس مولانا میر احمد صاحب تعلیم سے فراغت کے بعد وطن واپس آئے، اور پوک کول نامی بستی سے تدریس کا آغاز کیا، جبھی مولانا سلطان احمد صاحب ریدوی کے ہاتھوں دار العلوم میاجانفور، منگڈو کی بنیاد پڑی آپ وہیں منتقل ہوگئے، اور اس دار کے دیگر بانیوں کی طرح آپ نے اس کی تعمیر وترقی کے لئے دن رات کو ایک کردیا تھا، آپ نے وہیں تدریسی خدمات کے ساتھ ساتھ شعبۂ افتاء کی بنیاد بھی رکھی، یوں مسلمانانِ ارکان کے روزمرہ کے دینی مسائل حل کرتے رہے، الحمد للہ یہ مدرسہ اور دار الافتاء تادم تحریر باقی اور جاری وساری ہے، اللہ کرے کہ اس کا سلسلہ درازتر رہے۔

بعد میں مولانا کو دارالعلوم میانجانفور سے سبکدوش ہونا پڑا، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''ادھر حضرت ناظم صاحبؒ طالبان علوم نبوت کو خوب سیراب کررہے تھے، اور دوسری طرف بلی بازار کے بدعتی فرقے 'میلاد النبیؐ'، تیجہ، چہلم اور صلاۃ وسلام

> بالقیام کے قائلین حضرت ناظم صاحب کو جان سے مار ڈالنے کی دھمکیاں دینے اور منصوبے بنانے میں مصروف ہوگئے تھے، تاکہ ناظم صاحب کی وجہ سے ضلالت وبدعت کی جو تاریکی ختم ہورہی تھی اس کا سلسلہ رک جائے، اور بدعتیوں کو کھلا میدان مل جائے، ناظم صاحب کے لئے روز صبح وشام اپنا گھر ''ایوب سر'' سے میانجانفور آنا جانا مشکل ہوگیا تھا، اور جان خطرے میں پڑ گئی تھی، اس لئے ناظم صاحب علماء وانتظامیہ سے مشورے کے بعد دار العلوم میانجانفور ۱۹۵۹ء میں (اگر تاریخ صحیح بھی ہو) مستعفی ہوگئے، اور اپنے علاقے ایوب سر میں ایک دینی مدرسہ کی بنیاد ڈالی، وہاں درس وتدریس کا سلسلہ پھر سے شروع کردیا، ناظم صاحبؒ نے یہاں رہ کر درس وتدریس کا کام بھی کیا اور ساتھ ہی ساتھ بدعتیوں سے مناظرہ بھی کیا، حضرتؒ کے ساتھ اکثر وبیشتر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب سعد اللہ سری (مشہور قال شفیع) ہوتے تھے، اور وہ بھی اس کار خیر میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے، چوں کہ ناظم صاحبؒ وعظ وتقریر، شیریں زبان اور قوت دلائل میں یکتائے روزگار تھے اس لئے مخالفین کے لئے سوائے راہِ فرار کے اور کوئی راستہ نہیں ہوتا تھا، چند ماہ کے بعد فتنہ پردازوں اور بدعتیوں کا قلع قمع ہوگیا تھا، یوں اللہ تعالی نے ناظم صاحب سے یہ عظیم الشان کام لیا''۔(۱)

اب ناظم صاحب کا ہر کجا ڈنکا بجنے لگا، علمائے عظام اور طالبین علوم نبوت کی زبانوں پر آپ کے تذکرے ہونے لگے تھے، تو دار العلوم سعد اللہ سر کے انتظامیہ اور سرکردہ حضرات کی نظریں آپ پر مرکوز ہوگئیں، یوں انہوں نے آپ سے رابطہ کیا اور دار العلوم احمدیہ سعد اللہ سر میں آکر تدریسی خدمات کرنے کی دعوت دی، پہلے پہلے تو مولانا نے عذر کیا تھا، لیکن ان حضرات کے شدید اصرار پر آپ کو اس درس گاہ میں آنا پڑا، مولانا نے یہاں بڑی یک سوئی کے ساتھ دورۂ حدیث تک کی تعلیم دی، اور ہزاروں طالبین علوم نبوت کو سیراب کیا تھا۔

---

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما ص: ۱۷۱۔

بعد میں دارالعلوم احمدیہ کی مجلس شوریٰ نے آپ کو ناظم اعلیٰ اور صدر المدرسین کے عہدے سونپے، آپ نے اپنے فرائض منصبی کو ایسی جانفشانی اور لگن سے ادا کیا کہ آج تک اس دور کی باتیں اور روایات اس مدرسہ کے مدرسین اور طلباء یاد کرتے پھرتے ہیں، اور آپ کے نقش قدم کو نقش دوام مانتے ہیں، جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ آپ اصول وضوابط کے بڑے پابند تھے، جان جائے تو جائے لیکن آپ اپنے اصول وضوابط سے ایک قدم بھی پیچھے ہٹنے والے نہ تھے، وہاں آپ کی قربانی، جفاکشی کے حوالے سے مولانا نورالاسلام صاحب سعیدی اپنے مقالہ ''حیاتِ میر'' میں لکھتے ہیں کہ:

> '' حضرت مولانا جامعہ اسلامیہ سعداللہ سر میں تقریبا پینتیس سال تک تدریسی خدمات کے علاوہ دیگر انتظامی امور انجام دیتے رہے تھے، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور ان کی جد وجہد اور شبانہ وروز کی بے لوث قربانیوں کی وجہ سے جامعہ علمی اور تعمیراتی ترقیوں کے مختلف مراحل طے کئے تھے، خود میں نے اپنے دور طالب علمی میں مولانا کا مستقل اور پسندیدہ مشغلہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، کہ انہی جب بھی تدریس ومطالعہ سے فرصت ملتی تو پھاوڑا ہاتھ لئے جامعہ کے احاطے کی صفائی اور چھوٹے چھوٹے تعمیراتی کام میں مشغول ہوجاتے، مدرسہ کی مشرقی جانب واقع تالاب کو بجھا کر شاندار جدید درسگاہ اور دارالطلبہ کی تعمیرات اور شمالی جانب واقع درسگاہ اور دارالطلبہ کی تجدید مولانا کے زمانے میں پایۂ تکمیل کو پہنچی، مجلس شوریٰ سے منظوری لے کر دورۂ حدیث شریف کی افتتاح کے لئے دارالحدیث کا قیام بھی آپ ہی کی نگرانی میں عمل میں آیا تھا، نیز آپ نے دور دراز کے علاقوں سے حصول علم کے لئے آنے والے ضرورت مند طالبین کی خورد ونوش کا مستقل انتظام کرتے ہوئے مطبخ بھی کھول دیا تھا''۔

مولانا میر احمد صاحب سے ہزاروں تشنگان علم نبوت نے سیرابی حاصل کی، جن میں سے بعض حضرات میدان عمل وتطبیق، دعوت وتجدید واحیاء، تبلیغ وارشاد اور درس وتدریس کے بڑے بڑے شہ سوار بنے، مختلف جامعات کے شیخ الحدیث، ناظم، مہتمم بھی بنے، مختلف منظمات کے عہدۂ صدارت پر فائز بھی ہوئے ہیں، ان تمام کا تذکرہ یہاں تو سر دست ممکن نہیں، تاہم چند حضرات گرامی کا اجمالی

تذکرے یہاں حاضرِ خدمت ہیں:

۱۔ مولانا محمد ادریس بن عبد الرشیدؒ: (جن کا تذکرہ اس کاوش کی زینت بنا ہوا ہے) آپ کو اس جامعہ کے مہتمم ہونے کی وجہ سے مہتمم صاحب کے نام سے یاد کرتے ہیں، اگرچہ آپ ایک منتظم بزرگ تھے، لیکن آپ کی شہرت جنوبی چاٹگام سے لے کر ارکان برما تک ایک مرشدِ کامل اور داعی برحق ہونے کی حیثیت سے تھی اور اب بھی ہے، آپ کا نام ایک عظیم عالم دین، داعی واعظ ہونے کی وجہ سے سرزمین ارکان اور برما میں دینی اور روحانی حلقوں میں بڑی اہمیت کے ساتھ لیا جاتا ہے، آپ کے دورِ اہتمام کو جامعہ احمدیہ کی تاریخ کا سنہرا دور مانا جاتا ہے، دینی اور علمی حلقوں میں آپ کی ذات وشخصیت کو ایک مثالی ذات وشخصیت مانا جاتا ہے، آپ کی شخصیت بڑی جاذبِ نظر اور دل کش شخصیت تھی، راقم کو آپ کی محفل میں بیٹھنے اور پند ونصیحت سننے کی سعادت حاصل ہے۔

۲۔خطیب ارکان مولانا سعید عالم بن مولانا تجمل حسین صاحب نینو باساوی: آپ بھی مولانا میر احمد صاحب کے شاگرد ہیں، موصوف زمانۂ طالب علمی سے بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کرتے رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو فصاحت وبلاغت کی نعمت سے نوازا، اپنے خاص انداز خطابت سے سامعین کے دلوں کو مسحور کرنے کی صلاحیات عطا فرمائیں، مولانا موصوف کو حضرت مولانا محمد ادریس صاحب نے اپنے انتقال سے پہلے جامعہ احمدیہ کا نائب مقرر کیا تھا، قدرت نے مولانا سعید عالم صاحب کو پند ونصیحت کے ملکہ کے ساتھ درس وتدریس کی بھی بے پناہ لیاقت عطا کی، مولانا آج کل کوکس بازار کے علاقے میں رہائش پذیر ہیں۔

۳۔ مولانا احمد حسین صاحب تولاتولوی: مولانا ایک بڑے پائے کے عالم دین ہیں آپ دارالعلوم احمدیہ سعداللہ سر کے شیخ الحدیث تھے، بڑے بزرگ اور نامور عالم دین ہیں۔

۴۔مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری: مولانا مظاہری بھی میری اس حقیر کاوش کی ایک علیحدہ عنوان کے تحت زینت بنے ہوئے ہیں، آپ بڑی شان وشوکت کے حامل عالم دین تھے، جمعیت علمائے ارکان کے صدر رہ چکے تھے، کراچی میں آپ عرصۂ دراز تک کونسلر رہ چکے تھے، بڑے مبصر قائد اور رہنمائے قوم تھے، آپ نے کراچی میں انتقال فرمایا۔

۵۔مولانا عقیل احمد صاحب قاسمی: آپ بڑے پائے کے عالم دین اور مجاہد فی سبیل اللہ تھے، مفکر اور

قوم کے رہنما بھی، جمعیت علمائے ارکان کے صدر تھے، آپ نے اپنی عملی زندگی کو قوم کی خدمات میں گزار دیا تھا، آپ کا تذکرہ بھی میری اس کاوش کی زینت بنا ہوا ہے، اللہ تعالی آپ کی مغفرت فرمائے۔

۶۔مولانا سعید عالم صاحب ریدوی: مولانا جامعہ اسلامیہ میانجا نفور کے مہتمم بڑے پائے کے عالم دین اور مرشد وواعظ تھے، آپ نے بنگلا دیش میں داعی اجل کو لبیک کہا، نہلا میں مدفون ہیں۔

۷۔مولانا سلامت اللہ صاحب کومیر خالوی: سابق مدرس جامعہ احمدیہ سعد اللہ سر۔

۸۔مولانا عبدالسلام رائمنگ خالوی: سابق مدرس جامعہ احمدیہ سعد اللہ سر۔

۹۔مولانا صدیق احمد بن ابوالخیر صاحب: سابق شیخ الحدیث و مہتمم جامعہ احمدیہ سعد اللہ سر۔

۱۰۔مولانا نور عالم صاحب سالی فرانگی: سابق مدرس دارالعلوم میانجا نفور، متوفی جدہ۔

۱۱۔مولانا محمد قاسم بن حسن علی مرحوم: سابق مدرس جامعہ احمدیہ سعد اللہ سر۔

۱۲۔مولانا خیر الامین بن ماسٹر روح الامین لمبا گونوی: مدرس دارالعلوم ناظر فارہ اکیاب، مدرس اعلی جامعہ خلیلیہ موسی کالونی کراچی، ومدرس اعلی مدرسہ عثمانیہ رصیفہ، مکۃ مکرمہ۔

۱۳۔مولانا ابواحمد صاحب نائن چنگی: سابق شیخ الحدیث دارالعلوم میانجا نفور۔

۱۴۔مولانا مفتی عبدالشکور صاحب گارڈ بیلی: استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ دارالسنۃ نہلا، کوکس بازار۔

۱۵۔مولانا فخر الحسن والد مولانا درویش علی صاحب تولاتولوی: ۱۹۷۸ء میں ہجرت کے دوران مگھ غنڈوں اور برمی دہشت گردوں نے آپ کی داڑھی مبارک کو آگ سے جلا دیا تھا۔

۱۶۔مولانا محمد لقمان صاحب لنڈوسری: استاذ جامعہ احمدیہ سعد اللہ سر۔

۱۷۔مولانا عبدالمعبود صاحب ہاتھی فاروی: والد مولانا عبدالقدوس مجاہد۔

۱۸ مولانا عبدالرحمن بن عبدالسبحان صاحب ہاتھی فاروی: استاذ وناظم مطبخ جامعہ احمدیہ سعد اللہ سر۔

۱۹۔مولانا شبیر احمد صاحب رنگابالوی: مصنف مآرب الطلبہ ودیگر کتب کثیرہ۔

۲۰۔مولانا احمد صاحب گارڈ بیلی: مقیم حال کراچی، پاکستان۔

۲۱۔مولانا نور الحق صاحب لنڈوسری۔

۲۲۔مولانا حافظ جمال الدین احمد صاحب نائن چنگی: والد مرحوم راقم سطور، متوفی ۲۰۰۸ء۔

۲۳۔مولانا شمس الاسلام صاحب: مہتمم مدرسہ اسلامیہ برمی کالونی پاکستان۔

۲۴۔مولانا رحمۃ اللہ صاحب سابق مہتمم مدرسہ اشرفیہ برمی کالونی، کراچی، پاکستان۔

۲۵۔مولانا زاہد حسین صاحب: سابق مہتمم مدرسہ حسینیہ برمی کالونی، کراچی، پاکستان۔

۲۶۔مولانا عنایت الرحمن والد مولانا نثار احمد صاحب۔

۲۷۔مولانا کرامت علی صاحب: سابق استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ دارالسنۃ نہلا، کوکس بازار۔

۲۸۔مولانا مجیب الرحمن بن حاجی احمد الرحمن صاحب نکھوروی: مقیم حال کوکس بازار۔

۲۹۔مولانا حسین احمد صاحب: استاذ مدرسہ ربانیہ اورنگی ٹاؤن، کراچی، پاکستان۔

۳۰۔مولانا نور الاسلام صاحب معروف بہ بلی حضور: فاضل خیر المدارس ملتان، پاکستان، استاذ الحدیث جامعہ اسلامیہ دارالسنۃ نہلا، کوکس بازار۔

۳۱۔مولانا نور احمد صاحب: سابق استاذ الحدیث دارالعلوم میانجا نفور۔

مولانا سعید الحق صاحب مہتمم مدرسہ ابی ذر الاسلامیہ، کراچی، پاکستان۔

۳۲۔مولانا نور عالم بن حاجی سعید احمد صاحب: جیمنگ خالوی: فاضل مدرسہ ضمیریہ پٹیہ، وشیخ الحدیث۔

۳۳۔مولانا شمس العالم صاحب نائسا فوروی: رفیق درس مولانا محمد تقی عثمانی: مقیم عباس نگر، کورنگی ٹاؤن کراچی، پاکستان۔

کہتے ہیں کہ مولانا میر احمد صاحب کا درس علمائے دیوبند کے طرز کا تھا، تقریر مختصر لیکن انتہائی جامع وشامل اور پر مغز ہوا کرتی تھی، طلباء سوال کرتے تو آپ کا جواب مختصر مگر جامع ہوا کرتا تھا، اس وجہ سے طلباء آپ کی تقریر وتشریح کو بہت پسند کرتے تھے۔

۱۹۷۷ء کی ہجرت کے دوران مولانا میر احمد صاحب نہایت پریشان تھے، آپ کی آنکھوں کے سامنے ارکانی مسلمان ہجرت کر کے بنگلا دیش پہنچ رہے تھے، ویسے آپ نے اپنے وطن کی زمین کو خود کے لئے تنگ پایا تو ہجرت کر کے بنگلا دیش میں پناہ لی، اس کے بعد کچھ دن کے لئے متحدہ عرب امارات گئے ہوئے تھے۔

یاد رہے کہ ۱۹۷۷ء میں بنگلا دیش کے بعض سرکردہ علماء اور مہاجر کیمپوں میں پناہ گزین بعض

علمائے کرام نے ایک انجمن بنام ''خلافت کمیٹی'' کی بنیاد رکھی تھی، جس کا مرکزی صدر حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی تھے، متحدہ عرب امارات کو جانے سے پہلے اس کمیٹی میں مولانا میر احمد صاحب بھی شامل تھے، اس کمیٹی کی مجلس عاملہ کے ارکانی اراکین یہ ہیں:

۱۔مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی۔

۲۔مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری۔

۳۔مولانا محمد زکریا بن مولانا محمد شفیع صاحب کواربیلی۔

۴۔مولانا ماسٹر نذیر احمد صاحب۔

۵۔مولانا محمد ادریس صاحب سابق مہتمم جامعہ احمدیہ سعد اللہ سر۔

۶۔مولانا نجم الدین صاحب نلبنوی، سابق مہتمم مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ۔

۷۔مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب سنبنوی۔

مولانا میر احمد صاحب ۱۹۷۸ء میں پھر بنگلا دیش واپس آئے، اور خلافت کمیٹی کے زیر سائے ملت وقوم کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، ایک طرف آپ مہاجرین کی مختلف خدمات پر اترے تو دوسری طرف جامعہ اسلامیہ دارالسنۃ نہلا میں رہ کر تفسیر وحدیث کی کتابیں پڑھائیں، مولانا نے اس دوران علاقۂ کوکس بازار کے مختلف مہاجر کیمپوں میں روہنگیا مسلمانوں کی مصیبت وآلام کے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو آپ خون کے آنسو روئے تھے، اس دوران آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ اپنی اس مظلوم اور بے بس قوم کے لئے کچھ کرنا ضرور ہے، اس حوالے سے صدیق محترم مولانا نور الاسلام سعیدی صاحب اپنے مقالہ ''حیات میر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''آپ کے ۱۹۷۸ء میں جامعہ اسلامیہ دارالسنۃ نہلا میں شیخ الحدیث اور صدر دار الافتاء کی حیثیت سے فرائض کی انجام دہی کے دوران مسلمانان ارکان کی زندگی میں ایک ہولناک سانحہ رونما ہوا، تقریباً ساڑھے تین لاکھ روہنگیا مسلمانوں کو برمی حکومت نے بنگلا دیش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اس کی بنیادی وجہ جیسا کہ پوری دنیا کو معلوم ہے کہ اس ظالم حکومت نے قومی دستاویزات کی تلاش کے بہانے سے ہزاروں کی تعداد میں برمی فوجیوں کو مسلمانوں کی آبادی میں داخل کر دیا

تھا، جن کے مظالم کی وجہ سے مسلمان اپنے ملک کو چھوڑ کر پڑوسی ملک بنگلا دیش کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے تھے، ایسے دلدوز اور جاں شکن حالات نے مولانا میر احمد صاحب کو تڑپا کے رکھ دیا تھا، آپ ارکانی مسلمانوں کے اس کس مپرسی کے عالم میں بنفس نفیس اٹھ کھڑے ہوئے، اور روہنگیا جمعیت علماء کے اہم اراکین جن میں مولانا عبدالقدوس صاحب مظاہری، اور مولانا عقیل احمد صاحب قاسمی ناقابل فراموش ہیں کو ساتھ لے کر مہاجر کیمپوں کا دورہ کیا، اور ہر ایک مہاجر کیمپ میں قرآن کریم اور علوم اسلامیہ کی تعلیم کے لئے فرقانیہ اور مدرسے قائم کر دیئے، نیز روہنگیا جمعیت علماء کی پلٹ فارم سے پوری دنیا کو عموماً اور عالم اسلام کو خصوصاً تحریری طور پر مسلمانان ارکان کی حالت زار سے مطلع کیا، آپ کی نگرانی میں جمعیت علماء کی پلٹ فارم سے روہنگیا مسلمانو کی حالت زار سے دنیا کو عموماً اور عالم اسلامی کو خصوصاً واقف کرانے کے لئے مختلف وفود بھیجنے کا فیصلہ بھی کیا تھا، اس سلسلے میں مولانا عبدالقدوس مظاہری اور مولانا عقیل احمد قاسمی کو سعودی عرب بھیجا گیا، جنہوں نے رابطۃ العالم الاسلامی کے سکریٹری جنرل جناب محمد علی حرکان سے ملاقات کی اور ان کے سامنے ایک یادداشت بھی پیش کی تھی، ان کا دورہ اتنا مفید اور بارآور ثابت ہوا کہ رابطہ نے فوری طور پر روہنگیا مسلمانوں کی حالت زار سے مزید آگاہی حاصل کرنے کے لئے خود محمد علی الحرکان کی زیر قیادت ایک وفد بنگلا دیش بھیجا تھا''۔

مولانا نور الاسلام سعیدی صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

''محمد علی الحرکان کی زیر قیادت آنے والے اس وفد کی رپورٹ سامنے آنے کے بعد رابطۃ نے مالی تعاون کے علاوہ مہاجرین کے علاج ومعالجہ کے لئے ہر ایک کیمپ میں ایک ایک کر کے تقریباً پینتیس ڈسپنسریاں قائم کیں، اور مریچہ پالنگ کے علاقے میں یک بڑا ہسپتال بھی قائم کر دیا، علاوہ ازیں سعودی حکومت نے اپنے سفارت خانہ ڈھاکہ کے توسط سے دل کھول کر تعاون کیا، اللہ تعالی اس وقت کے سعودی سفیر جناب فواد عبدالحمید الخطیب اور رابطۃ کے ارباب بست وکشاد کو

> جزائے خیر دے، علاوہ ازیں مولانا میر احمد صاحب اور مولانا عبد القدوس مظاہری کی نگرانی میں بنگلا دیش کے دارالحکومت ڈھاکہ میں متعین اسلامی ملکوں کے سفارت خانے سے رابطہ قائم کر کے مہاجر کیمپ میں قائم شدہ تمام مدارس و مکاتب کی ضروریات پوری کرنے کے پروگرام بنائے، اور اسے عملی جامہ بھی پہنایا تھا''۔

۱۹۷۸ء میں خطیب اعظم حضرت مولانا صدیق احمد صاحب نے مسلمانان ارکان کو برمی ظالم حکومت کے پنجے سے نکالنے کے لئے مسلم ممالک کے سفارت خانوں سے اعلی سطحی مذاکرات کئے تھے، یہ مذاکرات ایک روایت کے مطابق اس لئے بار آور ثابت ہو رہے تھے کہ آپ کے پیچھے بنگلا دیشی حکومت کے اعلی حکام اس حوالے سے کام کر رہے تھے، خطیب اعظم صاحب نے روہنگیا مسلمانوں کی انقلابی اور سیاسی جماعتوں کو جن میں روہنگیا فدائین محاذ (RPF) اور روہنگیا جمعیت علماء پیش پیش تھیں کو ایک ہی پلیٹ فارم میں جمع کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، اس سلسلے میں ایک سے زیادہ اجلاس بھی کئے تھے، لیکن آپ کو ناکامی کا چہرہ دیکھنا پڑا تھا۔

مولانا میر احمد صاحب ایک باکمال عالم دین تھے، جنہوں نے درس وتدریس کے ساتھ ہی ساتھ قوم کے جوانوں اور نوجوانوں کو اسلامی اصول کے تحت سیاست و قیادت کرنا سکھایا تھا، آپ نے اپنے تلامذہ اور متعلقین کو ایسی راہ دکھائی کہ جس پر چل کر اگرچہ منزل کتنی دور بھی ہو بڑی قلیل مدت میں وہاں پہنچنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔

۱۹۸۸ء میں ایک طرف مولانا میر احمد صاحب دبی سے بنگلا دیش پہنچنے کے بعد ایک بڑے منصوبہ کی سوچ میں مگن تھے، تو دوسری طرف مولانا عبد القدوس مجاہد ہاتھی فاروی (امیر حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان) ایک ایسے عالم دین کی تلاش میں تھے جو روہنگیا قوم کو عملی راستے دکھانے کے قابل ہوں، ویسے ان کی نظر مولانا میر احمد صاحب کی ذات وشخصیت پر پڑی، انہوں نے مولانا سے رابطہ کیا اور آپ کو کراچی تشریف لے جانے کی دعوت دی، تاکہ حرکۃ الجہاد الاسلامی کی سرپرستی کے ساتھ ارکانی مسلمانوں کی نجات کی راہ پر ایک پلان تیار کرنے کے حوالے سے کام کیا جاسکے، لیکن اس دعوت کے بعد مولانا میر احمد صاحب کراچی جانے کے بجائے دبی پہنچے اور مولانا عبد القدوس صاحب سے رابطے کر کے کہا کہ وہ مولانا سیف اللہ اختر (امیر حرکت الجہاد الاسلامی العالمی) سمیت

فوراً دبی پہنچے، ان سے ضروری ملاقات اور گفتگو کے بعد دبی میں آپ نے حرکت کا ایک برانچ قائم کر دیا، اور ساتھ ساتھ حرکت کی ایک مرکزی مجلس قائم کی گئی، جس کے اراکین یہ ہیں:

۱۔مولانا میر احمد مبارک: امیر۔
۲۔مولانا عبد القدوس صاحب مجاہد: نائب امیر۔
۳۔مولانا حبیب اللہ تاج صاحب: رکن۔
۴۔حاجی محمد شفیع صاحب کچھر بیلوی: رکن۔
۵۔حاجی شبیر احمد صاحب: رکن۔
۶۔حاجی تاج الملوک صاحب رواسوگری: رکن۔
۷۔مولوی نور الامین صاحب کومیر خالوی: رکن۔

عرب امارات میں باہمی مشورے سے طے پایا تھا کہ مولانا میر احمد صاحب پاکستان کے سفر کر کے وہاں مستقبل کے لائحۂ عمل تیار کریں گے، ویسے ۲۹/جون/ ۱۹۸۸ء میں آپ کی قیادت میں ایک وفد کراچی پہنچا، مدرسہ اشرفیہ حقانیہ میں اس وفد کا پرتپاک استقبال ہوا تھا، مولانا عبد القدوس مجاہد نے اس وفد کی آمد کی اغراض و مقاصد سنائے، اس جلسہ میں مولانا نور الحسن صاحب تلبٹنوی، مولانا رحمت اللہ صاحب مہتمم مدرسہ اشرفیہ حقانیہ، حاجی محمد رفیق عرف ابو طالب، جماعت اسلامی کا رکن مولانا صالح احمد اور مولانا منیر الزمان وغیرہ شریک تھے۔

مولانا میر احمد صاحب نے ایک ہفتہ کراچی میں قیام کرنے کے بعد افغانستان کی راہ لی، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب ''مشاہیر ارکان'' ص: ۱۲۲ تا ۱۲۳ میں لکھتے ہیں کہ:

> ''حضرت ناظم صاحبؒ صرف ایک ہفتہ کراچی میں گزار کر افغانستان جانے کے لئے تیار ہو گئے تھے، آپ کی معیت میں لگ بھگ پندرہ افراد بھی تھے، جن میں قائدِ قافلہ مولانا عبد القدوس مجاہد، حاجی محمد رفیق عرب ابو طالب وغیرہ بھی تھے، اور دبی سے آمدہ افراد بھی اس میں شریک تھے، جب کہ مولانا نور محمد عبد الشکور کچھر بیلوی صاحب بھی اس دوران سعودی عرب سے کراچی پہنچ گئے تھے، اور قافلہ اواخر ذوالقعدہ ۱۴۰۸ھ/ اوائل جولائی/ ۱۹۸۸ء میں کراچی سے روانہ ہوا، ڈیرہ

اسماعیل خان، دانا، وزیرستان، بگڑ اور انگور اڈہ (پاکستان کی آخری سرحد) ہوتا ہوا ارگون پہنچا، جہاں حرکت انقلاب اسلامی کے امیر جناب شیخ ارسلان رحمانی سے ملاقات ہوئی، اور ارکان برما کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہوا، ایک ہفتہ کے بعد قافلہ کی واپسی ہوئی، اور قافلہ کے کچھ افراد مولانا حبیب البشر، مولانا عبد القدوس مجاہد جناب ماسٹر محمد سلطان اور حضرت ناظم صاحبؒ وغیرہ پشاور آئے، تا کہ وہاں موجود عرب حضرات اور قائدین سے ملاقات ہو سکے، یہاں قاری سیف اللہ اختر صاحب اور شیخ نور محمد صاحب پہلے ہی سے موجود تھے، پشاور پہنچ کر حضرت ناظم صاحبؒ نے اتحاد اسلامی افغانستان کے امیر استاد عبد الرسول سیاف، عرب لیڈر جن میں ابو القاسم اور شیخ ابو عادل سے ملاقاتیں کیں، انہوں نے مشورے دیئے اور ارکان کے مسئلہ پر مکمل مدد کی یقین دہانی کی، اس کے بعد قافلہ پشاور میں مقیم مولانا نور الاسلام بن لقمان حکیم (مبعوث رابطہ عالم اسلامی گرک خالوی کے گھر گیا، مولانا نے خوب مہمان نوازی کی، اس کے بعد قالہ کراچی پہنچ گیا، اس پورے سفر کے رہنما اور محرک اعلی مولانا عبد القدوس مجاہد تھے، اواخر جولائی ر ۱۹۸۸ء میں حضرت ناظم صاحب دبئی تشریف لے گئے تھے''۔(۱)

فروری ۱۹۸۸ء کو مولانا عبد القدوس مجاہد پشاور پہنچے، جہاں انہوں نے العون الاسلامی العالمی کے عرب لیڈران جن میں شیخ عبد اللہ عزام شہید اور تمیم عدنانی سے ملاقاتیں کرتے ہوئے ان حضرات کو کراچی برمی کالونی آنے کی دعوت دی، چونکہ مولانا عبد القدوس مجاہد کے در پردہ مولانا میر احمد مبارک کے علاوہ قاری مولانا سیف اختر اور مولانا ارسلانان رحمانی تھے، تو ان حضرات عرب مجاہدین نے مولانا عبد القدوس کی دعوت کو قبول کیا تھا، یاد رہے کہ ادھر مولانا عبد القدوس کے ساتھ ان حضرات کے مذاکرات ابھی جاری تھے، ادھر رابطۃ الطلاب المسلمین کے لیڈروں نے ان عربوں سے عبد القدوس کے خلاف یہی شکایت کی تھی کہ عبد القدوس علم وفن سے نا آشنا اور نوعمر ہیں، اور ساتھ ساتھ عظیم

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق مشاہیر ارکان برما،ص: ۱۲۲-۱۲۲-

اتحاد بین الروہانجیین کے مخالف بھی، اس لئے عربوں کو چاہئے کہ ان کی جماعت سے دور رہیں، چونکہ مولانا عبد القدوس بھی ایک عیار اور ہشیار مجاہد تھے، انہوں نے مولانا میر احمد مبارک، مولانا ارسلان رحمانی اور قاری سیف اللہ اختر کو اپنا حامی دکھا کر ان حضرات کو برمی کالونی آنے کی دعوت قبول کرائی تھی۔

۱۴ رفروری ر ۱۹۸۸ء کو برمی کالونی کراچی میں ان عرب لیڈروں کے شاندار استقبال کرتے ہوئے ایک جلسہ بھی منعقد کرایا گیا، جس میں شیخ عبد اللہ عزام شہید، شیخ تمیم عدنانی، قاری سیف اللہ اختر اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے امیر مولانا خالد زہیر شہید نے خطاب کیا تھا، حضرت مولانا میر احمد صاحب کی سرپرستی اور عرب لیڈروں کی تائید اور تعاون کی وجہ سے حرکۃ الجہاد الاسلامی کا بہت بڑا فائدہ ہوا، اس کے بعد ارکانی نوجوانوں اور جوانوں کے علاوہ سنجیدہ اور کارآمد افراد حرکۃ الجہاد الاسلامی میں جوق درجوق شامل ہونے لگے تھے۔

۲۰ رفروری ر ۱۹۸۸ء کو حرکۃ الجہاد الاسلامی نے ایک معاون کمیٹی کی تشکیل عمل میں لائی، جس میں درج ذیل حضرات شامل تھے:

۱۔ سوداگر امیر حسین صاحب۔
۲۔ حاجی محمد رفیق عرف ابوطالب صاحب (ناظم نشر واشاعت)
۳۔ حاجی سید اکبر صاحب۔
۴۔ حاجی عبد الحق صاحب۔
۵۔ مولانا منیر الزمان صاحب رحمہ اللہ (امیر کمیٹی)
۶۔ حاجی عبد الغفار صاحب۔
۷۔ حاجی شریف احمد صاحب۔
۸۔ حاجی احمد سعید رحمہ اللہ۔
۹۔ جناب مامون الرشید بن حاجی ابو الحسین منگڈوی۔

۱۰ حاجی حسین علی صاحب۔

۱۱۔حاجی حسن علی صاحب۔

۱۲۔مولانا نجم الحق مہتمم مدرسہ قرآنیہ برمی کالونی (نائب کمیٹی)

۱۳۔مولانا حنیف فاروقی مہتمم دارالعلوم انصاریہ برمی کالونی (سکریٹری جنرل)

مذکورہ کمیٹی کے قیام کے بعد حضرت مولانا میر احمد مبارک کے علاوہ حرکت کے بعد حساس افراد نے سوچا کہ جہادی پروگراموں کے علاوہ دیگر سیاسی امور کی انجام دہی کے لئے ایک مرکزی کمیٹی بھی قائم ہونی چاہئے، تاکہ پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے میں آسانی ہو، ویسے ۱۲/ اگست/ ۱۹۸۸ء کو ''لجنۃ المرکزیہ'' کے نام سے اور ایک کمیٹی کی تشکیل ہوئی، جس کے ممبران کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔مولانا عبدالقدوس مجاہد۔

۲۔مولانا عبدالحمید مجاہد۔

۳۔ نورالاسلام انصاری، اکیابی۔

۴۔مولانا احمد حسین۔

۵۔مستری محمد اسلام جماکاٹا۔

۶۔مولانا دلدار حسین۔

۷۔سوداگر امیر حسین۔

۸۔مولانا ابوالحسین۔

۹ مولانا نورالبصیر۔

وقت کے ساتھ ساتھ تنظیم میں افرادی قوت بڑھتی جارہی تھی، جس طرح اوپر عرض کی گئی کہ تنظیم میں سنجیدہ افراد شامل ہونے لگے تھے۔ لیکن کچھ دن گزرتے نہ گزرتے اس میں سنجیدہ لوگوں کے تہ بتہ ایسے افراد بھی شامل ہو چکے، جن کا شیوہ تنقید برائے تنقید نہیں صرف بلکہ تنقید برائے انتشار، اختلاف اور برائے افتراق تھا، یوں مذکورہ چند کمیٹیاں قائم ہوتے ہی اختلافات اور افتراق کی

آگ بھڑک اٹھی، اس لئے حضرت مولانا کو دبی سے کراچی آنا پڑا تھا، چنانچہ حضرت مولانا ۳/نومبر/ ۱۹۸۸ء کو دبی سے کراچی تشریف لائے تھے۔

مولانا نے کراچی پہنچتے ہی ایک اجلاس بلایا، طویل گفتگو اور پیہم جدوجہد کے بعد آپ نے ایک ہدایت نامہ جاری کیا، بعد ازاں ۲۰/دسمبر/ ۱۹۸۸ء کو اور ایک جلسہ منعقد کیا گیا، جس میں پاکستان برانچ کی سابقہ مجلس شوری کو کالعدم کر کے از سرنو اور ایک مجلس شوری کی تشکیل دی گئی تھی، جس میں درج ذیل حضرات پاکستان برانچ کی شوری کے اراکین مقرر ہوئے:

(۱) مولانا عبدالقدوس مجاہد صاحب، (امیر)

(۲) مولانا عبدالحمید مجاہد صاحب، (نائب امیر)

مولانا نجم الحق صاحب، رکن۔

مولانا محمد انور صاحب، رکن۔

ماسٹر شبیر احمد صاحب، رکن۔

حاجی سعید احمد صاحب، رکن۔

سوداگر امیر حسین صاحب، رکن۔

مولانا ابواسامہ جیمنگ خالوی صاحب، رکن۔

مولانا عبدالرحمن مجاہد صاحب، رکن۔

مولانا نورالبصیر صاحب، رکن۔

حافظ مولانا دالدار حسین صاحب، رکن۔

پاکستان میں مذکور مجلس شوری کے قیام کے بعد حضرت مولانا نے اور ایک فیصلہ سنایا کہ چند افراد پر مشتمل ایک وفد عرب امارات ہوتے ہوئے سعودی عرب کا دورہ کرے، تاکہ وہاں پائے جانے والے روہنگیا عوام، علماء اور دانشوروں کو جہاد اسلامی طرف دعوت دے کر میدان کار میں اتارا جا سکے، خاص طور پر علماء اور دانشوروں کی ذہن سازی کی جائے، تاکہ جہاد اسلامی کی قیادت سنبھالنے میں دشواری نہ ہو، اس کے بعد آپ نے اپنے چند متعلقین، محبین اور شاگردوں کو لئے

پاکستان کے چند چوٹی کے علمائے کرام جن میں مولانا سلیم اللہ خان، مفتی محمد رفیع عثمانی قابل ذکر ہیں سے ملاقاتیں کیں، ان سے اگلے ہونے والے ارکانی جہاد کے حوالے سے طویل مذاکرات کئے، بعدازاں اواخر دسمبر/ ۱۹۸۸ء کو آپ عرب امارات چلے گئے تھے۔

مولانا کے سابقہ فرمان کے مطابق اوائل جنوری/ ۱۹۸۹ء کو حضرت مولانا الحاج عبدالقدوس مظاہری اور مولانا عبدالقدوس مجاہد کراچی سے دبی پہنچے، پھر حضرت مولانا میر احمد صاحب مبارک نے دبی سے اور تین افراد الحاج محمد شفیع، الحاج تاج محمد اور مسٹر علی احمد تاج کو وفد میں شامل کرتے ہوئے بذات خود اس وفد کی قیادت کی، اور چھ افراد پر مشتمل یہ وفد ۲۲/جنوری/ ۱۹۸۹ء کو سعودی عرب پہنچا، وہاں آپ نے جہاد کے متعلق روہنگیا عوام اور علماء اور دانشوروں کی ذہن سازی کی، اور جہاد کے لئے چندے جمع کروائے، اس سفر میں آپ نے حضرت مولانا جلال احمد، مولانا اسماعیل، حاجی امان اللہ قربان الصائغ سے تبادلہ خیال کیا، پھر سرزمین حجاز میں اور ایک فیصلہ کیا کہ حرکۃ الجہاد کا ایک وفد جتنی بھی جلدی ممکن ہو سکے بنگلا دیش پہنچے، تاکہ وہاں کی فضا اسلامی جہاد کے لئے ہموار کی جا سکے، اور دل کی بات تو اللہ معلوم، البتہ قرائن سے پتہ چلا کہ حضرت مولانا نے بذاتِ خود قیادت کرتے ہوئے میدان کارزار میں اترنے کی خواہش کی تھی۔

بہرحال بنگلا دیش پہنچنے سے پہلے آپ کو یہ احساس دامنگیر ہوا کہ حرکۃ الجہاد کے چنداں کمیٹیاں بننے کی وجہ سے خود تنظیم کے اندر اور عوام الناس کے درمیان بھی اختیارات کے حوالے سے غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، چنانچہ حضرت نے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ اختیارات کے حوالے سے ہونے والی افراتفری کے پیش نظر لجنۃ المرکزیہ کے ساتھ معاون کمیٹی اور جہاد کمیٹی کو کالعدم کر دیا جائے، یوں آپ نے ۲۰/فروری/ ۱۹۸۹ء کو مذکورہ کمیٹیوں کو کالعدم قرار دیتے ہوئے فرمان جاری کر دیا کہ تمام کارکنان اللہ کی راہ میں بے لوث اور بغیر کسی بھی عہدے کے کام کریں۔

پھر مشورے کے بعد بات طے پائی کہ حضرت مولانا سمیت سات افراد پر مشتمل ایک اور وفد بنگلا دیش کا دورہ کرے، چنانچہ ۳/ مارچ/ ۱۹۸۹ء کو ایک وفد بنگلہ دیش پہنچا، جس میں درج ذیل حضرات شامل تھے:

حضرت مولانا میر احمد مبارک صاحب۔

حضرت مولانا عبدالقدوس مظاہری صاحب۔

مولانا عبدالقدوس مجاہد صاحب۔

مولانا حبیب اللہ تاج صاحب۔

حاجی محمد شفیع صاحب۔

حاجی شبیر احمد صاحب۔

مولانا نورالعالم صاحب مقیم حال کیلو ۱۴۔

مولانا میر احمد مبارک صاحب نے بنگلا دیش پہنچتے ہی وہاں کے بڑے بڑے علمائے کرام اور نامور مشائخ عظام سے ملاقاتیں کیں، ان سے ارکان کے حوالے سے تبادلہ خیال کیا، جن میں حضرت مولانا احمد اللہ صاحب معروف بہ حافظ جی حضور (خلیفہ ومجاز بیعت حکیم الامت مجدد ملت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ) حضرت مولانا محمد یونس عبدالجبار صاحب (مہتمم مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ) حضرت مولانا احمد شفیع صاحب مہتمم دارالعلوم معین الاسلام ہاٹہزاری (مجاز بیعت حضرت مولانا حسین احمد مدنی) حضرت مولانا عبیدالحق صاحب (خطیب جامع مسجد بیت المکرم ڈھاکہ) حضرت مولانا محمد سلطان ذوق ندوی صاحب (مدیر جامعہ دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام) حضرت مولانا مفتی اظہار الاسلام صاحب (مہتمم جامعۃ العلوم لال خان بازار چاٹگام) حضرت مولانا نور الحق ارمان صاحب (نائب صدر نظام اسلامی پارٹی بنگلا دیش) ناقابل فراموش ہیں۔ آپ نے ان حضرات علمائے کرام ومشائخ عظام کو مسئلہ ارکان کی طرف توجہ دلائی، اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے تعاون پر انہیں آمادہ کیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنے دست مبارک سے مسئلۂ ارکان کے حوالے سے ایک استفتاء کی ترتیب دی، جسے دارالعلوم دیوبند کے علاوہ دیگر چند بڑے بڑے دارالافتاء کی طرف ارسال کر دیا گیا تھا، اس استفتاء میں آپ نے ارکانی مسلمانوں کی حالت زار اور برمی وحشیوں کے مظالم اور درندگی پر خاصی روشنی ڈالی، اور استفتاء کیا کہ ایسی حالت میں آیا یہاں کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ ویسے ۱۹۸۹ء میں جامعہ فاروقیہ کراچی اور ازہر الہند دارالعلوم دیوبند کی طرف سے مسئلۂ ارکان پر فتوی جاری ہو گیا تھا، اس کے بعد حضرت مولانا میر

احمد صاحب نے اپنی برادری کے چند نامور علماء سے کاکس بازار کے علاقے میں تفصیلی گفتگو اور ملاقاتیں کیں، اور انہیں جہاد اسلامی کا فریضہ یاد دلایا، اس سلسلے میں آپ نے چند اجلاس بھی منعقد کرائے، یہاں جو آپ نے برادری کے جن قابل قدر علماء سے گفتگو اور ملاقاتیں کیں ان میں:

مولانا محمود الحسن صاحب گارڈ بیلوی۔

مولانا مفتی عبد الشکور صاحب محدث مدرسہ دار السنۃ نہلا۔

مولانا کرامت علی صاحب محدث مدرسہ دار السنۃ نہلا۔

مولانا نور الاسلام مدرس مدرسہ دار السنۃ نہلا۔

مولانا نو العالم صاحب۔

قابل ذکر ہیں، ان اجلاس میں تمام علماء اور شرکاء نے مشورہ دیا کہ سر دست فاتار باری (جنوبی کاکس بازار) کے مقام پر ایک تربیت گاہ بنائی جائے، جہاں جوانوں اور نوجوانوں کی عسکری تربیت ہو سکے، اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب اپنی تالیف میں رقم طراز ہیں کہ:

> ''اس دورے میں ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ لگ بھگ پانچ مہینے بنگلا دیش میں رہے، بنگلا دیش میں رہ کر عوام الناس کی ذہن سازی کی، علماء سے ملاقاتیں کیں، اور فاتار باری (یہ کاکس بازار میں واقع ہے) میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے نام سے ایک معسکر قائم کیا، جس کے قریب مدرسہ احیاء السنہ'' نامی مدرسہ تھا، جہاں کے مہتمم مولانا حسین احمد بن حسن حضور تھے، معسکر میں لگ بھگ تین سو مجاہدین تھے، معسکر کے لئے مولانا کرامت علی صاحب نے ایک اسلحہ دیا، جس کا افتتاح فائرنگ کر کے خود انہوں نے کیا، مدرسہ احیاء السنہ میں موقوف علیہ تک درجات رکھے گئے تھے، جہاں حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ سورۃ الانفال اور سورۃ التوبہ کا درس دیتے تھے، اور مولوی عقیل صاحب شیل کھالوی فاضل مدرسہ ضمیریہ پٹیہ وصدر جمعیۃ العلماء ارکان و مولوی دل محمد ناظم مدرسہ ہذا صاحبان بھی پڑھاتے تھے''(۱)

---

(۱) مولانا محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص: ۱۳۰۔

باوجودیکہ یہاں معسکر بنانے کے حوالے سے حضرت مولانا میر احمد مبارک مشورے کے دوران مخالف تھے، پھر بھی اکثریت کے فیصلے کا احترام کرتے ہوئے اس تربیت گاہ کے قیام کے سلسلے میں آپ نے مہینوں جانفشانی کی تھی، اور جن حضرات نے اس تربیت گاہ کے قیام کے لئے اصرار کیا تھا، سارے کے سارے فیصلے کے بعد اپنے اپنے گھر تشریف لے گئے تھے، اور مولانا کو قسما تنہائی اور کس مپرسی کے عالم میں جدوجہد کرنی پڑی تھی، مولانا بھی پتے کے انسان تھے کہ آپ نے اس کے قیام کے لئے دن رات کو ایک کر دیا تھا، اور اپنی برادری کے مالی تعاون سے اسے ایک خاص مکتب فکر بنا دیا تھا، ویسے مہینو کی جدوجہد کے بعد آپ اگست / ۱۹۸۹ء کو دبی تشریف لے گئے تھے۔

یہاں افسوس اور صد افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ حضرت کی واپسی کے بعد بعض ناسمت شناس ذمے داروں کے تساہل اور نااہلی کی وجہ سے یہ مکتب فکر بند ہو گیا، اسی سفر کے دوران مولانا کو یہ سن کر بہت افسوس ہوا کہ ۱۸ / اپریل / ۱۹۸۹ء بموافق رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ کو مولوی محمد حنیف راغب کے چھوٹے سے معسکر پر جناب نور الاسلام صاحب کی قیادت پر چلنے والی اس وقت کی تنظیم ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) نے حملہ کر دیا ہے۔

۱۴ / جون / ۱۹۸۹ء میں حرکۃ الجہاد الاسلامی العالمی کے رہنما حضرت مولانا قاری سیف اللہ اختر نے ایک فیصلہ دیا کہ حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان کی مرکزی مجلس شوری بنگلا دیش میں ہوگی، اور جس میں پاکستان برانچ کے درج ذیل افراد بھی شامل ہوں گے:

۱۔ مولانا عبد القدوس مجاہد صاحب۔

۲۔ مولانا عبد الحمید مجاہد صاحب۔

۳۔ مولانا نور البصیر صاحب۔

۴۔ مولانا احمد حسین صاحب۔

۵۔ مولانا نجم الحق صاحب۔

۶۔ مولانا محمد انور صاحب۔

۷۔مولانا سراج الاسلام صاحب۔

۸۔مولانا نور الاسلام انصاری، اکیابی صاحب۔

۹۔مولانا محمد ہاشم صاحب۔

۱۰۔حاجی شبیر احمد صاحب۔

۱۱۔مولانا حسین احمد صاحب۔

۱۲۔مولانا عبد الرحمن صاحب۔

۱۳۔سوداگر امیر حسین صاحب۔

۱۴۔مولانا امان اللہ صاحب۔

۱۵۔مولانا سلطان الاسلام صاحب۔

۱۶۔مولانا عبد الرحمن مجاہد صاحب۔

چنانچہ ۲۴/ستمبر/۱۹۸۹ء میں مولانا قاری سیف اللہ اختر صاحب بشمول عبد القدوس مجاہد اور چند افراد بنگلا دیش پہنچے، اس دورے میں مولانا سیف اللہ اختر صاحب نے حرکۃ الجہاد الاسلامی بنگلا دیش کے نام سے بنگلہ دیشی حضرات پر مشتمل ایک علیحدہ جماعت کی تشکیل دی تھی، جبکہ اس سے پہلے برما اور بنگلا دیش کے تمام حرکت کی طرف منسوب مجاہدین عبد القدوس مجاہد کی قیادت میں کام کر رہے تھے۔ مذکورہ تاریخ کے ایک روز بعد قاری صاحب پاکستان چلے گئے، جبکہ مولانا عبد القدوس مجاہد ۲۴/فروری/۱۹۸۹ء کو ارکان بنگلا دیش کے دورے کے بعد کراچی پہنچے تو ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔

یاد رہے کہ مولانا قاری سیف اللہ اختر صاحب کئی دفعہ ارکان اور بنگلا دیش کے دورے پر آ چکے تھے، اس سلسلے کا اور ایک دورہ جنوری/۱۹۹۰ء میں بھی کیا تھا، اس سفر کے دوران اتحاد المجاہدین اور حرکۃ الجہاد الاسلامی کے درمیان مکمل انضمام کے سلسلے میں بات چیت ہوئی تھی، جس کا نتیجہ آگے چل کر جنود الاسلام کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ قاری صاحب اس دورے کے اختتام پر ۱۹/اپریل/۱۹۹۰ء میں کراچی واپس پہنچے، اس کے بعد حضرت مولانا میر احمد مبارک کے حکم پر مولانا عبد القدوس مجاہد اور مولانا عبد الحمید مجاہد ۱۰/جنوری/۱۹۹۰ء میں ڈھاکہ پہنچے، لیکن ۲/اپریل/۱۹۹۰ء کو کراچی واپس چلے گئے تھے۔

حضرت مولانا میر احمد صاحب اکتوبر/۱۹۹۱ء میں دبی سے کراچی پہنچے، اس سفر کا مقصد یہی تھا کہ یہاں پہنچ کر عملی جہاد کے حوالے سے کوئی فیصلہ کن اقدامات کئے جاسکیں۔ کراچی پہنچے تو یہ جان کر ان کے دل کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ مجاہدین کا ایک قافلہ ۲/اگست/۱۹۹۱ء میں افغانستان پہنچ چکا ہے، مولانا میر احمد صاحب نے اس بار کراچی پہنچ کر حالات کا بھرپور جائزہ لیا، اور کراچی میں حرکت الجہاد کے موجودہ اراکین سے مشورہ کرتے ہوئے یہ فیصلہ صادر کیا کہ مولانا عبد الحمید مجاہد اور مولانا نور الاسلام انصاری اور جلال احمد بنگلا دیش پہنچے، تاکہ وہاں عملی اقدامات کئے جاسکیں، اس فیصلے کے بعد مولانا دسمبر/۱۹۹۱ء میں واپس دبی تشریف لے گئے، اور مذکور جن حضرات کو بنگلا دیش پہنچنا تھا وہ سارے کے سارے ۴/جنوری/۱۹۹۲ء تک بنگلہ دیش پہنچ گئے تھے۔

۳۰/جنوری/۱۹۹۲ء کی رات روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن کے اسی مسلح افراد نے حرکۃ الجہاد الاسلامی کے معسکر (جو خالد بن ولید کے نام سے کروپ فاتا زیری میں واقع تھا) پر حملہ کر دیا، وہاں حرکت کے تیس افراد موجود تھے، جن میں مولوی عبد الحمید مجاہد، مولوی نور الاسلام انصاری اور حافظ محمد الیاس کی خاصی پٹائی کی گئی تھی، ان حملہ آوروں نے واپس جاتے وقت حرکت کے تمام اسلحہ جات اور ساز و سامان اٹھا کر لے گئے تھے، اس واقعہ کے بعد حرکۃ الجہاد کے مجاہدین نے دولہازارا آرمی دفتر جا کر ارایس او والوں کی شکایت کی تو فوجی افسر نے کہا کہ ارایس او والے اگلے تین روز بعد یہاں آئیں گے، آپ حضرات بھی آجائیں، ویسے وقت مقررہ پر دونوں جماعت کے لوگ آئے اور پروفیسر محمد زکریا صاحب نے صلح کی پیش کش کی تو اگلے چند دن کے بعد دونوں جماعتوں کے لیڈران کاکس بازار کے ایک ہوٹل میں حاضر ہوئے، لیکن اس جلسہ میں شکوے شکایتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو پایا، اور صلح کی جو توقع تھی وہ نہ ہو سکی تھی۔

ایک طرف روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن کے ساتھ حرکۃ الجہاد الاسلامی کی سرکشی اور دونوں جماعتوں کے مابین سوئے تفاہم، پھر ۱۹۹۲ء کے جنوری کے اواخر سے خود تنظیم کے اندر افراتفری جاری تو دوسری طرف فروری/۱۹۹۲ کی ابتدا سے اور ایک واقعہ پیش آیا کہ حضرت مولانا میر احمد مبارک عرب امارات میں مقیم تھے، اچانک بنگلا دیش میں مقیم تنظیم کے اعلیٰ کارکنوں اور بعض دل جلے حضرات نے مولانا کو ٹیلیفون پر ٹیلیفون کرنا

شروع کردیا تھا، جس میں کہا جارہا تھا کہ حضرت کا بنگلادیش تشریف لانا بہت ضروری ہے، وہ اس لئے کہ بعض اہل خیر عرب حضرت چاہتے ہیں کہ مجاہدین کی ایک متحدہ پلیٹ فارم ہو، جہاں تک ان کے اخراجات کا سوال ہے، انہیں پورے کرنے کے لئے وہ حضرات حاضر ہیں، ان ٹیلیفونک رابطے اور تفصیلات سے آپ مطمئن ہوسکے تو اواخر مارچ/ ۱۹۹۲ء میں آپ دہلی سے بنگلہ دیش تشریف لائے، یاد رہے کہ آپ کی آمد سے چند روز قبل حرکۃ الجہاد الاسلامی کے مرکزی امیر مولانا عبد القدوس مجاہد بھی بنگلادیش آچکے تھے، حضرت مولانا بنگلہ دیش پہنچ کر چند نامور علمائے ارکان کو کام کے حوالے سے بڑے فعال دیکھے تو بڑے خوش ہوئے، آپ نے ان عرب اہل خیر حضرات سے کام کے حوالے سے گفتگو کی، جس کی کچھ تفصیلات مولانا محمد صدیق کے قلم سے ملاحظہ فرمائیں:

> ’’ان دنوں عرب حضرات بنگلہ دیش آئے ہوئے تھے، اور ارکانی مہاجرین کی مدد کے ساتھ ارکانی جماعتوں (خصوصاً علماء کی جماعتوں) کو متحد کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے، اس سلسلے میں عربوں نے حرکۃ الجہاد کے افراد کو دعوت دی کہ وہ رابطہ ہسپتال کاکس بازار میں آئیں، اور تبادلۂ خیال کریں، چنانچہ حضرت صاحبؒ (مولانا میر احمد مبارک) مولوی عبد القدوس مجاہد، شیخ نور محمد وغیرہ رابطہ ہسپتال پہنچے، اس وقت وہاں دکتور شیخ عبد الباقی الشریفی، شیخ عبد السلام اور مولوی صلاح الاسلام موجود تھے، عربوں نے کہا کہ اگر دونوں جماعتیں متحد ہوجائیں تو اسلحہ، گاڑیاں اور جملہ ساز وسامان مہیا کردیں گے، فی الحال ایک لاکھ بیس ہزار ٹاکے لے لو، ہم ایک ہزار افراد کی خوراک بھی مہیا کردیں گے، اس کے بعد ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رفقاء کے ساتھ ۲۹/ مارچ/ ۱۹۹۲ء کو کاکس بازار میں اقوام متحدہ کی ریلیف کمیٹی کے اراکین سے ملاقات کی اور تبادلۂ خیال فرمایا‘‘(۱)

شاید عربوں نے حرکۃ الجہاد الاسلامی کی طرح مولانا محمد حنیف راغب صاحب کی جماعت اتحاد المجاہدین کو بھی اس طرح پیش کش کی ہوگی، بہرحال دونوں جماعتوں نے اپنے رفقاء اور معاونین وارا

---

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۱۳۶۔

کین سے مشورے کئے اور حضرت مولانا میر احمد مبارک کی زیر صدارت علماء کا ایک اجلاس بلایا گیا، جس میں دس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، البتہ یہ کمیٹی ایک عارضی کمیٹی تھی، حضرت مولانا اس کمیٹی کے سرپرست اعلی (مگر بلا اختیار) تھے اور مولانا محمد حنیف راغب عبوری صدر برائے مرکزی کمیٹی تھے۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ مولانا سعید عالم بن مولانا تجمل حسین، مولانا صلاح الاسلام بن حافظ ضیاء الحق نظامی سمیت اور چند قابل قدر علماء اس کمیٹی کے اراکین منتخب ہوئے تھے، اس حوالے سے مزید کچھ تفصیلات مولانا حافظ محمد صدیق صاحب سے سنیے کہ:

> ’’بہرحال عربوں کی اس پیش کش کے بعد ہر جماعت کے افراد مشورے میں لگ گئے، بالآخر دس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، اور حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کمیٹی کے سربراہ اور سرپرست (بلا اختیار) مقرر ہوئے، کمیٹی کے افراد یہ تھے: مولانا محمد حنیف راغب امیر (بانی اتحاد المجاہدین) مولانا عبد القدوس مجاہد نائب امیر (بانی حرکۃ الجہاد) مولانا عبد الحمید امیر الحرب (از حرکت) مولانا سلیم بن اسلم محمد ہاشم دمبادی نائب امیر الحرب (از حرکت) مولانا محبت علی رحمۃ اللہ علیہ (جن کا انتقال ۲۰۰۱ء میں ہوا، موصوف جید عالم دین تھے، داڑھی بہت کم ہی تھی، ۱۹۸۲ء کے لگ بھگ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں استاد تھے، بعد میں بنگلہ دیش کی طرف ہجرت کی اور مولانا راغب کے دست راست رہے، (از اتحاد) ڈاکٹر محمد رفیق ومولوی سید حسین (از اتحاد) ومولانا سعید عالم نینو باساوالے (خطیب ارکان) وشیخ نور محمد (از حرکت) اس اتحاد وانضمام کا نام جنود الاسلام رکھا گیا تھا، یہ مئی/ ۱۹۹۲ء کی بات ہے‘‘۔(۱)

یاد رہے کہ مذکورہ عارضی اتحاد جو آگے چل کر مستقل ہونے کے لئے چند شرائط بھی درج تھیں، جنہیں حافظ محمد صدیق صاحب نے اپنی کتاب میں درج کردیا ہے:

---

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۱۳۶۔

"یہ عارضی اتحاد مستقل ہونے کے لئے چند شرائط تھیں، جو درج ذیل ہیں:(الف) یہ عارضی اتحاد بطور آزمایش صرف تین مہینے کے لئے ہے، تین مہینے کے بعد مستقل مجلس شوری و عاملہ کا چناؤ ہوگا۔(ب) فی الحال اس کا دائرۂ کار کاکس بازار تک محدود ہوگا۔(ج) مستقل مجلس شوری بننے تک عارضی مجلس شوری باہم مشورے سے کام کرے گی"۔(۲)

حافظ محمد صدیق صاحب کے مطابق مذکورہ جنود الاسلام نامی تنظیم کی بنیاد کی چند وجوبات اور اسباب تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی تالیف میں چند اسباب تحریر کیے ہیں، جو یہ ہیں:

"علماء کے مذکورہ دونوں جماعتوں کا اتحاد بھی چند اسباب کے تحت تھا (الف) دونوں جماعتوں کے معسکروں پر مخالف جماعتوں کے حملے ہو چکے تھے، اور ان کے ساز و سامان لوٹ چکے تھے، ۱۸/اپریل/ ۱۹۸۹ء ۱۲/رمضان المبارک ۱۴۰۹ھ میں مولانا محمد حنیف راغب کے معسکر پر نور الاسلام گروپ نے حملہ کیا اور ۳۰/جنوری/ ۱۹۹۲ء میں حرکت کے معسکر پر RSO کا حملہ ہوا، اس لئے یہ دونوں جماعتیں کمزور ہوگئی تھیں۔(ب) مولانا عبد الحمید نے مولانا محمد حنیف راغب سے خفیہ ملاقاتیں کر کے (حرکت والوں) کو یہ دھمکی دی تھی کہ اگر مولوی عبد القدوس اتحاد نہ کریں تو میں (مولوی عبد الحمید) اپنے رفقاء سمیت اتحاد المجاہدین میں شامل ہو جاؤں گا (ج) عربوں نے صراحت کر دی تھی کہ ہماری امداد اتحاد کی صورت میں جاری رہے گی ورنہ بند ہو جائے گی۔(د) مولانا صلاح الاسلام اس اتحاد کے محرک اعلی تھے۔(ھ) دونوں جماعتوں کی مجلس شوری اور امیروں نے اپنے اختیارات ناظم صاحب (حضرت مولانا میر احمد مبارک) کو سپرد کر دیا تھا، اس لئے اتحاد کے اختیارات حضرت ناظم صاحبؒ کے پاس آ چکے تھے"۔(۲)

(۱) مولانا حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۱۳۶۔

(۲) حافظ مولانا محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۱۳۷۔

جنود الاسلام کے قیام کے بعد ان عرب محسنین نے دل کھول کر ایک بڑی مسجد بنا دی، اور جنود الاسلام کے معسکر کے قریب مجاہدین کے لئے مکانات بنائے گئے، معسکر تک آمد و رفت کے لئے راستے بنائے گئے، نہروں پر پل بنا دیا گیا، چلنے پھرنے کے لئے گاڑیاں دی گئیں، معسکر کے قریب یتیم خانے قائم کئے گئے، کاکس بازار میں تنظیم کے لئے ایک مکان برائے دفتر کرایا پر لیا گیا، اسی طرح اور بھی تعاون اس اتحاد کو ملتا تھا، حتی کہ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ مجاہدین کی ایک بڑی تعداد اسی تنظیم کی تربیت سے تیار ہو چکی تھی، ایک روایت کے مطابق تیار شدہ مجاہدین کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ ہوگئی تھی، لیکن اتنے کچھ ہونے کے باوجود جنود الاسلام کا شیرازہ بکھر کر منتشر کیوں ہوگیا تھا اس حوالے سے مولانا حافظ محمد صدیق صاحب سے سنیے کہ:

"چند اسباب ہیں: (الف) انصاری صاحب کے بقول اتحاد کے کچھ دنوں بعد عربوں (طارق سودانی وغیرہ) نے مولانا راغب کو ڈھاکہ بلایا اور دو چیک دیئے، ایک جنود الاسلام کے لئے، اور ایک عربوں کے دفتر کے لئے۔ لیکن بقول راغب یہ دونوں چیک راستے میں گم ہوگئے، اس سانحہ کی وجہ سے سب حضرات مولانا راغب سے بدظن ہو گئے (ب) عارضی مدت (تین ماہ) ختم ہوتے ہی مولانا راغب نے تنظیم کے دائرۂ کار کو کاکس بازار سے باہر بلکہ بیرون ملک تک بڑھا دیا، جو معاہدہ کی خلاف ورزی تھی، اور انہوں نے شخصی نام پر تصدیق لینی شروع کر دی۔(ج) دو ماہ کے اندر عربوں کی امداد رک گئی تھی، یوں یہ اتحاد کامیابی کا مرحلہ طے نہ کر سکا"۔(۱)

گہرا جائزہ لینا شروع کر دیا، ادھر مولانا راغب صاحب بھی جنود الاسلام سے بدظن ہو چکے تھے، یوں چند جنود الاسلام کے قیام کے بعد حضرت مولانا میر احمد مبارک جولائی/ ۱۹۹۲ء کو دبی چلے گئے، اور ساتھ ہی ساتھ چند دن کے بعد مولوی عبد القدوس مجاہد بھی کراچی چلے گئے تھے، اب موخر الذکر نے اس سلسلے میں ۲/نومبر/ ۱۹۹۲ء میں کراچی برمی کالونی میں اپنے ہم نواؤں کا ایک اجلاس منعقد کیا،

(۱) حافظ محمد صدیق، مشاہیر ارکان برما، ص:۱۳۸۔

حالات کا دن جاتے نہ جاتے مولوی عبدالقدوس نے حرکتہ الجہاد کو دوبارہ زندہ کرنا شروع کر دیا، انہوں اور حرکتہ الجہاد کی دوبارہ تشکیل نو کر دی۔

اس واقعہ کے بعد جنود الاسلام تو بھاڑ میں چلی گئی اور حرکتہ الجہاد الاسلامی میں بھی دراڑے پیدا ہو گئے۔ مولانا عبدالقدوس مجاہد نے جب کراچی میں حرکتہ الجہاد الاسلامی کو کراچی میں فروغ دینا شروع کیا تو سعودی عرب میں مقیم حرکتہ الجہاد کے بعض اہم ساتھیوں نے مجاہد صاحب کی کھل کر مخالفت کی، مولانا نور الاسلام سعیدی اور ان کے بعض ہم نواؤں نے یہ طے کیا کہ انہوں نے حرکتہ الجہاد کے لئے وصول شدہ جمیع رقوم روک لیں، جس کی وجہ سے مولانا سعیدی اور مجاہد صاحب کے درمیان رسہ کشی شروع ہو گئی تھی، حتی کہ ان دونوں کا یہ معاملہ رابطہ العالم الاسلامی مکہ مکرمہ کے صدر دفتر تک پہنچ گیا تھا، جہاں تک پتہ چلا کہ مولانا میر احمد مبارک کا جھکاؤ مولانا سعیدی اور ان کے ہم نواؤں کی طرف تھا۔ بہر حال آپ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر ۲۰/مارچ/ ۱۹۹۲ء میں دبی سے ایک حکم نامہ جاری کیا، جس میں مولانا سعید الحق بن قادر حسین اور مولانا ظفر احمد آزاد کو جنود الاسلام کی طرف سے پاکستان کا مندوب قرار دیا گیا تھا۔

مولانا میر احمد مبارک کا مذکورہ حکم نامہ سامنے آنے کے بعد اپریل/ ۱۹۹۳ء میں ایک اجلاس سے حرکتہ الجہاد الاسلامی کے پاکستانی ساتھیوں جن کی قیادت مولانا عبدالقدوس مجاہد کرتے تھے نے حضرت مولانا میر احمد مبارک کی سرپرستی اور جنود الاسلام سے علیحدگی کا باضابطہ اعلان کر دیا۔ چنانچہ ۲۸/ستمبر/ ۱۹۹۴ء کو کاکس بازار بنگلہ دیش میں ایک اجلاس منعقد ہوا، جس میں حرکتہ الجہاد الاسلامی (عبدالقدوس گروپ) کی مجلس شوری کا چناؤ ہوا، جس میں منتخب شدہ افراد کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔مولانا عبدالقدوس مجاہد (امیر حرکتہ الجہاد الاسلامی)
۔مولانا شیخ نور محمد (نائب امیر)
۳۔مولانا سعید عالم خطیب ارکان (ناظم اعلی)
۴۔مولانا مفتی عبدالشکور گارڈ بیلی (ناظم برائے امور نشر واشاعت)
۵۔مولانا سلیم شیر کوہ بلوچی (امیر الحرب)
۶۔مولانا محمد اسحاق، شیخ الحدیث دار السنۃ نہلا، (ناظم امور مالیات)

اس طرح ستمبر/ ۱۹۹۴ء کو حرکتہ الجہاد الاسلامی کے مرکزی شوری کا اور ایک اجلاس کاکس بازار میں منعقد ہوا تھا، جس میں درج ذیل حضرات نے شرکت کی:

۱۔مولانا محمود الحسن صاحب۔
۲۔مولانا نور الاسلام صاحب مروف بہ بلی حضور، استاد مدرسہ دار السنۃ نہلا۔
۳۔حافظ حسین احمد صاحب۔
۴۔مولانا عبدالقدوس مجاہد صاحب۔
۵۔مولانا سراج الاسلام صاحب۔
۶۔مولانا ضیاء الحکیم صاحب فاضل دار العلوم دیوبند و داماد حضرت مولانا میر احمد مبارک۔
۷۔مولانا شیر کوہ صاحب۔
۸۔مولانا کرامت علی صاحب، استاد مدرسہ دار السنۃ نہلا۔
۹۔مولانا احمد حسین صاحب۔
۱۰۔مولانا شیخ نور محمد عباسی صاحب۔

ان مذکورہ تمام حضرات نے بالاتفاق حرکتہ الجہاد کو جنود الاسلام سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ صادر کر دیا۔ اس فیصلہ کے صادر ہونے کے بعد جنود الاسلام نامی اتحاد تو ختم ہو ہی گیا، جبکہ حضرت مولانا میر احمد مبارک کا تعلق حرکتہ الجہاد اور مولوی عبدالقدوس سے بھی تقریبا منقطع ہو چکا تھا، اس کے بعد حضرت مولانا کا میلان ورجحان عبدالحمید مجاہد اور مولانا نور الاسلام سعیدی، مولوی سعید الحق وغیرہ کی بنا کردہ نئی تنظیم روہنگیا اسلامی محاذ کی طرف ہو گیا۔ اور حضرت نے علی الاعلان عبدالقدوس مجاہد کی جماعت سے علیحدہ ہو کر روہنگیا اسلامی محاذ کا تعاون کرنا شروع کر دیا تھا۔

یاد رہے کہ مولانا عبدالقدوس مجاہد اور مولانا عبدالحمید مجاہد کے درمیان جب افراتفری شروع ہوئی تو مولانا نے ان دونوں کے درمیان شروع ہونے والی رسہ کشی کو ختم کرنے کے لئے بنگلا دیش جانا ضروری سمجھا تھا، انہیں ان دنوں بعض ساتھیوں نے مشورہ دیا تھا کہ بنگلا دیش جانے سے پہلے آپ کو کراچی ضرور پہنچنا چاہئے، وہ اس لئے کہ متحدہ مرکز کے دو اہم ذمے داران اختلاف کی مصیبت میں پھنس کر علیحدہ علیحدہ

تنظیم بنانے پر تلے ہوئے ہیں، بنگلہ دیش پہنچنے سے قبل آپ کو ان دونوں کو ایک جگہ پر جمع کرنا ضروری ہے، ورنہ بنگلا دیش کا سفر بے سود نکلے گا، مولانا کو ان کا یہ مشورہ پسند آیا تھا، یوں چند دن کے بعد آپ کراچی پہنچ گئے تھے، کراچی میں آپ نے ایک غیر جانب دار میزبان کے یہاں قیام فرمایا تھا، اور دونوں جانب کے اہم کارکنوں سے اس اختلاف کو ختم کرنے کے سلسلے میں اہم گفتگو کی تھی، اس کے بعد برادری کے نامور علماء اور دانشوروں سے تبادلۂ خیال بھی کیا تھا، اس دوران آپ پر شدید بیماری لاحق ہوگئی، اور بیماری کی شدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ آپ بنگلا دیش کے سفر سے معذور ہو گئے۔

ادھر بنگلا دیش میں مقیم تنظیم کے ذمے داران آپ کی آمد کے انتظار میں تھے، کہ آپ آئیں گے اور اختلافات کو مٹا کر ایک جامع اور اصولی پروگرام کارکنوں کو دیں گے، مگر جوں جوں دن گزرتا گیا، آپ کی جسمانی کمزوری بڑھتی ہی گئی، اس کی وجہ سے آپ کو بنگلا دیش کا سفر ملتوی کرنا پڑا، اور معمولی افاقہ ہوا تو شارجہ واپس چلے گئے، اور کارکنوں کا وہی اختلاف آگے چل کر افتراق کی شکل میں دو علیحدہ جماعت کا روپ دھارا، اور مولانا میر احمد نے دیکھا کہ عبدالقدوس کے مقابلے میں عبدالحمید مجاہد کو تعاون کرنا ضروری ہے، تو آپ نے موخر الذکر کو تعاون کرنا شروع کر دیا تھا۔

مولانا عبدالحمید مجاہد اور ان کے ہم نواؤں نے آپ سے درخواست کی کہ آپ ان کی سرپرستی کریں، آپ نے منظوری دی تو اس جماعت کے اعلی کارکنوں نے پھر یہ درخوست کی کہ آپ سعودی عرب کا سفر کریں، اور دوران سفر تنظیم کے اعلی ذمے داروں کو بھی ساتھ رکھیں۔ مولانا نے ان کی خواہش پر لبیک کہتے ہوئے سعودی عرب کا دورہ فرمایا، وہاں آپ نے حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی، مولانا دین محمد ناجو، مولانا حافظ سلطان الاسلام، مولانا محمد الیاس فاضل دارالعلوم دیوبند، ڈاکٹر محب الدین عبد السبحان واعظ وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ اور ایک قومی دعوتی کمیٹی کی تشکیل دی، لیکن بعض ناقابل بیان وجوہات کی بنیاد پر اس کمیٹی کو کالعدم کر دیا گیا، کیوں کہ حالات بہت نازک تھے، ایسے حالات میں ایک جامع کونسل کی تشکیل خطرہ سے خالی نہیں، اس لئے اس جماعت کے اگلے پروگرام کو ملتوی کر دیا گیا تھا، تاہم بعد میں معلوم ہوا کہ مولانا اس کمیٹی کے التوا کے فیصلے سے متفق نہ تھے، اس کے بعد مولانا نے دوبارہ کوشش شروع کر دی کہ کسی بھی طریقہ سے مولانا عبدالقدوس مجاہد اور مولانا عبدالحمید

مجاہد کے درمیان مفاہمت پیدا کر دے، لیکن مولانا کی تمام تر کوششیں اب کی بار بھی رائگاں گئیں، اور آخر کار دونوں کے درمیان مفاہمت نہ ہوسکی، یاد رہے کہ جب مولانا حجاز مقدس پہنچے تو حرکۃ الجہاد کے بعض کارکنوں نے بھی مولانا کی اس کوشش کا ساتھ دیا تھا، مولانا کے اس سفر میں ایک کام یہ ہوا کہ مولانا عبدالقدوس مجاہد اور ان کے ہمنواؤں نے مولانا نورالاسلام سعیدی پر اتہامات کی جو بارش برسائی تھی مولانا میر احمد صاحب نے ان کا ازالہ فرما دیا، اس حوالے سے آپ نے رابطہ کے اس وقت کے سکریٹری جنزل ڈاکٹر احمد محمد علی سے بھی ملاقات کی تھی، بعدازاں آپ نے مولانا نورالاسلام سعیدی اور آپ کے رفیق سفر مولانا قاری حبیب البشر صاحب کی ہمراہ حج کا ارادہ فرمایا، اور حج ادا کیا، جو آپ کی زندگی کا آخری حج ثابت ہوا۔

مولانا میر احمد صاحب نے کوئی تصنیف نہیں کی، آپ کی پوری زندگی درس وتدریس، قومی وملی خدمات کے میدان گزر گئی، تاہم آپ کے بعض مضامین اور کچھ مختصر رسائل سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ایک صاحب قلم بزرگ تھے، لیکن تصنیف وتالیف کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں کر سکی، روہنگیا زبان میں چند صفحات پر مشتمل آپ کے مناجاتی ایک قصیدہ ملا ہے۔

مولانا میر احمد صاحب حضرت مولانا مفتی عزیز الحق صاحب بانی مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ (مجاز بیعت حضرت مولانا ضمیر الدینؒ) کے مرید تھے، مجاز بیعت تھے کہ نہیں اس کا باقاعدہ کوئی پتہ نہیں چلا، تاہم خاص خاص موقعوں پر آپ نے لوگوں سے بیعت بھی لی تھی۔ شاید آپ مجاز بیعت تھے، ورنہ بیعت کا سلسلہ کیسے جاری کیا تھا؟

مولاانا میر احمد صاحب بڑے کریم النفس، خوش اخلاق اور شریف النفس انسان تھے، اس حوالے سے مولانا نورالاسلام سعیدی صاحب اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں کہ:

> ”مولانا بڑے کریم النفس انسان تھے، کبر ونخوت ان کے یہاں سب سے بری چیز تھی، ہر کس وناکس کے ساتھ بڑی شرافت کے ساتھ ملتے تھے، علمی مباحث ہوں یا سیاسی رہنمائی، ہر چیز ان کی بڑی واضح اور دلنشین ہوتی تھی، خاص طور پر علمی گفتگو کرتے وقت ان کی بڑی نرالی شان ہوا کرتی تھی، غم وغصہ بڑی آسانی سے پی جایا کرتے تھے، جہاں تک

محسوس کرسکا کہ وہ اپنے آپ کو دنیا کے تمام انسانوں کے خادم تصور کرتے تھے، دینی دعوت کو ساری دنیا میں پھیلانے کے لئے قربانیوں پر قربانیاں دینے کے لئے خود بھی تیار تھے اور وں کو بھی اس کی طرف دعوت دیتے تھے، بوریا نشین تھے، لیکن شاہین جگر کے حامل، فقر و درویشی آپ کے منشور تھی، مگر دور اندیش ودور بین تھے، طبیعت میں سختی نہیں تھی، اگر آپ کے سامنے حق واضح ہو گیا تو وہ باوجودیکہ اپنی رائے کے خلاف کیوں نہ ہو جلد مان جایا کرتے تھے۔ بڑے حق پسند اور حق کی راہ میں اپنے آپ کو قربان کرنے والے انسان تھے، آپ کے یہاں سے کوئی بھی پریشان حال انسان سکون وطمانیت سے اپنا دامن بھر سکتا تھا، مولانا باوجودیکہ بڑے صائب الرائے عالم دین تھے، مگر جمہوریت پسند، کہیں اگر اکثریت کی رائے آپ کے خلاف جاتی تو اسے بھی آپ بڑی خندہ پیشانی سے قبول فرما لیتے تھے، مولانا کی عملی زندگی میں اس کی سینکڑوں سے زیادہ مثالیں موجود ہیں، جس سے یہ بات ثابت ہو گیا ہے کہ مولانا مرحوم ایک جمہوریت پسند انسان تھے“۔(۱)

۱۷/اپریل/ ۲۰۰۳ء ۶/صفر المظفر / ۱۴۲۴ھ شب جمعہ کو اچانک یہ اطلاع ملی کہ حضرت مولانا انتقال کر گئے ہیں۔ انا للہ وانا الدر راجیون - دراصل یہ ایک عظیم عالم دین کا سانحہ ارتحال نہیں تھا بلکہ امت مسلمہ/ارکان کا ایک نا قابل تلافی نقصان تھا، جو آپ کے متعلقین اور رفقائے کار کے لئے کتنا اندوہناک ہو گا وہ تو ظاہر تھا، لیکن اس میں دنیا بھر کے وہ مسلمان بھی شریک وسہیم تھے، جنہیں آپ کے منصب عالی اور مقام رفیع کا صحیح صحیح علم تھا، واقعہ یہ ہے کہ آپ کا اس دار فانی سے رحلت لئے کوچ کر جانا تحریک جہاد اسلامی ارکان کے لئے ایک نا قابل تلافی خسارہ تھا، مرحوم ارکان کے اس جہادی مشن کے لئے ایک صحیح، برمحل اور موزون انسان تھے، کوئی اعتراف کرے یا نہ کرے مگر حقیقت یہ ہے کہ آپ نے اپنے اس جہادی مشن کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے اپنی ساری زندگی کھپادی، اور اس کا پورا پورا حق بھی ادا کر دیا، اللہ تمام مرحوم کو اپنی بے شمار نعمتوں سے بہرہ ور کرے۔ اور ان کے تمام احباب و

---

(۱) مولانا نور الاسلام سعیدی حیات میر، ص: ۳۲۔

متعلقین کو صبر جمیل کے ساتھ ساتھ ان کے طرز ہائے زندگی کو اپنانے کی توفیق سے نوازے، آمین۔

یوں تو ہمارے بڑے بڑے لوگ اپنے کفن کے ساتھ اپنی زندگی کے سارے کارنامے ملک وملت، قوم وورثاء کے لئے چھوڑ جانے کے بجائے اپنے ساتھ لے کر جانے کو پسند کرتے ہیں، ویسے مولانا کے انتقال پر راقم السطور کو یہ اندیشہ ستا رہا تھا کہ مولانا کا معاملہ بھی تو کہیں ویسا نہیں ہوگا؟ مگر خلاف توقع اور اچانک یہ اطلاع ملنے پر کہ عرب امارات میں ایک مجلس قائم کی گئی، جس میں یہ طے پایا کہ مرحوم کی سوانح عمری ضرور مرتب ہوگی، یوں ذہن کو کچھ طمانیت نصیب ہوئی، مزید برآں سب سے بڑی خوشی اس وقت ہوئی کہ مجلس کی طرف سے یہ ذمے داری محترم دوست مولانا محمد امین ندوی کے سر ڈالی گئی ہے، اور مولانا ندوی صاحب نے خوشی خوشی منظور بھی کر لی ہے، میری معلومات کی حد تک بھلا اس بار گراں کو اٹھانے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مولانا سے زیادہ موزون اور برمحل انسان اور کون ہو سکتا ہے، اللہ تمام مولف محترم کو توفیق سے نوازے، آمین۔

ادھر اس واقعہ کے چند روز بعد ایک لفافہ موصول ہوا، جس میں مولانا محمد امین ندوی صاحب نے حضرت مولانا میر احمد مبارک کو جاننے والوں سے یہ گزارش کی کہ وہ مرحوم کے متعلق جتنی بھی معلومات رکھتے ہوں، تحریری شکل میں پیش کرنے کی زحمت اٹھائیں، پھر اور چند دن گزرتے نہ گزرتے محترم دوست مولانا نور الاسلام سعیدی صاحب نے بھی مجھے حضرت مرحوم کی حیات پر مشتمل ایک مختصر سا مقالہ یہ کہہ کر تھما دیا کہ میں اسے دیکھوں اور ضروری تحفظات کے ساتھ اس پر ایک مقدمہ بھی لکھ دوں، مگر میں سرتاپا معذرت تھا اور وہ اپنے حکم پر مصر، آخر مجھے ایک گومگو کے عالم میں اس بار گراں کو اٹھانا ہی پڑا تھا۔

پھر چند دن کے بعد عرب امارات سے مولانا محمد امین ندوی صاحب کا ایک فون آیا، جس میں آپ نے قدرے تحکمانہ انداز میں یہ فرمایا کہ میں ویسے مقدمہ وغیرہ لکھنے کے بجائے ایک مستقل مقالہ مرحوم پر لکھ بھیجوں، اول تو ان کا مذکورہ عمومی خط پیش نظر تھا، پھر یہ فون ایک خصوصی حکم پر مبنی، تو سوچ رہا تھا کہ میں جیسا نرا کورا بھی اس لائق کب ہو گیا کہ مولانا میر احمد مرحوم جیسی عالی مرتبت شخصیت اور ان کی گوناگوں صفات وکمالات پر قلم اٹھانے کی زحمت کروں؟ ویسے ایک طرف مجھے اپنی تہی دامنی کی شکایت تھی تو دوسری طرف محترم دوست کے تحکمانہ اصرار، اس کشمکش کے عالم میں اپنے آپ کو لائق

صد احترام دوست کے حکم کے سامنے مجبور پایا تو قلم ہاتھ لیا، چلو کچھ لکھ دو، کام کا ہوا تو ٹھیک ہے، ورنہ مولانا ندوی اسے اپنی ردی کا حصہ بنا دیں گے۔

یوں تو عام ضابطے کے مطابق حضرت مولانا مرحوم کے تمام گوشہائے حیات کے متعلق مقالے بڑی سرخیوں اور ذیلی عناوین کے تحت مولانا ندوی خود تحریر فرمائیں گے، اور عام قلم کار کے لئے موضوع پر پورے احاطے کی گنجائش ہے نہ ضرورت، تو ان کا کام زیادہ سے زیادہ اتنا ہونا ناگزیر ہے کہ مرحوم کی اس بلند و بالا شخصیت اور کارناموں پر مشتمل اپنی اپنی ذاتی انطباعات اور تاثرات کا برملا اظہار کر دیں، تو راقم سطور بھی اس وقت اپنے لئے وہی راستہ مناسب پایا تو ایک مقالہ لکھ بھیجا، آج وہی مقالہ من وعن یہاں درج کرنے کا موقع آیا تو ہے لیکن گنجائش نہیں۔

میرے لئے مولانا مرحوم کی عظیم شخصیت، ان کی گوناگوں صفات کمالات اور ان کی گرانمایہ خدمات و کارناموں پر قلم اٹھانا بڑا مشکل کام ہو گیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ آپ ایک بڑے عالم دین، مایۂ ناز فقیہ بزم شریعت وطریقت کے تاجدار، اور رزم سیاست و قیادت کے شہوار انسان تھے۔ البتہ میں نے مولانا نور الاسلام سعیدی صاحب کے مقالہ کے مقدمہ میں کچھ خامہ فرسائی کی، جس کے ایک پیراگراف شاید ناظرین کرام کی دلچسپی کا باعث بنے گا:

> ''حضرت مولانا رحمہ اللہ کو خاکسار نے قریب سے دیکھا مگر بہت کم، البتہ ان کے بعض نامور تلامذہ و متعلقین، محبین ورفقائے کار کے واسطے سے ان کی بلند و بالا شخصیت اور ان کے انمول کارناموں کے پیچ وخم کا جہاں تک اندازہ کیا، وہ یہ ہے کہ آپ ایک طرف علم وعمل، مودت ومحبت، شفقت درافت، نجابت شرافت کے پیکر تھے تو دوسری طرف عزم و ہمت، جرات وشجاعت، جوش و ولولہ اور حکیمانہ مدبرانہ سیاست کے حامل انسان تھے، علاوہ ازیں خاص طور پر امت مسلمہ ارکانیہ کے علمی واخلاقی، فکری وروحانی، انفرادی واجتماعی حالات سے آپ کو گہری بصیرت و واقعیت تھی، غرض گلیم فقیری و درویشی میں خلعت سلطانی و جہاں بانی کے حامل یہ بوریہ نشین عالم دین ارکان اور وہاں کی مظلوم قوم کے لئے باعث رحمت اور سایہ

> عاطفت تھے، جنہوں نے اپنی علمی وعملی زندگی میں اس بات کا پورا پورا ثبوت پیش کر دیا تھا کہ ایک درویش صفت انسان بھی قیادت وسیادت کی پرخار پگڈنڈیوں سے گزر سکتا اور سیاست کے افق پر ستارہ بن کر چمک سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا رحمہ اللہ نے سیادت وقیادت کو امت مسلمۂ ارکانیہ کے لئے عموماً اور علمائے ارکان کے لئے خصوصاً ایک عبادت کی شکل میں متعارف کرایا، اس جاذب نظر شخصیت کی تابانی تا حیات تو تھی ہی، اور اوجھل ہونے کے بعد بھی اس کی ضیا پاشی ہماری اندھیر نگری میں محسوس کی جاتی رہی ہے''۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں میرانِ عافیت کوشاں سینکڑوں ملتے ہیں، مگر زمانے میں ایک میر کارواں کا ملنا بڑا مشکل ہے، آج آپ دنیا سے اوجھل ہوئے تو ٹھیک ہے مگر ہمارے مسائل اور مشکلات کو ان کی چشم بصیرت سے دیکھنے اور ان کے صحیح و برمحل حل تلاش کرنے والے سر دست میدان میں ان جیسا ایک انسان بھی نظر نہیں آتا۔ اور ان کے بعد جو خلا محسوس ہو رہا ہے، وہ مستقبل قریب میں شاید ہی پر ہو سکے گا۔

آج ان کی وفاتِ حسرت آیات پر مجھے ان پیران بزم عرفان پر ترس آتا ہے، جن کے سامنے اپنی ہی ماں بہنوں کی عصمتیں پامال ہوتی ہیں، لیکن ان کے دامن نخوت وغیرت پر کوئی آنچ تک نہیں آتی۔ مجھے تو ان فقیہانِ دیر وحرم پر حسرت ہوتی ہے، جن کے سامنے نسخۂ قرآن وسنت جلائے جاتے، لیکن خود یہاں سے اٹھنے والی چنگاریاں ان کے دامن پر شوکت پر دھویں تک نہیں لگاتیں۔ مجھے ان حدی خوان ممبر ومحراب پر صدائیں نکلتی ہیں، جن کے سامنے دیوار حرم گرائی جاتیں، مگر ان کی معصوم زبانیں گنگ اور کلیجے اف تک نکالنا گوارا نہیں کرتے۔ مجھے تو ان فارسانِ رزم سیاست پر رحم آتا ہے، جن کے سامنے اپنے ہی بھائی بند کو زنجیریں پہنایا جاتا، لیکن ان کی زبانیں احتجاج کے ایک حرف غلط تک صادر نہیں کر پاتیں۔

تو اندازہ کیجئے کہ ایسے میں حضرت مولانا میر احمد صاحب کا رزم گاہ پر نکلنا ایک عجوبہ نہ تھا بلکہ صحیح معنی میں ایک کرامت تھا، جو بیک وقت پیران بزم عرفان کی آہیں تھے تو فقیہان حرم کی صدائیں بھی، حدی خوان ممبر ومحراب کی آہ و بکا تھے تو خدایان درس وتدریس کے نالے بھی، حقیقت یہ ہے کہ زمانے میں

تماشے بین کی کوئی قلت نہیں ہوتی، مگر آگ سے کھیلنے اور ستاروں پر کمنڈ ڈالنے والے حوصلہ مندوں کی کم یابی کا گلہ ہوتا ہے، گھڑیوں سے کھیلنے والے کم نہیں پائے جاتے، مگر کشاکشِ دار ورسن سے ٹکر لینے والے مردانِ جواں ہمت کی نایابی کا شکوہ ہوتا ہے، آپ مدتہائے دراز تک رزم گہِ عزیمت میں ترستے رہے تھے، لیکن زمانے کہتے گئے کہ شاید آپ کو بدحواسی کی عفریت نے آدبوچا ہو۔

ایک روز کا واقعہ ہے کہ مولانا مرحوم کے متعلق ایک کرم فرمانے رقم سطور کے سامنے یہ خیال ظاہر کیا کہ مولانا یک بڑے عالم دین ہیں اس لئے ان کو قیادت وسیادت، سیاست وانقلاب کے اس کوچۂ پُر خطر میں اترنے کے بجائے قال اللہ وقال الرسول کے درس وتدریس میں زندگی گزار دینا چاہئے تھا، اور کرم فرمانے اپنے مشفقانہ انداز میں حضرت مرحوم کی آخری زندگی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے ارکان کے دو بزرگوں کے اسمائے گرامی بھی لئے، جو ابھی مسند درس وتدریس کی شمع فروزاں بنے ہوئے ہیں، پھر مجھ سے رہا نہ گیا، اور ایک درد بھرے انداز میں پوچھا کہ جناب من! آپ نے قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں مدرسہ کی مدرسی، مسجد کی امامت وخطابت کے علاوہ اور کچھ سیکھا بھی تو ہوگا! کیا آپ کی نظر میں جہاد فی سبیل اللہ کے لئے نکلنا مدرسہ کی مدرسی سے کم تر ہے؟ کیا آپ سرزمین ارکان کی اس جانکنی کی حالت میں مدرسے کی مدرسی کو بس پورا دین سمجھ رکھا ہے؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب با صفا کی زندگی نے آپ کو کانٹوں پر زندگی گزارنے کا سبق بالکل نہیں پڑھایا؟ شعلوں سے غسل کرنا نہیں سکھایا؟ لہو سے منہ دھونے کا طریقہ نہیں بتایا؟ کیا آپ کے نزدیک ایک بڑے عالم دین ہونے کے لئے کسی مدرسہ کے مسندِ درس پر براجمان رہنا ہی ضروری ہے؟ بس وہ کرم فرما خاموش ہی تھا، اور میں نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا، اور بتایا کہ جناب من! ایک وہ انسان جس نے سرزمین ارکان کے خزاں دیدہ گلستان کو اپنے مبارک لہو سے سینچنے کی راہ لی تو آپ نے ان کے برگزیدہ سر پر اپنا یہ مفروضہ ٹھوس دیا کہ میر احمد مبارک کو بس مدرسہ کی چار دیواری کے اندر محصور رہ کر غلامی کی تسبیح پڑھنا چاہئے تھا، ان کو زہد وقناعت اور عافیت کوشی کی راہ لینی ضروری تھی، کیوں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی راہ چلے؟ یہ آپ کی نظر میں ایک بڑا جرم قرار پایا، مگر اہل بصیرت کے لئے مولانا کی وہی زندگی ایمان افروز ہے، جس میں آپ نے اپنی سخت جہد ومشقت کے ذریعے

ایک ایمانی اور جہادی قافلہ تیار کر لیا تھا، اگر چہ یہ قافلہ بعض وجوہات کی بنیاد پر زخم سے چور ہو کر میدان سے ایک وقت کے لئے واپس آیا، لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کی کوشش رنگ لائی ضرور تھی، اور یہ کہنا بالکل بے جا ہوگا کہ مولانا کی یہی جہادی زندگی بالکل بے ثمر نکلی ہے، دنیا میں کتنے جہادی قافلے تھے جو میدانِ جہد وعمل میں بظاہر نامراد اور ناکام ہی سہی، مگر اس ناکامی اور نامرادی کے تہ میں ہزار ہا کامیابیاں چھپی ہوئی ہیں، اس دعوی کی دلیل کے بطور ہم آپ سے پوچھیں گے کہ کیا قافلۂ سید احمد بن عرفان الشہید ناکام تھا؟ کیا امام شامل داغستانی کی اٹھائیس سالہ جہادی زندگی نامراد تھی؟ کیا امام احمد شریف السنوسی کی پوری جدوجہد بے کار ثابت ہوئی؟ آپ ضرور جواب دیں گے کہ نہیں اور بالکل نہیں۔ ایک طرف تو یہ لوگ اور ان کے تمام رفقائے کار اللہ تعالی کے یہاں بڑے بڑے اجر کے مستحق ہوں گے، پھر دوسری طرف دنیا میں بھی ان کی سرخروئی کا عالم ملاحظہ کیجئے کہ سید احمد شہید اور امام اسماعیل شہید کی شہادت کی بدولت برصغیر ہندو پاک کے علاوہ افغانستان کے جہاد میں رنگ آئے، امام شامل داغستانی کی جہد ومشقت کے ناطے شیشان کے مسلمانوں کے خون میں گرمی آئی اور طاغوتوں سے ایسی ٹکرائی کہ آج ان کے پرخچے اڑنے لگے، اور امام سنوسی کے کارناموں کی بدولت لیبیا آزادی سے ہمکنار رہا، اس طرح آج مولانا ہم میں نہیں ہیں، مگر بجا طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی یہی آخری جہادی زندگی انشاء اللہ رنگ ضرور لائے گی۔

خاکم بدہن اور گستاخی معاف! کہنے کو تو میرے کرم فرما کے مطابق وہ بزرگانِ دین جو مسند درس وتدریس پر شمع فروزاں بنے مدتوں سے جلوہ فرما ہیں، ان کے مطابق یونانی منطق وفلسفے پر نازاں، پارسا اور بلند اخلاق کے حامل ہیں، جی ہاں! میرے اپنے اس کرم فرما کی اس مدحت گساری سے تعارض کرنا مقصد نہیں ہے، اور مانتے ہیں کہ چار دانگ عالم میں ان بزرگوں کی مہارت اور ان کی شہرت کا چرچا ہے، لیکن عرض ہے ان بلند اخلاق کے حامل منطقی اور فلسفی بزرگوں سے کہ آپ اپنی آنکھوں کے سامنے خود اپنے ہی نشیمن کو جلاتے دیکھ کر منہ پر تالے کیوں ڈال لیتے ہیں؟ آپ کی نطق وگویائی جس پر آپ کو نہ ہو تو کم سے کم آپ کے متبعین کو ناز ضرور ہے، حرکت پر آنے کے بجائے اس پر آسمان سے بجلی کیوں گر جاتی ہے؟ آپ کی صرف یہی حالت نہیں ہوتی بلکہ آپ اپنی ساری منطقی حدود اربعہ سمیٹے اپنے منقارِ منطق و

فلسفہ زیر پر کیوں لے جاتے ہیں؟ اب رہا اخلاق کا تقاضا کہ وہ کون سا اخلاق ہے؟ اس کا مصدر کہاں ہے؟ جس نے اللہ اور رسول، اسلام اور مسلمانوں سے مذاق اڑاتے دیکھ سن کر کم سے کم اپنے کانوں پر انگلی تک دینا نہ سکھایا ہو؟ اپنے نشیمن کو جلتے جلاتے دیکھ کر اس پر ایک برتن پانی ڈالنے کے بجائے خود اس پانی سے نافلہ وضو کرنا سکھایا ہو؟ اس اخلاق کا مصدر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ ہے نہ ان کے اصحاب باصفا کی خار مغیلاں سے کھیلنے والی زندگیاں۔ یہ اخلاق نہیں بلکے زندگی اور زندہ دلی سے فرار اور سراسر رہبانیت ہے، جس کا مصدر نہ قرآن کریم ہے نہ سنت رسول اکرم، کیوں کہ اسلام میں تو اسی قسم کی رہبانیت کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے، اس کا آخری سرا جوگیوں کی جو گیت اور راہبوں کی رہبانیت پر جا ٹھہرتا ہے۔

ادھر کچھ لوگ جہاد اسلامی جیسے کوچۂ جاناں میں بڑے ظالم نکلے ہیں، جنہوں نے چند سال پہلے ان ہمارے مشائخ کا دھنڈورا پیٹا تھا، جو مسلمانانِ ارکان کی اس موت وحیات کی کشمکش میں اپنے وہ سدا بہار کردار محفوظ کئے، جن کے تذکاران بے بس و بے کس، نہتے اور کس مپرس مسلمانوں کی اگلی نسل کو صدیوں تک خون کے آنسو رلائیں گے، جنہیں ماں اور بہنوں کی پامال ہوتی عزتیں پکاری تھیں، مگر انہوں نے ہر سنی کو ان سنی کر دیا، جنہیں اپنے عزیزوں اور پیاروں پر روز بیتنے والے مظالم نے آواز دی، مگر انہوں نے یہ کہہ کر ان سے منہ موڑ لیا کہ یہ تقاضائے مصلحت ہے، جس کے سامنے تسلیم ورضا ہی ضروری ہے اور بس۔

تو ایسی جانکنی کی حالت میں ہمارے ایک وہ شیخ تھے، جنہی اگر چہ ان کرم فرماؤں نے دانستہ طور پر اس عظمت و پارسائی کی فہرست میں جگہ تک دنیا گوارا نہیں کیا، انہیں اپنی ماں اور بہنوں کی پامال ہوتی عزتیں آواز دی تو وہ ترس کر رہ گئے تھے، اپنے ہی بھائی بند، مدارس ومساجد پر ہونے والے مظالم نے پکارا تو ان کی غیرت ایمانی اور حمیتِ اسلامی تڑپ کر رہ گئی، میرے خیال میں آج ان کی خودی وخود داری، حمیت وغیرت پر جتنی بھی داد دی جائے تو بھی بہت کم ہے۔

افسوس اور صد افسوس! ہمارے دریائے ناف کی شوریدہ سر لہروں کی رنگینیاں اور مہربانیاں بھی ملاحظہ کیجیۓ!، ہمارے کوئی شیخ دریا کے مشرقی پار رہے تو مشائخ کے نام پر دھنڈورہ پیٹنے والوں کی زبان میں شیخ المشائخ اور شیر ببر ہی رہے، اگر یہی شیخ دریا کے اس پار کوچۂ جانان کی نیت پر آ جائے تو ان کی نظر میں وہ اپنی ساری فضیلت

مشیخیت کھو کر گیڈر مکر وفریب کی جگہ لے بیٹھتے، ورنہ ہمارے اس عظیم شیخ کی کس جرم لاتلافی کی پاداش میں صحیح معنی میں اتباع نہ کی گئی تھی؟ آپ مرحوم کیا ان مشائخ عظام سے جن کا ڈھنڈورا پیٹا گیا تھا علم و فضل وضعداری اور شرافت میں کم تھے؟ جبکہ ہم تو دیکھتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ کے حوالے سے ان کا روشن اور تابناک کردار وسرگرمی کی مثالیں ان بزرگوں کے ماضی کے حیران کن کردار وسرگرمیوں میں ڈھونڈے سے نہیں مل سکتیں۔

پھر ادھر پھر ایک نظر کرم کی زحمت گوارا کیجیۓ، جہاد و انفار کے نام پر شور مچانے والے بازی گروں کا شوریدہ ترنگ بھی سنئے کہ ان شور مچانے والوں کی ہمیشہ یہی شکایت رہی تھی کہ مشائخ ارکان ہمیشہ جہاد و انفار سے منہ چراتے رہے ہیں، ان کا گلہ ہمیشہ یہی رہتا ہے کہ علمائے ارکان میں سے کسی بھی قدآور شخصیت نے اس کار عزیمت میں کبھی بھی حصہ نہیں لیا، ایسے میں ہمارے یہ شیخ المشائخ دریائے ناف کی اس بلا خیز موجوں کو پلانگ کر ادھر آ نکلے، تو ان شور مچانے والوں نے کبھی بھی بھولے سے ان کے سامنے جانے کی تکلیف برداشت نہیں کی، میری یہ حقیقت جہاں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ علمائے ارکان کی قدآور شخصیت نے جہاد وانفار میں بھر پور حصہ لیا تھا، تو وہاں اس بات کی بھی بین دلیل ہے کہ جہاد وانفار کے حوالے سے ہمارے کسی بھی بڑے عالم کے سامنے ان بازی گروں کا آنا نصیب نہیں ہوا۔ اس نقطۂ نظر سے مولانا مرحوم جیسی ایک قدآور شخصیت کا میدان عزیمت پر نکلنا گویا علمائے ارکان کی جانب سے اتمام حجت سے کم نہیں تھا۔

دراصل ان بازی گروں کے حوالے سے یہ بات بالکلی سچ ہے کہ جب علماء اپنے وطن میں رہتے ہیں تو مطعون ہی رہتے ہیں، ادھر جہاد وانفار کے لئے آ نکلتے ہیں تو ان بازی گروں کی ساری توانائیاں اس پر صرف ہوتی نہیں تھکیں کہ کسی بھی طریقے سے ان کو زخم سے چور کر کے میدان جہاد سے ہٹا دیا جائے، اس سلسلے میں صرف ہمارے ایک یہ شیخ نہیں، بلکہ مولانا عبد القدوس مظاہری، عقیل احمد قاسمی کی جہادی زندگیوں میں ہمارے اس دعوی کے روشن اور بین ثبوت موجود ہیں، دراصل میں چاہتا تھا کہ میری اس جیسی باتیں ان کہی رہ جائیں، مگر:

مرا دردیست اندر دل اگر گویم زبان سوزد
وگر در دل نہاں دارم تو مغزِ استخوان سوزد

مولانا فیض الاسلام صاحب تنگ بازاری، بوسیدنگیؒ:

ارکان کے معروف عالم دین وداعی، امیر جماعت تبلیغ مولانا فیض الاسلام بن الحاج سعید الرحمن بن انصار علی بن بخش علی صاحب کی پیدائش ۱۹۳۲ء میں بوسیدنک کے قصبۂ تنگ بازار کی بستی پکتوفرانگ میں ہوئی، آپ کے والد جناب الحاج سعید الرحمن صاحب نہایت شریف اور خدا ترس بزرگ تھے، اور والدہ مصطفی خاتون بھی بہت اعلی اخلاق والی خاتون اسلام تھی۔

مولانا فیض الاسلام صاحب نے اپنی ایک خودنوشتہ تحریر میں اپنے نام سمیت اپنے بھائی بہنوں کے اسمائے گرامی تحریر کئے ہیں، اس تحریر کے مطابق بالترتیب ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔مولانا عبدالشکور صاحب۔

۲۔مولانا فیض الاسلام صاحب۔

۳۔مولانا احمد کبیر صاحب۔

۴۔جناب ڈاکٹر فیاض الدین صاحب مقیم حال مکہ مکرمہ۔

۵۔صابرہ خاتون صاحبہ۔

۶۔شاکرہ خاتون صاحبہ۔

۱۹۳۸ء میں برطانوی دورحکومت کے اواخر میں مولانا فیض الاسلام صاحب کی مکتب نشینی ہوئی، ساتھ ہی آپ کو علاقے کے اردو اسکول میں داخل کرایا گیا، جہاں سے آپ نے اردو کی چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کی، اگرچہ اس بات کا پتہ نہیں چل سکا کہ مولانا فیض الاسلام صاحب نے بسم اللہ خوانی کس نیک بزرگ کے مبارک ہاتھ میں کی تھی، لیکن آپ نے ابتدائی اردو تعلیم درج ذیل بزرگوں کے پاس پائی تھی:

۱۔جناب ماسٹر عبدالباری صاحب یکمائی فاروی۔

۲۔جناب ماسٹر محمد یعقوب صاحب یکمائی فاروی۔

۳۔جناب ماسٹر غلام ربانی صاحب یکمائی فاروی۔

۴۔جناب ماسٹر عبدالمعبود صاحب یکمائی فاروی۔

۱۹۴۲ء کے واقعہ کرب و بلا کے دوران آپ کی پڑھائی رک گئی تھی، لیکن ۱۹۴۶ء میں جنگ برطانیہ و جاپان کے اختتام پر آپ نے مدرسہ عربیہ دار العلوم تنگ بازار میں داخلہ لیا، یہاں سے متداول نصاب تعلیم کی کتابیں پڑھیں۔

۱۹۴۲ء سے لے کر ۱۹۴۶ء تک کی اس درمیانی مدت تعلیم کے حوالے سے مولانا کی فترت کا زمانہ تھا، جس کی وجہ پچھلی سطور میں بیان کی گئی ہے، اس کے بعد ملک میں قدرے امن قائم ہوا تو مولانا فیض الاسلام صاحب کے والد گرامی کے علاوہ چند بزرگوں کے دلوں میں آپ کی پڑھائی کی فکر دامن گیر ہوئی، جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱۔مولانا مفتی محمد حسین صاحب فتح علی فاروی۔

۲۔مولانا عبدالشکور صاحب سنگانوی۔

۳۔مولانا عزیز الرحمن صاحب سنگانوی۔

۴۔مولانا عبدالشکور صاحب کیاندنگی۔

۵۔مولانا عبدالغفار صاحب یکمائی فاروی۔

۶۔مولانا عبدالصمد صاحب نیا فاروی۔

۷۔مولانا جلال الدین صاحب منوفاروی۔

۸۔مولانا ابوالقاسم صاحب منگیزوی۔

۹۔مولانا محمد یعقوب صاحب فندوفرانگی۔

دراصل بات یہ ہے کہ مذکورہ سارے علمائے کرام وہ ہیں کہ جن سے مولانا فیض الاسلام صاحب نے خوب خوب استفادہ کیا تھا، اللہ تعالی کے فضل وکرم اور ان علمائے کرام کی نیک توجہ سے مولانا کی تعلیم بڑی خوبی سے ہو پائی تھی۔

۱۹۵۱ء کے اواخر میں مولانا فیض الاسلام صاحب اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے برما کے دار الحکومت رنگون پہنچے، اور وہاں کی معروف درسگاہ دار العلوم تانبوے میں دوسال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

دارالعلوم تامبوے میں مولانا فیض الاسلام صاحب ۱۹۵۱ء میں موقوف علیہ کی کتابیں پڑھیں، اس کے اگلے سال دورۂ حدیث نبویؐ کا سال تھا، چوں کہ اسی زمانے میں رنگون بھر کے کسی بھی مدرسے میں دورۂ حدیث کا درجہ نہیں تھا، یوں آپ کے اساتذۂ کرام کو فکر لاحق ہوئی کہ مولانا فیض الاسلام اوران کے ساتھیوں کو لے کر یہاں دورۂ حدیث کا درجہ کھولا جائے، اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رنگا بالوی (سابق شیخ الحدیث دارالعلوم تنگ بازار) رقم طراز ہیں کہ:

''ادھر موقوف علیہ کے سال قطب الارشاد و شیخ الحدیث حضرت العلامہ امیر صاحب قدس سرہ موقوف علیہ کی ساری کتابیں ذوق وشوق سے بلا ناغہ پڑھنے میں مصروف تھے، ادھر آپ کے اساتذۂ کرام سر جوڑ کے آپ کی ترقی و بہبودی کے لئے مشورہ کرتے رہے، سارے اساتذہ کا ماننا تھا کہ فیض الاسلام جیسے ذہین وفطین، خلیق وحلیم، شریف وسلیم، رحیم وامین، ذکی وتقی اور سراپا سعید و ہونہار کا پیدا ہونا ہی سرزمین برما کے لئے اللہ تعالی کی ایک بڑی رحمت ہے، اور یقینا یہ بھی ایک بڑی خوش نصیبی اور نیک بختی ہے کہ اس جیسے باسعادت وہونہار اوراسم بامسمی لڑکا ہمارے مدرسے کا طالب علم ہے، انشاء اللہ ہماری فلاح دارین اور نجات اخروی کے لئے یہی ایک طالب علم کافی ہے، جو ہماری ایک خوش نصیبی ہے، اس لئے ہم سب کی چاہت یہی ہے کہ اس کے ذریعے اگلے سال دورۂ حدیث کا درجہ ہمارے مدرسے میں کھولا جائے، ہمارا یقین ہے کہ فیض الاسلام جیسے طالب علم سے دورۂ حدیث کا درجہ کھولا گیا تو باعث برکت ہوگی، اوراللہ تعالی کے نزدیک مقبول ہوکر سرزمین برما میں دورۂ حدیث نبویؐ کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا، چنانچہ مولانا فیض الاسلام صاحب کو لے کر ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم تامبوے میں دورۂ حدیث کا درجہ کھولا گیا، جس کا سلسلہ الحمدللہ تعالی تا حال جاری ہے، خدا کرے تو آئندہ بھی جاری رہے گا، یوں ملک برما میں دورۂ حدیث کی تعلیم کا سلسلہ مولانا کے طفیل سے جاری ہوا، اس کے بعد دیگر مدارس میں بھی اس کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا''۔

مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا فیض الاسلام صاحب دارالعلوم تانبوے کے اپنے زمانے کے اساتذۂ کرام کے نورنظر بن چکے تھے، یوں بھی ہم نے مولانا کو بہت قریب سے دیکھا، اور جہاں تک اندازہ کیا اس کے پیش نظر بات یہ ہے کہ ان اساتذۂ کرام کی توقعات بالکل حق بجانب تھیں، آپ ایک داعی اور بڑے پائے کے عالم دین ہونے کے علاوہ نہایت خلیق بزرگ تھے، بہر حال ذیل میں مولانا کے رنگون کے اساتذہ کے اسمائے گرامی کے ساتھ یہ بھی درج کیا جارہا ہے کہ آپ نے کون کون کتابیں کن ناموروں سے پڑھی تھیں:

۱۔ مشکوۃ شریف اول: حضرت علامہ حافظ وقاری الحاج محمد داؤد مفتی اعظم برما صاحب سے۔

۲۔ مشکوۃ شریف ثانی وہدایہ ثالث: شیخ الحدیث مدرسہ تامبوے حضرت مولانا بشیر الدین بن مولانا شکر اللہ صاحب (مصنف بشیر الدرری لمن یطالع جامع البخاری) سے۔

۳۔ جلالین شریف اول وثانی اور بیضاوی شریف مع فن تجوید کی کتابیں: حضرت مولانا نوراللہ صاحب سے۔

۴۔ فن تجوید وتمرین قرآت: مولانا عبدالرحمن صاحب سے۔

۵۔ انگریزی کتابیں: حضرت مولانا ماسٹر مسا صاحب سے۔

۶۔ خوش خطی وفن کتابت: حضرت مولانا محمد شمیم صاحب مولمینی سے۔

۷۔ بخاری شریف اول: حضرت مولانا حافظ قاری محمد داؤد ہاشم مفتی اعظم برما سے۔

۸۔ بخاری شریف ثانی، ترمذی شریف کامل، نسائی شریف اول اور طحاوی شریف: حضرت مولانا بشیر الدین صاحب سے۔

۹۔ مسلم شریف کامل وابن ماجہ: حضرت مولانا نوراللہ صاحب سے۔

۱۰۔ ابوداؤد شریف کامل وموطاامام محمد: حضرت مولانا محمد سلیمان برادر مولانا مفتی اعظم داؤد ہاشم سے۔

۱۱۔ موطاامام مالک: امیر جماعت تبلیغ حضرت مولانا محمد صالح رنگونی سے۔

۱۲۔ تمرین قرأت کی بعض کتابیں: حضرت مولانا قاری محمد خان صاحب سے۔

۱۳۔ برمی زبان کی کتابیں: جناب ماسٹر عبدالجبار ارکانی صاحب سے۔

یہاں سے فراغت کے بعد مولانا فیض الاسلام صاحب نے مزید حصول تعلیم کے لئے ہندوستان کا

سفر کیا، ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۵۶ء تک مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں دوبارہ دورۂ حدیث اور فنونات عالیہ کی کتابیں پڑھیں، اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں دار العلوم دیوبند میں داخلہ لے کر ایک سال فنونات عالیہ کی دیگر کتابیں پڑھیں، اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رنگابالوی لکھتے ہیں کہ:

''ایک طرف رنگون میں مروجہ درس نظامی میں متداول دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد مزید طلب علم کے لئے ہندوستان کا شوق دامن گیر ہوا، دوسری طرف آپ کے اساتذہ کو بھی یہی خیال ہوا کہ آپ کو اکابر ہند کے علمی سمندر سے سیرابی اور وہاں کے مشائخ سے استفادہ کرنا چاہئے، یوں اساتذۂ کرام نے ترغیب دی تو ان کے دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے شوق کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں، چنانچہ اساتذۂ کرام نے مشورہ کر کے مدرسہ کے فنڈ سے مصاریف مہیا کئے، ویسے آپ کو اساتذۂ ہند سے استفادے کا موقع ملا، وہاں پہنچ کر مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، یہاں دورۂ حدیث کی کتابیں دوبارہ پڑھیں، بخاری شریف کامل اور مسلسلات حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی نابغۃ العصر فرید الدہر حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندہلوی سے پڑھی، ترمذی شریف کامل اور شمائل ترمذی حضرت مولانا مفتی منظور احمد صاحب سے پڑھی، نسائی شریف، ابن ماجہ، طحاوی شریف اور موطین حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب ناظم مدرسہ سے پڑھی۔ مولانا فیض الاسلام صاحب دورۂ حدیث کے سالانہ امتحان میں مدرسہ کے تمام طلباء سے فوقیت لے کر تفوق کلی سے سرفراز ہوئے، حقیقت میں مولانا اس بیت کے واقعی مصداق تھے کہ:

بکوش اندر کتب بینی بہر دم
میان ہم نشین باشی مکرم۔

مولانا شبیر احمد صاحب رنگابالوی نے مولانا فیض الاسلام صاحب کی تفوق کلی کے حوالے سے ایک دل چسپ بات لکھی ہے، جس میں حضرت مولانا سید الامین صاحب، مولانا عبد السبحان صاحب کے علاوہ مولانا عمر احمد صاحب کیا کتوی کا تذکرہ بھی ہے، جو ملاحظہ کیجئے:

''ایک مرتبہ امام المعقولات والمنقولات حضرت شیخ الحدیث مولانا سید الامین صاحب نے راقم سطور کو نعمت کے شکریہ کے بطور فرمایا، جسے راقم نے قلم بند کر کے محفوظ رکھا، آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالی کی عجیب شان ہے کہ حسن اتفاق سے ۱۹۵۶ء کو داعی کبیر شیخ الحدیث مولانا فیض الاسلام صاحب تنگ بازاری نے مظاہر العلوم سہارنپور میں تمام طلبہ سے ممتاز یعنی تفوق کلی لے کر بڑی کامیابی حاصل کی تھی، اسی طرح اسی سال شیخ الحدیث مولانا عبد السبحان صاحب نے دار العلوم دیابند میں، پھر ٹھیک اسی طرح ناکارہ (مولانا سید الامین صاحب) نے جامعہ اشرفیہ لاہور میں تفوق کلی حاصل کی تھی، اور سنا تھا کہ مولانا عمر احمد صاحب کیوکتوی نے اسی سال دار العلوم حیدرآباد میں تفوق کلی حاصل کی تھی:

قابلیت داد او راشرط نیست
بلکہ شرطِ قابلیت داد اوست۔

۱۹۵۸ء میں مولانا فیض الاسلام صاحب وطن واپس آئے، اور دعوت تبلیغ کے ساتھ درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا، آپ نے ۱۹۵۹ء میں ارکان کے دار الحکومت اکیاب کی معروف دینی درسگاہ مدرسہ تکمیل العلوم املہ فارہ میں ایک سال خدمت کی، اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں مدرسہ عربیہ دار العلوم تنگ بازار میں تدریسی خدمات کے لئے تشریف لائے، اور ہمیشہ کے لئے اس مدرسہ کے ہو گئے، تبلیغی دعوت کے ساتھ آپ نے اپنی حیات مستعار کے آخری دم تک اس درسگاہ کی خدمات انجام دی تھیں۔

مولانا فیض الاسلام صاحب کی شادی خانہ آبادی ۱۹۶۰ء میں حضرت مولانا عزیز الرحمن صاحب منو فاروی تنگ بازاری کی لڑکی مصطفی خاتون سے ہوئی (یاد رہے کہ آپ کی والدہ کا نام بھی مصطفی خاتون تھا) اللہ تعالی نے آپ کی اولاد میں برکت دی، اس محترمہ مصطفی خاتون کے بطن سے پانچ بیٹے اور دو بیٹیاں پیدا ہوئیں، جن کے اسمائے گرامی بالترتیب یہ ہیں:

۱۔ مولوی حافظ محمد حارث۔ مدیر مدرسہ تنگ بازار۔
۲۔ مولوی حافظ محمود۔

۳۔مولوی محمد الیاس۔

۴۔مولوی محمد یحیی۔

۵۔مولوی حافظ عبدالمقیب۔

۶۔رقیہ۔

۷۔فاطمہ۔

مولانا فیض الاسلام صاحب کی پوری عملی زندگی مجموعی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے، ان میں سے ایک حصے کا تعلق درس و تدریس سے تھا تو دوسرے حصے کا تعلق دعوت و تبلیغ اور رشد و ہدایت سے، فراغت تعلیم کے بعد وطن آتے ہی آپ نے درس و تدس کی خدمت شروع کی تھی۔

اس بات میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ مولانا فیض الاسلام صاحب ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے ساتھ ایک بڑے پائے کے داعی الی اللہ تھے، درس و تدریس کے حوالے سے آپ ایک کامیاب مدرس تو تھے ہی، لیکن آپ کی عملی زندگی کا دوسرا گوشہ یعنی دعوت و تبلیغ کی وجہ سے آپ کی شہرت بہت زیادہ ہوئی، جس پر آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ گزر گیا تھا، اس حوالے سے اگر لکھا جائے تو کم سے کم ایک ضخیم جلد کی ضرورت ہوگی، جو سر دست ممکن نہیں، بہر حال دعوت و تبلیغ کے حوالے سے کہا جائے تو بات یہ ہے کہ آپ نے اپنی پوری عملی زندگی بحیثیت ایک داعی الی اللہ گزار دی، اللہ تعالی کے بھولے بھٹکے بندوں کو راہ راست پر لانے کے لئے آپ کے اندر ایک تڑپ تھا، اللہ تعالی کے پیغام کو بندوں تک پہنچانے کے لئے آپ کے اندر فکر بھی تھی اور لگن بھی تھا، اگر چہ مولانا یک معلم و مدرس کی حیثیت سے کامیاب مدرس و معلم تھے، لیکن آپ کی شہرت بحیثیت ایک داعی و مبلغ زیادہ ہوئی تھی، عام طور پر سرزمین ارکان اور اس کی اطراف واکناف کے لوگ آپ کو ایک معلم سے زیادہ ایک داعی و مبلغ کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے تھے، شاید آپ کو جاننے اور پہچاننے والے بہت کم لوگ ایسے بھی ہوں گے جو آپ کو داعی الی اللہ کے بغیر ایک مدرس و معلم کی حیثیت سے جانتے ہوں، اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رنگابالوی لکھتے ہیں کہ:

’’حضرت اقدس کی زندگی کا اصل کام اور مقصد دعوت الی اللہ اور تبلیغ و تلقین تھا، اور

حضرت کی حیاتِ مبارکہ کا نقشہ مجموعی طور پر دو حصوں پر منقسم تھا، ایک علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس دوسرا دعوت الی اللہ اور تبلیغ، حقیقت یہی ہے کہ اللہ پاک نے اپنے جس بندے کو جس کام کے لئے منتخب کیا اسی کا تڑپ وطلب، لگن وجلن اور فکر و غم اس کے اندر پیدا کر دیتا ہے، اس کام کے بغیر اسے کہیں چین وسکون نہیں ہوتا ہے۔ دار العلوم دیوبند سے فنونات عالیہ طے کرنے کے بعد وطن آنے کے بجائے مولانا فیض الاسلام صاحب نظام الدین کے مرکز تبلیغ گئے تھے، جہاں آپ نے تبلیغی کاموں میں بھر پور حصہ لیا تھا، یہاں آپ نے چلہ کشی کی، تبلیغی کاموں کے اصول وضوابط سیکھے، بعد ازاں ایک مکمل داعی و مبلغ بن کر وطن واپس آئے، یہاں آتے ہی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا، اور ساتھ ہی ساتھ دعوت و تبلیغ کے کام میں مشغول ہو گئے، مولانا جس زمانے میں یہاں پہنچے اسی زمانے میں دعوت و تبلیغ کا کام آج کی طرح عروج پر پہنچا ہوا نہیں تھا، مولانا کی محنت کی بدولت بطور خاص منگڈو اور بوسیدنگ کے علاقے میں تدریجا عروج پر آیا، آپ کی محنت سے یہاں مسلمانوں کا دینی ودعوتی رجحان اس طرف بڑھتا چلا گیا، مراکز میں شب بیداری ہونے لگی، سہ روزہ اور چلوں میں لوگ بڑھ چڑھ کر حصے لینے لگے، مولانا جس زمانے میں وطن پہنچے تھے اسی زمانے میں حضرت مولانا زین العابدین صاحب نلبنویؒ شقدار فارہ مرکز تبلیغ کے ذمہ دار تھے، موصوف ۱۹۸۶ء میں منگڈو کے مرکز سے ایک جماعت کے ساتھ تنگ بازار آئے تھے، اور لوگوں کو ایک اجتماع میں جمع کیا، اسی اجتماع میں تنگ بازار مرکز کے لئے ایک ذمے دار مقرر کرنے کا مشورہ طے پایا تو تمام حاضرین نے بالاتفاق مولانا فیض الاسلام کو اس کے ذمے دار بنانے کا مشورہ دیا، تو مولانا زین العابدین صاحب نے مولانا کو یہاں کا ذمے دار مقرر کر دیا تھا‘‘۔

مولانا شبیر احمد صاحب مزید لکھتے ہیں کہ:

’’دراصل اللہ پاک نے اپنے جس بندے سے جو نیک کام لینے کا فیصلہ کرتا ہے اس

کا انتظام بھی آہستہ آہستہ اس کی طرف سے کر دیتا ہے، ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء، چنانچہ حضرت مولانا زین العابدین صاحب نلبنوی کے انتقال کے بعد حضرت مولانا عبدالقدوس صاحب نلبنوی کو پورے ارکان کا ذمے دار بنایا گیا تھا، پھر مولانا موصوف کے وصال کے بعد مولانا فیض الاسلام صاحب کو ارکان کا ذمے دار بنایا گیا‘‘۔

مولانا فیض الاسلام صاحب نے دعوت وتبلیغ کی نسبت سے اندرون وطن اور بیرون ملکوں کے متعدد سفر کئے تھے، ارکان اور برما کا بہت کم شہر ہوگا جہاں آپ نہیں پہنچے ہوں گے، آپ جہاں بھی گئے وہاں کے لوگوں کو آپ نے اپنے پرمغز خطابات سے متاثر کیا، منگڈو اور بوسیدنگ کی شاید کوئی بستی ہوگی جہاں آپ کا قدم نہیں پڑا ہوگا، جہاں بھی گئے لوگوں کو دعوت کے حوالے سے گشت، جوڑ اور اجتماعات کے ذریعے دعوت دین کی طرف متوجہ کیا، مولانا کی ذات اور شخصیت میں ایک کشش تھی، لوگ آپ کو دیکھتے ہی موم کی طرح پگھل جاتے تھے، صرف یہی نہیں بلکہ دور دراز سے لوگ آپ کی آمد سن کر آپ کے گرد جمع ہوجاتے، جو بھی آپ کی بات سنتے دعوت دین کی خاطر اپنی زندگیاں وقف کر دیتے تھے، آپ کی تقریریں اخلاص وللّٰہیت میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں، جن میں نام ونمود کا شائبہ تک نہیں ہوتا تھا، اور جن سے لوگ فوری طور پر متاثر ہوجاتے تھے۔

مولانا فیض الاسلام صاحب نے بیرون ملک کے متعدد سفر کئے تھے، جن کا مولانا شبیر احمد صاحب رنگابالوی نے بھی تذکرہ کیا ہے، تاہم مولانا شبیر احمد صاحب نے آپ کے پہلے والے بیرونی تبلیغی سفر کا سن جو ۱۹۶۷ء میں بنگلا دیش میں ہونے کا بتایا ہے، اس میں ایک مشکل یہی پیش آتا ہے کہ بنگلا دیش تو ۱۹۷۱ء میں وجود میں آیا، یہ سفر بنگلا دیش میں کیسے ہوسکتا ہے؟ شاید یہ سفر مشرقی پاکستان کی عمل داری کے زمانے میں ہوا ہوگا، جسے تعین کرنے میں مولانا محترم کو تسامح ہوا ہے، بہر حال مولانا کے اس پہلے والے بیرونی سفر کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب کی بیان کردہ کچھ باتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں، ملاحظہ ہو:

’’حضرت نے تبلیغ کے سلسلے میں بے شمار سفر کئے ہیں، لگ بھگ ۱۹۶۷ء کا واقعہ ہے

کہ آپ تنگ بازار کے مرکز سے ایک جماعت لے کر بغرض تبلیغ تین دن کے لئے منگیزی کا محلہ خیرمورہ فارہ گئے، وہاں کے مسلمان آپ کی آمد کی خبر سن کر خوشی کے مارے پھولے نہ سمائے اور آپ کی مجلس میں جمع ہوگئے تھے، آپ نے عمومی بیان کے بعد پاکستان کے مرکز تبلیغ رائیونڈ میں تین چلہ لگانے کی تشکیل کی، بہت سارے لوگوں نے وہاں جاکے چلے لگانے کے لئے اپنے اپنے نام لکھوا دیئے، لیکن قانونی مسئلہ پیش آیا تو ان میں سے صرف تین آدمی آپ کے ساتھ جانے کو تیار ہوسکے تھے، جو یہ ہیں:

۱۔مولانا کا حقیقی ماموں صوفی رشید احمد/عبدالرشید صاحب رامویافاروی۔

۲۔الحاج صوفی عبدالسلام سوداگر پکتوفرانگی۔

۳۔جناب محمد یعقوب والد ابوالحسین صاحب فندوفرانگی۔

آپ ان تینوں کو ساتھ لے کر بنگلا دیش کے شہر چاٹگام پہنچے، چاٹگام سے بھی تین ساتھی آپ کے ساتھ رائیونڈ جانے کے لئے تیار ہوگئے تھے، اب چھ افراد پر مشتمل ایک جماعت بن چکی تھی، جبھی حکومت کو یہ معلوم ہوا کہ اس جماعت کا رخ رائیونڈ ہے تو حکومت کے افسروں نے بحری جہاز کے اعزازی ٹکٹ مفت حوالے کئے، یہ آپ کی مقبولیت اور اللہ تعالی کی طرف سے نصرت کا پیش خیمہ تھا، آپ نے بحری جہاز میں بھی تبلیغی کام کو جاری رکھا، ویسے یہ جماعت رائیونڈ پہنچ گئی تھی، جہاں آپ نے تین چلہ لگا کر وطن واپس آئے تھے‘‘۔

مولانا فیض الاسلام صاحب نے رائیونڈ سے واپسی کے بعد تنگ بازار کی معروف بستی رامویافارہ میں ایک عظیم تبلیغی اجتماع منعقد کرایا تھا، جس میں آپ کے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد صالح صاحب رنگونی (کل برما امیر جماعت تبلیغ وناظم تعلیمات مدرسہ صوفیہ) بشمول پچاس افراد نے شرکت کی تھی، کہا جاتا ہے کہ اس تبلیغی اجتماع سے پہلے ارکان میں اتنا بڑا تبلیغی اجتماع کہیں بھی نہیں ہو پایا تھا، اس اجتماع میں آپ نے اپنے بیانات سے لوگوں کو محظوظ اور تبلیغ کے اصول وضوابط سے واقف کرایا تھا، اس اجتماع سے کافی جماعتیں نکلیں، اجتماع کے اختتام کے بعد مولانا محمد صالح صاحب رنگونی نے آپ کو ان

کے ساتھ رنگون لے گیا، جہاں متعدد مقامات پر اجتماعات منعقد کئے گئے تھے، جن کی وجہ سے برمی مسلمانوں کو تبلیغی جماعت کے اصول وضوابط سیکھنا نصیب ہوا تھا۔

مولانا فیض الاسلام صاحب کو دوسرے قابل تذکرہ سفر ۱۹۹۷ء کو پیش آیا تھا، جس میں آپ کی معیت میں دو رفقائے سفر تھے:

۱۔ مولانا کے جان نثار ساتھی الحاج سید اکبر صاحب نارائن چنگی۔

۲۔ جناب الحاج محمد سلیم بن میر احمد سرجن صاحب بوسیدنگی۔

مولانا محترم شقدار فارہ مرکز میں تشریف لائے، اس کے بعد دوبارہ بوسیدنگ سے ہو کے اکیاب پہنچے، اکیاب میں بھی چند روز محنت کی، یہاں سے بذریعۂ ہوائی جہاز رنگون پہنچے، جہاں بھی آپ نے مولانا محمد صالح صاحب رنگونی کی زیر ہدایت چلے لگائے، اس کے بعد آپ دونوں ساتھیوں سمیت تھائی لینڈ پہنچے، یہاں آپ کو پاکر مسلمان بڑے خوش ہوئے، کئی مقامات پر اجتماعات بھی ہوئے تھے، اس کے بعد آپ مکہ مکرمہ پہنچے، نیت حج کی تھی، تاہم یہاں بھی آپ نے اپنے تبلیغی مشغلہ جاری رکھا، عرفات، مزدلفہ اور منی کے خیمے خیمے میں جا کر لوگوں کو راہ خدا کی طرف بلایا تھا، اس کے بعد آپ رائیونڈ پہنچے، جہاں کے اکابرین تبلیغ کی ہدایات کے مطابق چلے لگائے، اس کے بعد آپ بذریعۂ ہوائی جہاز دہلی تشریف لے گئے، یہاں بھی اکابرین کی ہدایات کے مطابق چلے لگائے، اس سلسلے میں آپ کاندھلہ، سہارنپور، گنگوہ، مظفر نگر، گجرات، مراد آباد، دیوبند، علی گڑھ، تھانہ بون، کلکتہ وغیرہ مقامات کے سفر کئے، الغرض یہاں چند مہینے گزار کر پھر رائیونڈ تشریف لے گئے تھے۔

پاکستان میں چند مہینے چلے لگا کر مولانا فیض الاسلام صاحب پھر ہندوستان پہنچے، پھر یہاں مزید چند مہینے گزار کر بذریعۂ ہوائی جہاز بنگلا دیش میں ہونے والے تبلیغی اجتماع میں شرکت کی، اس ٹونگی والے عالمی اجتماع کے اختتام پر آپ بذریعۂ ہوائی جہاز رنگون پہنچے، یہاں بھی چند مہینے تبلیغی محنت کر کے اکیاب آئے، یہاں بھی آپ نے دل کھول کر محنت کی، اس کے بعد بوسیدنگ سے ہو کر منگڈو کے مرکز شقدار فارہ پہنچے، یہاں آپ کی آمد پر ایک اجتماع منعقد کیا گیا، جس کے اختتام پر آپ اپنے دونوں ساتھی سمیت بوسیدنگ آگئے تھے۔ یاد رہے کہ مولانا فیض الاسلام صاحب کا یہ تبلیغی سفر ایک سالہ تھا، یعنی ایک سال مکمل دعوت

تبلیغ میں گزار کر آپ اپنے گھر لوٹے تھے۔

اس مذکورہ ٹونگی (ڈھاکہ) والے اجتماع میں راقم کو بھی شرکت کا موقع ملا تھا، یہاں اس نے مولانا فیض الاسلام صاحب اور آپ کے دونوں ہم سفر ساتھیوں سے ملاقات کی تھی، مولانا نے ایک خاص جلسہ میں راقم کو تبلیغی کاموں کی طرف توجہ دلائی، اور یہ احساس دلایا کہ علمائے کرام کو اس دینی و دعوتی کاموں سے لولگانا چاہئے، اس ملاقات کے دوران اندازہ ہوا کہ مولانا کو اس دعوتی کام سے حد درجہ لگاؤ تھا، راقم نے مولانا کے دونوں ساتھیوں سے اس طول طویل سفر کی روداد مانگی تو انہوں نے تفصیلات بیان کیں۔

مولانا فیض الاسلام صاحب کا تیسرا یادگار سفر ۲۰۰۰ء کو ہوا تھا، آپ کے ساتھ آپ کے دیرینہ ساتھی الحاج سید اکبر نارائن چنگی بھی تھے، بیرونی تبلیغی سفر کی نیت سے وطن سے نکل کر منگڈو والے مرکز میں گئے، وہاں سے بوسیدنگ کی راہ اکیاب پہنچے، پھر اکیاب سے رنگون ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچے، رنگون پہنچنے کے حوسے مولانا شبیر احمد صاحب رنگابالوی لکھتے ہیں کہ:

> ’’باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا کہ مولانا فیض الاسلام صاحب رنگون ایرپورٹ پہنچنے سے قبل پچیس گاڑیاں آپ کے انتظار میں کھڑی تھیں، ہر ایک کی دلی تمنا تھی کہ آپ کو اپنی گاڑی میں بٹھا کے مرکز تبلیغ رنگون میں پہنچانے کی سعادت حاصل کرے، آپ سے دعائیں لے اور آپ کی برکات وفیوضات سے سرفراز ہو جائے‘‘۔

غرض مولانا رنگون ہوتے ہوئے مکہ مکرمہ پہنچے، حج وزیارت سے سرفراز ہو کے رائیونڈ گئے، وہاں چلہ لگائے، اس کے بعد نظام الدین نئی دہلی گئے، وہاں بھی چند چلے لگائے تھے، اس کے بعد ہوائی جہاز کے ذریعے کلکرائل ڈھاکہ تشریف لائے، وہاں بھی اکابرین کی ہدایت پر چند چلے لگائے، اس کے بعد رنگون ہوتے ہوئے اکیاب پہنچے، یہاں بھی چند مہینے تبلیغی محنت کی، اس کے بعد بوسیدنگ ہوتے ہوئے شقدار فارہ مرکز پہنچے، یہاں چند دن گزار کے گھر تشریف لے گئے تھے۔

میرے علم وجانکاری کے مطابق مولانا فیض الاسلام صاحب کا یہی آخری بیرونی سفر تھا، جس کے بعد آپ کو دور دراز کے سفر کا اور موقع نہیں ملا تھا، اس سفر کے بعد دم آخر تک وطن میں رہتے ہوئے درس

وتدریس اور دعوت وتبلیغ کی خدمات انجام دیں۔

مولانا فیض الاسلام صاحب ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ خواتین چار کاموں میں مردوں سے آگے تھیں:

ا۔ایمان لانے میں۔

۲۔ایمان کے حوالے سے دعوت وتبلیغ میں۔

۳۔اللہ کے دین کی خاطر شہید ہونے میں۔

۴۔دین اسلام پر استقامت میں۔

مولانا فیض الاسلام صاحب کے نزدیک ان چاروں امور کے حوالے سے تفصیلات یہ ہیں کہ:

ا۔مولانا کا کہنا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت ملنے کے بعد سب سے پہلے آپؐ نے اپنی رفیقۂ حیات حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰؓ کو دعوت دی، تو وہ بلا چوں وچرا بطیب خاطر کلمۂ طیبہ پڑھ کر اسلام میں داخل ہوگئیں، اس لئے مولانا کا کہنا تھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے میں خواتین مردوں سے آگے تھیں۔

۲۔مولانا فیض الاسلام صاحب کا کہنا تھا کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے ہی پوچھا کہ حضور! آپ مجھ پر کیا حکم ہے؟ تو جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ تم بھی میرا عمل کیا کرو! جس طرح میرا کام دین کی دعوت اور تبلیغ ہے اسی طرح تم بھی میری امت ہونے کی وجہ سے دین کی دعوت دو اور تبلیغی کام کیا کرو، یوں حضورؐ سے جواب ملتے ہی انہوں نے مکہ مکرمہ کے گھر گھر جا کر خواتین کو دین کی دعوت دی، جن کی دعوت کی وجہ سے سیدنا عمر ابن الخطاب کی ہمشیرہ سیدہ ام کلثومؓ، سیدنا یاسر کی بیوی سیدنا یاسر کی والدہ سیدہ سمیہؓ جیسی خواتین نے اسلام قبول کرلیا، یوں ظاہر ہے کہ خواتین دعوت وتبلیغ میں مردوں سے آگے ہیں۔

۳۔مولانا فیض الاسلام صاحب کا کہنا تھا کہ سیدہ سمیہ بنت خیاط سیدنا عمار بن یاسر کی والدہ تھیں، جنہوں نے اپنے خاوند سیدنا یاسرؓ اور اپنے بیٹے سیدنا عمارؓ کی طرح اسلام کی خاطر قسم قسم کی تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کیں، لیکن اسلام کی جو سچی محبت ان کے دل میں گھر کرچکی تھی اس میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا، ان کو سخت دھوپ میں کنکریوں پر ڈالا گیا تھا، اسی طرح ذرع پہنا کر شدید دھوپ میں کھڑا

کیا جاتا تھا کہ دھوپ سے لوہے تپنے لگے اور اس کی گرمی سے زیادہ تکلیف ہو، ایسے حالات میں ادھر سے حضور اکرمؐ کا گزر ہوتا تھا، تو آپ صبر کی تلقین فرمانے کے ساتھ جنت کا وعدہ فرماتے تھے، مختصر یہ کہ ابوجہل لعنۃ اللہ علیہ نے ان کی شرم گاہ پر برجھا مارا تو آپ کی شہادت ہوگئی، جو اسلام کی سب سے پہلی شہیدہ تھیں۔

۴۔مولانا فیض الاسلام صاحب کا کہنا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں جتنی خواتین نے اسلام قبول کیا تھا ان میں سے کوئی بھی ایک خاتون ایسی نہیں تھی جو شریعت کے بوجھ، مشقت اور تکلیف کی وجہ سے دین سے پھر گئی ہو، علاوہ صرف ام الحکم بنت ابوسفیان کے، لیکن وہ بھی بعد میں مسلمان ہوگئی تھی، مگر مردوں میں سے بہت سے حضرات دین کی مشقت وتکلیف برداشت نہ کرپانے کی وجہ سے مرتد ہوگئے تھے، مولانا کا کہنا تھا کہ حدیث کی کتابوں میں ایسے واقعات بہت سے ملتے ہیں، جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ تعالی عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نصرانی تھا وہ مسلمان ہوگیا، سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران اس نے پڑھ لی ور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشی بھی بن گیا تھا، قرآن لکھا کرتا تھا، بعد میں وہ دوبارہ نصرانی ہوگیا، اب بدبخت یہی کہنے لگا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا جانتے ہیں بس میں اسے جو لکھ دیتا ہوں وہی جانتے ہیں، بالآخر وہ جب مرگیا تو زمین میں داب دیا گیا، صبح کو دیکھا کہ اس کی لاش زمین کے باہر پڑی ہوئی ہے، اب اس کے لوگ یعنی نصرانی کہنے لگے کہ یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کے اصحاب کا کرتوت ہے کہ ہم نے اس کی لاش جب زمین میں دفن کرآیا تو انہوں نے رات کو آکر اور قبر کھول کر ہمارے ساتھی کی لاش باہر پھینکی ہے، اب نصرانیوں نے دوبارہ گہری قبر کھودی اور اسے دوبارہ دفن کردیا، پھر صبح کو دیکھتے ہیں کہ اس کی لاش باہر پڑی ہے، اب نصرانیوں کو یقین ہوگیا کہ یہ کسی انسان کا کام نہیں ہے، اسے یوں ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔(بخاری جلد اول، ص:۵۱۱)۔

مولانا فیض الاسلام صاحب کے ذہن میں ہمیشہ یہ فکر رہتی تھی کہ کسی طرح مسلمان خواتین میں دینی علوم آجائیں، چنانچہ آپ کا کہنا تھا کہ جس طرح مردوں کے اندر علمی لیاقت واستعداد ہوسکتی ہے ٹھیک اسی طرح خواتین میں بھی علمی لیاقت واستعداد ہوسکتی ہے، مردوں کے اندر جس طرح حصول علم کا مادہ پایا جاتا ہے اسی طرح خواتین کے اندر بھی اس کا مادہ موجود ہے، اس لئے خواتین کے اندر علمی لیاقت و استعداد لانے کی فکر ناگزیر ہے، مولانا نے اس حوالے سے بہت اہم اور ضروری اقدامات بھی کئے اور

ایک حد تک کامیاب بھی ہوئے تھے۔

مولانا شبیر احمد صاحب رنگا بالوی کی روایت کے مطابق مولانا فیض الاسلام صاحب سے کرامات بھی صادر ہوئیں، جن میں سے چند کرامات کے تذکرے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کشف و کرامات اور خرق عادات کے متعلق کچھ ضروری چیزیں یہاں درج کردی جائیں، تاکہ ناظرین کرام کو اس سے کچھ علمی فائدے پہنچے۔

دراصل بات یہی ہے کہ عام عادات کے خلاف چیزوں کا کسی انسان سے صادر ہونے کو اصطلاح میں خرق عادات کہلاتے ہیں، جن کی چند قسمیں ہیں:

۱۔کشف کونی: وہ یہ کہ موجودات کے حالات جو اس کی نظر سے غائب ہیں خواہ ان کا تعلق زمانہ ماضی سے ہو یا مستقبل سے اس پر ظاہر ہو جائیں۔

۲۔کشف الٰہی: یعنی کوئی انسان اپنے یا دیگر سالکین کے احوال سے سلوک وطریقت کے راستے میں باخبر ہو جائے، اور ہر ایک کے متعلق اللہ تعالیٰ کی قربت کے مرتبے کا پتہ لگ جائے، اور تمام علوم جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق ہیں اسی قسم سے ہیں، بشرطیکہ عالم مثال میں کشف کی آنکھ سے دیکھے۔

ان خوارق کی ایک قسم الہام بھی ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی سالک طریقت یا کسی اللہ والے کے دل میں کوئی علم القاء کردے، اور ہاتف غیبی یعنی کسی فرشتے کا کلام بھی اس میں شمار ہے۔

کبھی کبھار نفس اور شیطان لعین کی طرف سے بھی ایک قسم کا القاء ہوتا ہے، جسے وسوسہ کہا جاتا ہے، اور الہام اور وسوسہ میں فرق یہ ہے کہ الہام سے سالک طریقت یا اللہ کے بندے کے دل میں اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے، بخلاف اس کے وسوسہ سے حاصل نہیں ہوتا، بلکہ دل مزید بے اطمینانی کا شکار ہو جاتا ہے۔

خرق عادات کسی نبی سے زمانۂ نبوت میں ظاہر ہو تو اسے اصطلاح میں معجزہ کہلاتا ہے، اگر بعثت سے پہلے ظاہر ہو تو اسے ارہاص کہتے ہیں، اگر کسی نبی کی پوری پوری تابعداری اور اتباع کرنے والے سے ظاہر ہو تو اسے کرامت کہلاتا ہے، اگر کوئی خرق عادات کسی عام مسلمان سے ظاہر ہو تو اسے معونت کہتے ہیں، اگر کسی فاسق وفاجر یا کسی غیر مسلم سے ظاہر ہو تو اسے استدراج کہتے ہیں۔

اب کرامت کے لئے اس ولی کو نہ اس کا علم ہونا ضروری ہے اور نہ اس کے ارادے کا اس سے تعلق ہونا لازمی ہے، اور کبھی علم ہوتا ہے لیکن ارادہ نہیں ہوتا، اور کبھی علم وارادہ دونوں ہوتے ہیں، اس بنا پر کرامت کی تین قسمیں ہوئیں:

۱۔ جہاں علم بھی ہو اور ارادہ بھی۔

۲۔ جہاں علم ہو لیکن ارادہ نہ ہو۔

۳۔ جہاں علم بھی نہ ہو اور ارادہ بھی نہ ہو۔

پھر اور ایک لحاظ سے کرامت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔حسی، ۲۔معنوی۔

عام لوگ اکثر حسی کرامت کو جانتے ہیں، اور اسے کمال سمجھتے ہیں، جیسے کسی کے دل کے حالات سے واقف ہونا، پانی پر چلنا، ہوا پر اڑنا وغیرہ وغیرہ، لیکن کاملین کے نزدیک بڑا کمال معنوی کرامت ہے، جیسے شریعت پر قائم و دائم رہنا، اچھے اخلاق واخلاص کی عادت ہونا، نیک کاموں کی پابندی اور بے تکلفی سے ہونا، حسد، کینہ، بغض، عداوت جیسی بری عادات سے دل کا پاک ہونا، کسی بھی سانس غفلت میں نہ گزرنا وغیرہ وغیرہ، یہ وہ کرامت ہے جس میں استدراج کا شبہ نہیں ہوتا، پہلی والی قسم میں شبہ موجود ہے، اس لئے کاملین سالکین کرامت کے ظاہر ہوتے وقت بہت ہی ڈرتے کہ کہیں یہ استدرج نہ ہو، یا خدانخواستہ اس سے نفس میں غرور نہ پیدا ہو جائے، کرامت کے حوالے سے یاد رہے کہ سب سے بڑی کرامت شریعت محمدیؐ پر استقامت کا حاصل ہونا ہے، اس حوالے سے بزرگوں کا معروف مقولہ ہے کہ ''**الاستقامة فوق الكرامة**''۔

اب خرق عادات اور کرامات کے متعلق چند ضروری باتوں سے واقف ہونے کے بعد مولانا فیض الاسلام صاحب کی طرف آتے ہیں، آپ کے متعلق مولانا شبیر احمد صاحب رنگا بالوی لکھتے ہیں کہ:

> ''چودہ سو سالہ اسلامی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو لاکھوں ایسے افراد امت میں نظر آئیں گے کہ جن سے بہت سی کرامات صادر ہوئیں، اصل میں نبی کے ذریعے ہو یا

ولی کے ذریعے خرق عادت امور کا صدور اللہ تعالی کی طرف سے ہوتا ہے، جن سے لوگ ہدایت کا نور پاتے ہیں، حق کے ثبوت کے لئے یہ امور دلیل ہوتے ہیں، حقیقی کرامت تو استقامت علی الدین ہے، جیسا کہ مقولہ مشہور ہے کہ ''الاستقامۃ فوق الکرامۃ'' قطب زمان مولانا فیض الاسلام صاحب کی سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ آپ کی پوری زندگی شریعت کے تقاضے کے مطابق، امت کی اصلاح کی فکر، دعوت وتبلیغ اور تعلیمی وتدریسی خدمات انجام دینے میں گزر گئی ہے، جسے کرامت معنوی کہتے ہیں، جب کہ آپ کی طی زمانی اور طی مکانی، ظاہری وحسی، روحانی اور باطنی کرامات کے واقعات بھی بہت ہیں، جو احاطے سے باہر ہیں، یہاں چند واقعات بطور مونہ نقل کئے جاتے ہیں: (۱)

۱۔ حضرت مولانا فیض الاسلام صاحب بڑی خوش قسمت بزرگ تھے، ایسے زمانے میں برما سے عموما اور ارکان سے خصوصا برمی قوانین وشرائط کے مطابق عازمین حج بیت اللہ کے لئے حجاز جانے پر بھاری رقم خرچ ہوتی تھی، مگر آپ کے لئے برمی حکومت کی طرف سے ایسی کوئی شرط نہیں تھی، آپ کے لئے ہر سال حج کو جانے کی اجازت تھی، آپ کے لئے راستہ ہر حال میں کھلا ہی کھلا رہتا تھا، یوں آپ نے اپنی مستعار زندگی میں دس مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے شرف سے مشرف ہوئے تھے، جب کہ مولانا بظاہر کوئی صاحب ثروت ودولت بھی نہیں تھے، آپ کے پاس صرف اور صرف کفایت شعاری کی حد تک دولت اور جائداد تھی، ایسے حالات میں دس دس مرتبہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کو جانے کی سعادت حاصل کرنا یہ آپ کی کرامت نہیں تو اور کیا تھی؟

۲۔ مولانا شبیر احمد صاحب صوفی عبد السلام سوداگر صاحب مرحوم سے روایت کرتے ہیں کہ میں مولانا فیض الاسلام صاحب کا رفیق سفر تھا، اس زمانے میں مولانا موصوف پاکستان میں چلا لگا رہے تھے، ایک

---

(۱) مولانا شبیر احمد صاحب رنگابالوی کو اللہ تعالی جزائے خیر دے، انہوں نے مولانا فیض الاسلام صاحب کی کرامات کے حوالے سے بڑی تفصیلات سے لکھی ہیں، لیکن ان میں سے میں نے کچھ اجمال یہاں لایا ہوں، یہاں صرف ان کا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

روز کا واقعہ ہے کہ ہم آپ کے ساتھ ایک رخ پر جا رہے تھے، بیچ میں ایک دریا پڑا، اب اس دریا کو پار کرنے کے لئے بظاہر کہیں بھی کوئی کشتی نہیں تھی، ادھر اندھیری چھا رہی تھی، اب ہم پریشان تھے، اور آپ بھی متفکر، ایسے حالات میں اچانک ایک کشتی نکل آئی، اور ملاح نے آپ سے عرض کی کہ آپ سب اس کشتی پر سوار ہو جائیں، ویسے ہم سب سوار ہو گئے، آپ نے اس ملاح سے پوچھا کہ بھائی تم کون ہو؟ لیکن ملاح نے کوئی بھی جواب نہیں دیا، کشتی اس پار لگی تو آپ نے اسے معاوضہ دینا چاہا تو اس نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ اب تم جا سکتے ہو، اپنے کام خوب دل لگا کر کرو، یہ کہہ کر ملاح کشتی لے کر کہیں غائب ہو گیا، ہم سب حیران تھے، بعد میں دل میں آیا کہ یہ اللہ تعالی کی جانب سے مدد ہے، اور مولانا کی ایک کرامت بھی، جو اللہ کے ولیوں سے صادر ہوا کرتی ہے۔

۳۔ مولانا شبیر احمد مولانا فیض الاسلام صاحب کے جان نثار ساتھی حاجی سید اکبر صاحب نارائن چنگی سے روایت کرتے ہیں کہ میں مولانا فیض الاسلام صاحب کی معیت میں براہِ رنگون وبنکاک حجاز مقدس کو جا رہا تھا، ہوئی جہاز میں نماز کا وقت ہوا، تو آپ نے جہاز کی خادمہ سے فرمایا کہ ہم مسلمان ہیں، اب نماز کا وقت ہو چکا ہے، اسی لئے ہمیں نماز کے لئے جگہ فراہم کی جائے، لیکن خادمہ نے آپ سے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ایک تو نماز کے لئے جگہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے، پھر دوسری بات یہ ہے کہ اگر سواری لوگ ادھر ادھر حرکت کریں گے تو جہاز کے لئے خطرہ ہے، خادمہ کی یہ بات سن کر آپ خاموشی سے اٹھے اور سیدھے کپتان کو جا کے سابقہ بات دھرائی، یوں کپتان نے اس خادمہ کو بلا کر کہہ دیا کہ جلدی ان کے لئے نماز کی جگہ بنا دی جائے، ویسے ہم سب نے باجماعت نماز ادا کر لی، یہ دراصل آپ کی ایک واضح کرامت تھی کہ جس خادمہ نے اس سے پہلے نماز کے لئے جگہ فراہم کرنے سے انکار کر دیا تھا اب اس خادمہ کو خود ہمارے لئے نماز کی جگہ بنانی پڑی تھی۔

۴۔ مولانا شبیر احمد صاحب مولانا عزیز اللہ سے اور وہ مولانا فیض الاسلام صاحب کے داماد مولانا سعد اللہ صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ ایک دن کا واقعہ تھا کہ پکتوفرانگ (تنگ بازار) کی بستی میں اچانک آگ لگ گئی تھی، اور دیکھتے ہی دیکھتے تقریبا چالیس مکانات جل کر بھسم ہو گئے تھے، ادھر آگ بجھنے کا نام تک نہیں تھا، یہ خبر مولانا فیض الاسلام صاحب کے یہاں پہنچی تو آپ جلدی سے بستر سے

اٹھے، اور دعا کرنے لگے، آپ دعا سے فارغ ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے آگ بجھ گئی اور بقیہ مکانات جلنے سے بچ گئے تھے۔

۵۔مولانا شبیر احمد صاحب مولانا سعد صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ ہمارے علاقہ تنگ بازار میں قائم کی گئی برمی فوجی چھونی کا سرپرست جسے برمی زبان میں ''نیمرے مؤ'' کہا جاتا ہے کو کسی جاسوس نے یہ خبر دی کہ مولانا فیض الاسلام صاحب نے حکومت کی اجازت کے بغیر مدرسہ کی مرمت کی ہے، یہ سن کر فوجی سرپرست نے آگ بگولہ ہو کر مولانا کے مدرسے کی راہ لی، اثنائے راہ میں چائے کی دکان پڑی تو وہ چائے پینے کے لئے دکان میں داخل ہوا، ابھی چائے کا گرم پیالہ ہاتھ لیا تو ٹکرا کر اس کے جسم میں گرا، اس واقعہ سے اس نے یہی سمجھا کہ یہ ایک بدفالی ہے، یوں واپس ہوگیا، لیکن دوسرے دن دوبارہ آیا، لیکن مدرسے میں داخل ہوتے ہی ٹھوکر کھائی اور بانس کا ایک ٹکڑا اس کے پاؤں میں گھس گیا، اس مصیبت سے وہ سخت پریشان ہوگیا، یوں پچھلے دن کی طرح اسے ایک اور بدفالی سمجھ کر واپس ہوگیا، ویسے مولانا کا مدرسہ اس اوباش کی شرارت سے بچ گیا تھا۔

۶۔مولانا شبیر احمد صاحب بیان کرتے ہیں کہ لگ بھگ ۲۰۱۲ء کا واقعہ ہے کہ مجھے حضرت اقدس کے سایۂ لطف وعاطفت میں دارالعلوم تنگ بازار میں دو سال تدریسی خدمات انجام دینے کا شرف حاصل ہوا، اسی دوران حضرت کی معیت میں سہ روزہ، مرکز میں شب بیداری، جوڑ اور اجتماعات کے علاوہ دور دراز والی جماعت کے ساتھ جانے کا شرف حاصل رہا، اس سلسلے میں ایک دفعہ مولانا منگڈ وشقدار فارہ والے جوڑ میں شرکت کے لئے اپنے خاص خاص مامورین سمیت جارہے تھے، بوسیدنگ سے گاڑی پر سوار ہوئے، لیکن اثنائے راہ میں گاڑی خراب ہوگئی، اب ہم سب سراسیمہ اور پریشان تھے، کیوں کہ ایک طرف سورج غروب ہونے جارہا تھا دوسری طرف ہم ایک ایسے مقام پر تھے جہاں دور دور تک پناہ لینے کی کوئی جگہ نہ تھی، ایسے میں ہم میں سے ایک صاحب نے کہا کہ پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، ہمارے مابین مولانا فیض الاسلام صاحب موجود ہیں، ابھی اس کی زبان سے بات ختم بھی نہیں ہوپائی کہ اچانک ایک خالی گاڑی ہمارے پاس آرکی، اور ڈرائیور نے بڑے ادب سے آپ سے کہا کہ حضرت! آپ بشمول اپنے تمام ساتھی میری گاڑی پر سوار ہوجائیں، یوں ہم سب گاڑی پر

سوار گئے اور ہم سب کو مفت پر مرکز پہنچا کر دم لیا، اللہ تعالیٰ اس ڈرائیور کو جزائے خیر دے۔

۷۔مولانا شبیر احمد صاحب مولانا فیض الاسلام صاحب کے مخلص خادم مولوی عبدالجلیل صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ: ۵/دسمبر/۱۹۸۶ء کا واقعہ تھا کہ ہماری جماعت مولانا عبدالقدوس صاحب نلبنوی کی زیر نگرانی تنگ بازار کی معروف بستی پیر خالی کی جامع مسجد میں ٹھہری، حسن اتفاق سے مولانا فیض الاسلام صاحب بھی چوتھے ہفتے کی سہ روزہ جماعت لے کر ہماری جماعت کی نصرت کے لئے پہنچ گئے، سنیچر کی رات تہجد کے بعد ہماری جماعت کے ساتھی مولانا عبدالغفار صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لے کر وصولی گشت میں جانے کے لئے مولانا فیض الاسلام صاحب سے اجازت مانگی، اس پر مولانا نے فرمایا جاؤ لیکن فجر کی نماز کے بعد، اس پر مولانا عبدالغفار صاحب نے کہا کہ حضرت! فجر کے بعد جانے سے مشکل یہ ہوگا کہ ہم جس کے پاس جارہے ہیں وہ بوسیدنگ کو نکل جائے گا، لیکن پھر بھی مولانا نے بعد نماز فجر جانے پر اصرار کیا، لیکن مولانا عبدالغفار صاحب کی بار بار گزارش سے آپ نے اس شرط پر اجازت دی کہ جاؤ لیکن آٹھ بجے تک واپس آنا، اب ہم نے بستی تمیز الدین فارہ میں نماز فجر ادا کی، پھر یہاں سے گزنگیا فارہ کو روانہ ہوئے، لیکن خدا کی قدرت تھی کہ ہم آٹھ بجے تک گھومتے گھومتے تھک تو گئے لیکن تین بھیگا زمین سے آگے قدم نہ بڑھا سکے، آخر ہم دونوں مجبور ہو کے واپس آ گئے تھے۔

۸۔مولانا شبیر احمد صاحب مولانا عبدالجلیل صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ: مولانا فیض الاسلام صاحب کی آخری علالت میں میں اور مولانا کا بیٹا محمد الیاس آپ کو لے کر بغرض معالجہ کاکس بازار پہنچا، ہمیں آپ کو لے کر ڈھاکہ جانا تھا، اب ہوا یہ کہ ہمارے یہاں پہنچنے سے قبل مولانا رفیق الرحمن صاحب کوانچی بنگی کوکس بازار سے ڈھاکہ جانے کے لئے ہوائی جہاز کے ٹکٹ حاصل کر چکے تھے، ویسے ہم تینوں ڈھاکہ ہوائی اڈہ پہنچ گئے، اب میں مولانا اور صاحب زادہ محمد الیاس کو چھوڑ کر سامان وصول کرنے گیا ہوا تھا، اچانک ایک آدمی آیا اور آواز لگائی کہ مولوی عبدالجلیل کون ہیں؟ اور بڑے امیر صاحب کون ہیں ؟؟ میں نے اس کے جواب میں مولانا کی طرف اشارہ کیا، ویسے اس نے ہمیں گاڑی پر بٹھا کر سیدھے ہسپتال پہنچا دیا، اب جدائی پر میں نے اس سے پوچھا کہ صاحب آپ کون ہیں اور آپ کو کس نے بھیجا ہے

؟جواب ملا کہ مجھے مالک نے حضرت امیر صاحب کی رہبری کے لئے بھیجا ہے، یہ کہہ کر چل دیا۔

۹۔مولانا شبیر احمد صاحب مولانا عبدالجلیل صاحب سے روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک مرتبہ مولانا فیض الاسلام صاحب کے ساتھ شقدار فارہ جوڑ سے واپس آرہے تھے، راستے اثنائے راہ ایک بستی میں ہم نماز عصر کے لئے ٹھہرے، وہاں کے تین پرانے ساتھیوں نے آپ سے عرض کی کہ ان کی بستی کے امام صاحب دعوتی کام کے آگے رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں، توان کے جوب میں آپ نے فرمایا کہ اگلے سال اس امام صاحب کو معزول کردو، لیکن ان ساتھیوں نے کہا کہ حضرت یہ ناممکن ہے، کیوں کہ اس مسجد کا متولی اس امام صاحب کا ماموں ہے، متولی اپنے بھانجے کے علاوہ کسی دوسرا امام مقرر کرنا نہیں چاہتا ہے، توحضرت نے فرمایا کہ تم لوگ اطمینان سے دعوت کے کام میں لگے رہو، اللہ تعالی اس امام کو معزول کر کے دعوت کے کام میں آنے والی رکاوٹ کو دور کردے گا، اس کے بعد ہماری جماعت کا رخ کوار بیل طے ہوا، ابھی ہم وہیں پہنچے دیر نہیں ہوئی کہ ہمارے ساتھی سلطان احمد نے خوش خبری سنائی کہ اللہ تعالی نے مولانا کی پیش گوئی کے مطابق اس امام صاحب کو امامت سے معزول کردیا اور دعوت کے سامنے آئی ہوئی رکاوٹ ہٹادی، اب ہم سب حیران اور ششدر رہ گئے تھے، کہتے ہیں کہ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔

۱۰۔مولانا شبیر احمد صاحب مولانا فیض الاسلام صاحب کے خادم خاص اور مخلص ساتھی حاجی سید اکبر نارائن چنگی سے روایت کرتے ہیں کہ: ہم مولانا فیض الاسلام صاحب سمیت ماہ رمضان میں رنگون جارہے تھے، اکیاب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے لئے بذریعۂ ہوائی جہاز رنگون کا سفر بند کردیا گیا ہے، اب ہم پریشان تھے، یوں ہم نے عملہ فارہ والی جامع مسجد میں نظام جماعت کے مطابق دعوتی کام شروع کردیا، ساتھ ہی ساتھ دعا اور مناجات میں مشغول ہوگئے، اگلے دن صبح سویرے اکیاب شہر کے ایک اعلی سرکاری عہدے دار ہم سب کے لئے ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ مسجد کی آنگن میں آٹھہرا، اور کہہ رہا تھا کہ یہاں مسلمانوں کے بڑے امیر صاحب کون ہیں؟ میں اس کے لئے ٹکٹ لایا ہوں، اس کے بعد سارے ٹکٹ ہمارے حوالے کرکے ہمیں لے کر سیدھے ایرپورٹ پہنچا، حتی کہ ہم سب کو ہوائی جہاز پر بٹھا کر واپس ہوگیا تھا۔

۲۰۰۵ء میں مولانا فیض الاسلام صاحب حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی سعادت حاصل کر

کے وطن واپس آئے تو آپ کو معدہ اور کلیجہ میں درد محسوس ہوا، ایک مہینے تک وطن میں پائے جانے والے مختلف ڈاکٹروں سے معالجہ توکرایا گیا لیکن افاقہ نہیں ہوا، اور آئے دن کم زوری بڑھتی ہی گئی تھی۔

۱۳ / ۱۱ / ۲۰۰۶ء کو درد کی شدت محسوس ہوئی تو بوسیدنگ کے معروف ڈاکٹر بشیر احمد صاحب سے معاینہ اور علاج کرایا گیا، لیکن شفا تو دور کی بات آئے دن آپ کے جسم لاغر اور نحیف ہوتا گیا ، ایسے حالات میں آپ کو بنگلا دیش لے جانے کا فیصلہ کیا گیا، چنانچہ معالجہ کے سلسلے میں آپ کو بنگلا دیش چند مرتبہ لے جایا گیا تھا، لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی والی بات سامنے آئی تھی، بالآخر ۲۷ / ۷ / ۲۰۰۷ء کو بروز سنیچر گیارہ بج کر پینتیس منٹ میں آپ کی روح انور جسد خاکی سے پرواز کرگئی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

الحاج مولانا حافظ قاری جمال الدین احمد صاحب نائن چنگیؒ:

میرے والد محترم مولانا حافظ، قاری، الحاج جمال الدین احمد بن نجوم الدین بن اکبر علی میر جی بن یوسف علی کی ولادت ۱۹۳۹ء میں شمالی منگڈو کی معروف و مردم خیز بستی نائن چنگ میں ہوئی، میرے والد کی ولادت سے پہلے میری دادی سے اور بھی پانچ بچے پیدا ہوئے تھے، لیکن سب نے بچپن ہی میں داغ فراغ دے گیا، ان میں سے کسی نے بھی ایک سال سے زیادہ عمر نہیں پائی، میری دادی نے اب منت مانی کہ اللہ تعالی اور ایک بیٹا عطا کرے گا تو اسے حافظ القرآن اور عالم دین بناؤں گی، یوں اللہ تعالی نے ان کی منت پوری کی، اور میرے والد صاحب پیدا ہوئے۔ الحمد للہ نے ان کو حافظ، عالم، حاجی، داعی، اور معلم و مدرس بنایا۔

جس طرح عرض کی گئی ہے کہ میرے والد صاحب کی ولادت ۱۹۳۹ء میں بستی نائن چنگ میں ہوئی، تاریخ ولادت کے حوالے سے ان کا ایک قومی شناختی کارڈ کو سند بنایا گیا ہے، جس میں ۱۹۳۹ء کا سن صاف طور پر موجو ہے۔ جہاں تک میں جانتا ہوں اور میری دادی سے سنا ہوں کہ یہی تاریخ صحیح ہے، میری دادی کہتی تھی جب تیرا باپ پیدا ہوا تو نہ صرف میرے گھر میں بلکہ پورے خاندان میں خوشی کا سماں چھا گیا تھا، البتہ میری دادی کو خدشہ ستا تا رہا تھا کہ کہیں یہ بچہ بھی دنیا سے داغ حسرت دے نہ جائے! الحمد للہ میرے والد صاحب تو زندہ ہی رہے بلکہ میرے والد کے علاوہ میری دادی جان کے بطن سے اور بھی چار بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئی، سارے کے سارے دنیا میں طویل عمر پائے۔ تا حال میرے والد کے علاوہ میرے دو چچے کالا میاں، ابو الحسین وفات پا گئے، اور میری اکلوتی پھوپی میمونہ خاتون بھی انتقال کر گئی، اللہ تعالی ان سب کی مغفرت فرمائے اور جنت الخلد میں جگہ عطا کرے، باقی میرے دو چچے نبیہ حسین اور اقبال حسین صاحبان حیات سے ہیں، اللہ تعالی ان کی عمر میں برکت دے، آمین۔

بستی نائن چنگ:

نائن چنگ کی بستی منگڈو ٹاؤن کے شمال میں کوئی اٹھارہ میل دور کوہ مایو کے مغربی ڈھلوان میں کیاری فرانگ کی بستی کے مشرق اور فوخالی کے شمال میں واقع ہے۔ یہ جگہ قدیم زمانے سے غیر آباد تھی،

اس بستی کے مشرق میں بالکل پہاڑ کے ڈھلوان میں ایک مگھ بستی تھی، نہ جانے کس وجہ سے وہ بستی ویران ہوگئی، اور ہمارے زمانے میں مگھ نام کا کوئی انسان وہاں نہیں رہتا تھا، بہرحال مسلمانوں نے اس جگہ کو آباد کیا اور ایک عظیم الشان بستی کی حیثیت سے آج بھی الحمد اللہ آباد ہے۔

روایت سے معلوم ہوا کہ برطانوی دور کے اواخر تک اس بستی کی ساری زمینیں مسلمانوں نے آباد کر لیں، مگر علی دو بھاشی نامی ایک آدمی کہیں سے آٹپکا اور ان مسلمانوں پر مسلط ہوگیا۔ یعنی اس نے برطانوی بھگوڑوں سے ساز باز کے ذریعے یہاں کی تقریبا تمام زمینوں پر اس نے قبضہ ''ٹپہ'' لگا لیا تھا، اور ہر ایک غریب کاشتکاروں سے ہڑپتے ہوئے تقریبا ساری آباد اور غیر آباد زمینوں پر دستاویزات کی شکل میں قبضہ کر لیا تھا، اس دوران علی دو بھاشی سے بعض خاندانوں کے رؤسا نے کچھ مزاحمت کی، جن خاندانوں نے مزاحمت کی، ان کو کچھ نہ کچھ زمینیں ملی تھیں، بقیہ تمام خاندانوں کو اطاعت کی لعنت قبول کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا، خصوصا جن لوگوں نے عرصہ دراز سے اپنے خون پسینوں سے ان زمینوں کو آباد کیا، ان کو ''رعایا'' کا خود ساختہ خطاب دے دیا گیا تھا، روایت سے معلوم ہوا کہ علی دو بھاشی بڑا چالاک اور عیار آدمی تھا، یہاں ان کے سامنے کسی کو دم مارنے اور زبان ہلانے کا حق بھی نہیں دیا گیا تھا، کوئی زبان کھولے تو اس کی حالت بہت بری کر دی جاتی تھی، بعض خاندانوں کے رؤسا کو انہوں نے اپنے ہمنوا بھی بنا لیا، یا بننے پر مجبور کر دیا تھا، کاشتکاروں میں سے کوئی اگر ہمت کر کے یہ کہہ دے کہ جناب فلاں جگہ تو ہم نے اپنے خون پسینے اور دن رات کو ایک کر کے آباد کیا تھا، کیوں نہ آپ اس زمین کی دستاویزات اور مستندات میرے نام کر دیتے؟ تو جواب مل جاتا تھا کہ:

> ''ارے او میاں! تم کو زمین کی ضرورت ہے، کاغذات سے کیا کرو گے؟ تم اس زمین پر کھیت کیا کرو، ہل چلاؤ، کھاؤ پیو، عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو، اور مجھے لگان دو، زمین تو تمہاری ہے اور دستاویزات میری، میرے جیتے جی تم سے تمہاری زمین کوئی چھین نہیں سکتا''۔

میں ذاتی اور اصولی طور پر روس جیسے دیگر ملکوں کی کمیونسٹ اور سوشلسٹ منشویک اور بالشویک انقلاب کا سخت ترین ناقد ہوں، مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ بر ژوے ویسے ہوں تو انقلاب آنا ضروری تھا،

لیکن یہاں انقلاب کرے تو کون کرے؟ تمام کے تمام لوگ علم و ہنر سے تقریباً نابلد اور ناآشنا تھے، غریب اور مسکین کو بھی ظلم و جبر کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کے لئے علم و دانش کی بھی ضرورت ہوتی ہے نا! یہاں تھوڑے بہت علم ہے تو علی دوبھاشی اور اس کی اولاد کے پاس، کاشتکاروں کو بس یہی کہا گیا تھا کہ علم پڑھ کے کیا کروگے، علم سے پیٹ بھرتا نہیں، جاؤ کھیت کلیان میں کام کرو، علم تمہارا کوئی کام نہیں دے گا اور نہ ہی دے سکتا۔ ویسے یہاں غریبوں میں علم و دانش تو کجا، یہ لوگ ایک طویل زمانے تک انسانی شعور سے بھی عاری ہو چکے تھے، یا عاری بنا دیئے گئے تھے، کہنے میں علی دوبھاشی دنیا سے حج، عمرہ کرکے، یتیم خانے، مسجد، حفظ خانہ بنا کر چلا گیا، لیکن اس نے جن یتیموں، مسکینوں، غریبوں اور کاشتکاروں کے خون پسینے سے سینچی ہوئی زمینوں کو ہڑپ کر ان سے حاصل شدہ اموال و زر سے نام، دولت، شہرت، عزت کمائی، اور نام نہاد صدقہ جاریہ کے ذریعے اپنے اعمال کو دنیا وآخرت میں بھرنے کی کوشش کی، آیا ان پر اللہ اور اس کے رسول کبھی خوش بھی ہو سکتے ہیں؟

بڑی عجیب سی بات ہے، ہمارے یہاں مظالم ہر جانب سے ہوئے تھے، مظالم غیروں نے بھی کئے اور اپنوں نے بھی، مسلمانوں پر مسلمانوں نے بھی ڈھائے اور غیر مسلموں نے بھی، عوام مسلم باشندے بڑے بے کس اور کس مپرس تھے، اور اب بھی ہیں، عوام ناخواندہ اور علم و ہنر سے ناآشنا، ان میں اگر کوئی شاذ و نادر کچھ پڑھا لکھا اور چالاک سا ہوتو وہ مسلمانوں کا دشمن اور بھگوڑوں کا خوشامدی بن بیٹھا، ظالموں سے قربت کے ذریعے یہاں کے ناخواندہ مسلم باشندوں پر قائد بنے مظالم پر مظالم کا سلسلہ شروع کر دیا، ان چالاک اور خوشامدی چیلوں اور گماشتوں کا راج ایک کلیہ بن چکا تھا، ہر دور میں چاہے دور برطانوی ہو یا برمی کہ ان چیلوں نے سرکار کے پٹھو بن کر یہاں کے مسلم معاشرے میں تباہی مچا دی تھی، آج کل بھی صورت حالات ایسے ہیں کہ حکومت برما ہر ایک مسلم بستی بلکہ گھر گھر میں اپنے چیلے اور گماشتے بٹھا رکھی ہے، یہاں کیا کچھ ہو رہا ہے حکومت کے لالے پالے غنڈے حکمرانوں کو خبر کر دیتے ہیں۔

بات کہاں سے کہاں نکل گئی ہے۔ الغرض طرفہ یہ تھا کہ قبیلے کے بعض سرداروں سے علی دوبھاشی رہ رہ کر اطاعت شعاری کا امتحان بھی لیا کرتا تھا، امتحان کے سوالات بھی بڑے نرالے اور بڑے عجیب

انداز کے ہوا کرتے تھے، ان میں سے نمونہ کے بطور ایک سوال کے سلیقے پر آپ بھی روئیں اور پیٹیں کہ:

> ”ایک روز کا واقعہ تھا کہ علی دوبھاشی ایک بڑے تالات کے کنارے پر کھڑے کھڑے گاؤں کے چند سرداروں سے بولنے لگا، مجھے لگتا ہے کہ اس تالات کے پانی کا سطح ادھر نیچا اور اونچا ہے، اب اس کے ایک سے زیادہ اطاعت شعار خوشامدی بول پڑے کہ جناب کا فرمانا بالکل حق بجانب اور صحت پر مبنی ہے، اور ہمارا بھی یہی خیال ہے، تاہم دو ایک نے جھٹ سے اس کے منہ پہ بول دیا کہ جناب یہ کیسا ہوسکتا ہے، ایک ہی تالاب کا پانی ایک جانب نیچا اور دوسرے جانب نیچا؟ یہ تو بے وقوفی کی بات ہے، مگر اس امتحان میں اس کی نظر میں وہ لوگ پاس ہوئے جنہوں نے اس کے ہاں میں ہاں ملایا، اور اس کی اس لغو بات سے اتفاق کر لیا تھا“۔

زمانے کا دستور بھی بڑا نرالا ہوتا ہے، مہذب ملکوں میں اگر کچھ عطا ہوتا ہے تو اطاعت شعاروں کو، مگر ہمارے یہاں اس جیسے تمام معاملے کا دستور ہی الٹا تھا، یہاں خوشامدی اور اطاعت شعار ذلیل و رسوا اور مخالف دشمن مکرم و محترم ہوتا تھا، یہاں دستور ایسا نہ ہوگا تو کیا خاک ہوگا، جس جنگل کا گیڈر راجا اس جنگل کا خدا حافظ، الامان والحفیظ۔

برطانوی بھگوڑے چلے گئے تو اونو کا دور شروع ہوا، اس دور میں بھی علی دوبھاشی کی اولاد نائن چنگ کے غریب مسکینوں کی گردن پر سوار تھی۔ نیون کے دور حکومت کی ابتدا میں ملک میں سوشلزم کا قانون لاگو ہوا تو ملک بھر کے تاجروں، برژواؤں، زمینداروں پر قومیانے کی صورت میں ایک عظیم مصیبت کا مہیب طوفان امنڈ آیا، ویسے علی دوبھاشی کی اولاد بھی طوفان کی لپیٹ میں آ گئی تھی، اور بھنور میں ایسی پھنسی کہ ماضی اور حال کو بھول بھلا کر مستقبل کی فکر میں در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گئی تھی۔ جیسے کہ پہلے بھی عرض کی جا چکی ہے کہ میں ذاتی طور پر سوشلزم اور کمیونزم کا اصولی دشمن ہوں، اور ایک مسلمان ہوں، ایک مسلمان جس طرح اسلام سے محبت کرتا ہے، میں بھی اسلام سے محبت کرتا ہوں، جہاں تک میرا خیال ہے کہ اونو اور نیون کی شکل میں جو بلا یہاں نازل ہوئی وہ قدرت کا ایک عجیب اور نرالا کھیل ثابت ہوئی، یہاں ایک ظلم نے دوسرے ظلم کو ختم کیا، کاش یہاں عدل آیا ہوتا، مگر نہ

آ سکا، اورلانے کی کوشش بھی کب اور کہاں ہوئی؟ ظلم یہاں بادِصرصر کی شکل میں برسوں سے چلتا رہا تھا، اس کے خلاف یہاں آندھی کی صورت میں طوفان آیا، اور بادِصرصر سمیت ساری چیزوں کو تنکے کی طرح اڑا کر لے گیا تھا۔

دنیا میں خودغرضی اورعصبیت ایک بہت بڑی بلا اور لعنت ہوتی ہے، یہاں خودغرضی تو ظاہر سی بات تھی ۔ دوسروں کی دولت سے اپنے جیب گرم کرنے، دوسروں کی رسوائی سے اپنی عزات کا دامن بھرنے، معاشرے میں نفرت پھیلا کر اپنی شہرت کا ڈھنڈورا پیٹنے پٹوانے، دوسروں کی اولاد کو ذلیل کر کے اپنی اولاد کو عزت بخشنے، دوسروں کے خون پسینوں سے اپنی عیاشی اور بدمستی کی دنیا آباد کرنے کا ایک سلسلہ شروع کیا جا چکا تھا، یہاں تعصب کی یک عجیب کرشمہ سازی ہو رہی تھی، یہاں غریبوں کی ہڈیوں پر عشرت کدہ تعمیر ہو رہا تھا، یہاں اپنی چودھراہٹ کو چمکانے کے لئے ایک خطرناک قسم کا کھیل کھیلا جا رہا تھا، اپنی اولاد کو گاؤں کی تمام اولاد پر اونچ بنانے کا عوام میں ذہنی تصور ڈالنے کی کوشش کی جا رہی تھی، بعض حالات میں شاید دنیا میں تکبیر ہوا کرتا ہے، لیکن ایسے بے سروسامان متکبروں پر کیا رائے قائم کی جائے، جن کے تکبر اور غرور کی بنیاد صرف ذہنی ہو، پر یہ تکبر، یہ عصبیت، یہ غرور کس سے ہے؟ خود اپنی قوم سے ہے، اپنے ہی مسلمان بھائیوں سے ہے، اپنے ہی پڑوسیوں سے ہے۔ یہ لوگ نماز ادا کرتے ہیں تو ایک ہی مسجد میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر، عید مناتے ہیں تو ایک ہی عیدگاہ میں، پانی ایک ہی کنویں سے اور ایک ہی تالاب سے پیتے ہیں، جیتے ہیں تو ایک ہی فضا میں، اور مر کر دفن ہوتے ہیں تو ایک ہی قبرستان میں، لیکن مسجد کے بلند و بالا مناروں سے بلند ہونے والی اذانیں، جمعہ اور عیدگاہ میں کی جانے والی ایمانی اور روحانی تقریریں ان بدمستوں کی کانوں تک نہ پہنچ سکیں، دنیا میں معاشرتی اور سماجی اعتبار سے مسلمان ایک ہی حیثیت کے ہوتے ہیں، ان میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ تقوی کی بنیاد پر ہے بس، ظلم برمیوں اور مگھوں کی جانب سے ہو تو بھی ظلم، ظلم مسلمانوں کی طرف مسلمانوں پر ہو تو وہ بھی ظلم ہے۔ ظلم کبھی اور کہیں جا کر عدل نہیں ہو سکتا، یہاں باتیں کفر و طاغوت کی نہیں، بلکہ حق، باطل کی ہیں۔

علی دو بھاشی کے ساتھ ظاہر ہے کہ دو بھاشی کا لقب چسپاں ہے، بعد میں یہ چودھری کیسا بن گیا

معلوم نہیں۔ پھر لطف کی بات ہے کہ اس کی اولاد میں بعض حضرات بھی اپنے آپ کو چودھری کہلاتا ہے، علاوہ ازیں وہ اور اس کی اولاد میں بعض لوگ اپنے نام کے ساتھ دو بھاشی کا لقب بھی چسپاں کر لیتے ہیں، مگر ہوتے اس لقب کے خلاف و برعکس، لفظ چودھری اگرچہ خود ساختہ ہی کیوں نہ ہو، زمیندار ہونا شرط ہے، چودھری بننے کے لئے اہل ثروت ہونا لازمی امر ہے، مگر علی دو بھاشی کی اولاد میں بعض حضرات در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے تھے، لیکن چودھری کا لفظ اس کے ساتھ بھی چسپاں۔

کبھی کبھار ارکانی مسلمانوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک آدمی چند مہینے پہلے فقیر یا مسکین تھا، اللہ تعالی نے اس کو مال عطا کیا، بسا اوقات ایسے آدمی کو بھی یہاں کے لوگ چودھری صاحب کہہ کر پکارتے ہیں، چودھری کا لقب دوسرے علاقے (جیسے بنگلادیش) میں خاندانی طور پر ملتا ہے، لیکن ارکان میں ویسے خاندانی چودھری بہت کم نظر آیا، تقریبا یہاں کے سارے چودھری خاندانی ہونے کے بجائے خود ساختہ تھے اور اب بھی ہیں، واللہ اعلم۔

بہر حال میں اس فکر میں تھا کہ چودھری کا لفظ کہاں سے اور کس بنیاد پر ہوتا ہے؟ شاید ہمارے یہاں چودھری ان لوگوں کو بھی کہا جاتا ہوگا، جو اپنے گاؤں والوں، پڑوسیوں، مسلمانوں کی آباد کی ہوئی زمینوں اور ان کے خون پسینوں سے سینچی ہوئی کھیت کلیانوں کو ہڑپ ہڑپ کر اپنی عیاشی، بدمستی اور ظلم و جبر کی دنیا بسا لیتے ہوں؟ لیکن بڑی تلاش و جستجو کے بعد قومی زبان میں چلتا ہوا ایک محاورہ مل گیا ہے:

> ''ہمارے یہاں چودھری ان بیلوں بقروں اور سانڈوں کو بھی کہا جاتا ہے، جس سے ہل چلایا نہیں جا سکتا، اور جاتا بھی تو رینگتے رگڑتے چلایا جاتا ہے، جو بیل یا سانڈ نکما اور کاہل ہوتا ہے، اس پر مستزاد گھاس پانی زیادہ کھاتا ہے، موٹا تازہ تو ہوتا لیکن کسی کام کا نہیں ہوتا ہے، اور ہوتا بھی تو نہ ہونے کا برابر، ہمارے یہاں ایسے بیل بقروں اور سانڈوں کو قربانی دینے کی منت مانی جاتی ہے''۔

کہیں چودھری کا یہ لفظ ان لوگوں کے لئے اس عوامی محاورے سے مستعار تو نہیں لیا گیا تھا؟ جو کسی کام کے نہیں ہوتے ہوں، عیاش اور بدمست ہونے کے ساتھ کاہل اور غفلت شعار ہوتے ہوں، پر بیٹھے بیٹھے کھاتے پیتے زیادہ ہوں، اگر اس عوامی محاورہ سے مستعار لیا گیا ہے تو مستعار لینا بڑا خوب بھی

ہے،موز دن اور برمحل بھی۔

جہاں تک قربانی کا تعلق ہے،انسانوں کی قربانی تو خارج از امکان ہے، تاہم ایسے نکمے، غافل لیکن عیاش وبدمست چودھریوں کے خلاف عوامی انقلاب برپا تو ضرور کیا جاسکتا تھا اور کیا جاسکتا ہے۔ تا کہ اس انقلاب کے ذریعے ان کا بیڑا غرق کردیا جائے،مگر مصیبت یہی ہے کہ یہاں کے عوام بڑے بھولے بھالے اور معصوم ومظلوم ہوتے ہیں،تو ایسی حالت میں یہاں ان کے خلاف انقلاب کیسا؟

پھر جہاں تک لفظ دو بھاشی کا تعلق ہے،میری معلومات کی حد تک سرزمین ارکان میں چند دو بھاشی تھے۔دو بھاشی کیسے؟ دور برطانوی بھگوڑوں کا تھا،ظاہر ہے کہ برطانوی لوگ ہندوستان ہوتے ہوئے ارکان پر وارد ہوئے تھے،ان لوگوں کے لئے مترجم کی بڑی ضرورت تھی، جو مترجم ہندوستان سے آئے ہوئے تھے وہ بھی ظاہر ہے کہ روہنگیا زبان نہیں جانتے تھے، اب ہندوستانی مترجم کے واسطے سے انگریزوں کو یہاں والوں کی بات سمجھنی تھی، ایسے میں ہندی زبان سے شد بد رکھنے والے دو بھاشی کی ضرورت پیش آئی تھی۔ادھر دو بھاشی کے حوالے سے ایک لطیفہ یاد آگیا:

’’کہتے ہیں کہ کسی بستی کا ایک آدمی ہندوستان گیا تھا، گیا تھا علم وہنر سیکھنے کے لئے، لیکن وہ وہاں سے علم وہنر سیکھے بغیر ادھر ادھر گھوم پھر کر ارکان واپس آگیا، پھر یہاں والوں سے انگریزی نما بولیاں بولتے بولتے بذات خود انگریزی زبان کی مہارت پر فخر کرنے لگا، یہاں کے لوگ انگریزی کیا جانے، خود اپنی زبان تک سے ان کو بہت کم نسبت، خیر وہ آدمی انگریزی نما جو بولیاں بولتا تھا، لوگ سن لیتے اور داد دیا کرتے تھے۔ اب اس عیار پر ایک مصیبت آن پڑی کہ انگریز فوج کی ایک رجمنٹ کہیں سے بستی میں آنکلی اور کمانڈر نے بستی کے لوگوں سے کچھ پوچھ گچھ کی مگر لوگ کچھ بھی نہ سمجھ سکے، اب جلدی سے لوگ اس آدمی کی طرف دوڑے جو انگریزی نما باتیں بکتا اور لوگوں کو بے وقوف بناتا تھا، اس سے کہا گیا کہ اب بھائی تمہاری باری آئی ہے، یہاں انگریز آئے ہوئے ہیں، ہم تو ان کی باتیں نہیں سمجھ سکتے، چلئے آپ ترجمہ کر دیجئے!، اب وہ آدمی مصیبت میں پھنس گیا، نہ چاہتے

ہوئے بھی اسے انگریزوں کے سامنے آنا پڑا،اب انگریز کمانڈر نے اس سے پوچھا کہ تمہارے یہاں کے لوگوں کی کیا پریشانیاں ہیں،اور کیا کیا مطالبات ہیں؟اب اس نے لوگوں کو دکھانے کے لئے انگریزی نما باتیں بڑبڑانا شروع کردیا،انگریز کمانڈر بھی کافی ہشیار تھا،اس نے سمجھ لیا کہ یہ آدمی انگریزی زبان دانی کے نام پر لوگوں کو بیوقوف بناتا اور علم وہنر کے نام پر لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے،اب اسے اچھی طرح دھلائی پٹائی کر کے چھوڑ دیا گیا،اب انگریز چلے گئے تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ بھائی آپ کی اتنی دھلائی پٹائی کیوں ہوگئی؟ تو اس نے جواب دیا کہ تم نے کیا خاک سمجھا، انگریز کمانڈر کہہ رہا تھا کہ تم اتنے علم ودانش کے مالک ہوتے ہوئے یہاں اس جنگل میں کیا کرتے ہو،تمہارے لئے برطانیہ نہ ہو تو کم سے کم ہندوستان ہی مناسب تھا،تم نے اپنی صلاحیت اور استعداد کو ضائع کردیا، یہ کہتے ہوئے کر میری پٹائی کردی گئی ہے‘‘۔

دیکھو! چالاکوں،دغابازوں کی بھی ایک دنیا ہوا کرتی ہے،اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ پائے جاتے ہیں،لوگوں کو بےوقوف بنانے کا جال کتنا وسیع اور پھیلا ہوا ہے! یہ تھی ہمارے علاقے کے دو بھاشیوں کی حالت، تاہم برطانوی دور کے اواخر میں چند حضرات معنی کے دو بھاشی بھی تھے۔جیسے مسٹر وجہ اللہ صاحب کیلا دنگی،خود انگریزوں کی کتابوں میں ان کی ہشیاری، چالاکی،عیاری اور استعداد وصلاحیت کی داد دی گئی ہے،اس حوالے سے مسٹر انتھونی آرون کی تصنیف ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

الحاج جمال الدین احمد کے خاندان کا مختصر تعارف:

ظاہر ہے کہ حضرت مولانا الحاج حافظ جمال الدین احمد صاحب میرے والد گرامی ہیں،میری خاندانی روایات سے جہاں تک پتہ چلا کہ ۱۷۸۴ء اور سے قبل ہمارا خاندان مرد ہانگ (پتھری قلعہ) میں آباد تھا، بودھو پھیا کے حملے کی وجہ سے اس خاندان کے بہت سارے افراد شہید اور بہت ساروں نے ہجرت کر کے چاٹگام کے علاقہ چکریا میں پناہ لی تھی، یہاں آباد تو ہوئے لیکن وطن مقدس

کی یاد انہیں ہمیشہ ہمیشہ ستاتی رہی تھی، دراصل مرے خاندان کے لوگ وطن میں امن کے بحال ہونے کے منتظر تھے، اور ایک روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاندان کے بہت سارے نوجوانان جو چکریا میں تھے، کینگ بیرنگ کے ساتھ حریت کی لڑائی میں شامل ہوئے تھے۔

برطانوی دور کی ابتدا میں اس خاندان کے بہت سارے بزرگ اپنی اولاد سمیت ارکان واپس آئے، اب مروہانگ کے بجائے شمالی منگڈو کی ایک غیر آباد جگہ ہاٹ بانگہ جو نکھورہ کے مشرق میں واقع ہے میں آباد ہو گئے تھے۔ تاہم خاندان کے بہت سارے بزرگ چکریا اور اس کے بعد سنوا (بانس کھالی) میں رہ گئے، برطانوی دور تک بانسکھالی، چکریا اور ارکان میں دوبارہ آکر آباد ہونے والوں کے درمیان خاصے روابط اور خوشگوار تعلقات تھے، راہ ورسم اور آپس میں شادیاں بیاہیں ہوتی رہی تھیں، بعد میں زمانے کی رفتار کے ساتھ یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہوگیا۔

اٹھارھویں صدی کے اواخر میں ہاٹ بانگ سے ایک گھرانہ موضع نائن چنگ جو ایک غیر آباد مقام تھا میں آکر آباد ہوا، جن میں میرے والد کا پردادا بھی شامل تھا، یوں آج تک یہ خاندان اس علاقہ میں پوری آب وتاب سے آباد ہے، غرض زمانے کی گردش سے اس خاندان کے افراد چکریا، سنواہ، ہاٹ بانگ اور نائن چنگ کے علاوہ دیگر مقامات میں بھٹ کر رہ گئے ہیں۔ برطانوی دور تک اس خاندان کے افراد کے خاصے تعلقات تھے، تقسیم ہند کے بعد سیاسی بٹوارے کی وجہ سے اس خاندان کے درمیان دوبارہ وہ تعلقات بحال نہ ہوسکے، جو ایک طویل زمانے تک تھے۔

حافظ صاحب کا مختصر سلسلۂ نسب:

جمال الدین آحمد بن نجوم الدین بن اکبرعلی میرجی بن یوسف علی، یہ ہے آپ کا مختصر سلسلۂ نسب، جناب یوسف علی صاحب نے ہاٹ بانگ (نکھورہ) سے آکر نائن چنگ کو آباد کیا تھا، کہتے ہیں کہ جناب یوسف علی صاحب ایک درویش صفت انسان تھے، زمانے کی گردش کی وجہ سے انہوں نے اپنی اولاد کو زیادہ تو نہ پڑھا سکا، تاہم انہوں نے اپنے فرزند رشید اکبرعلی میرجی جو میرے والد کے دادا ہے کو کچھ پڑھانے کا اہتمام کیا تھا، انہوں نے اپنے لاڈلے بیٹے اکبرعلی کو خاندان کے دیگر بچوں کے ساتھ

گھر میں کچھ دینی تعلیم دلوائی، انہی بعد میں چاٹگام کے مشہور علاقہ چنوتی بھیجا گیا، جہاں انہوں نے اپنی تعلیم کو مزید آگے بڑھایا، اس کے بعد وطن واپس آکر تعلیم وتبلیغ اور رشد وہدایت کا سلسلہ شروع کیا تھا، اس علاقے میں انہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ (فرقانیہ) بھی قائم کیا تھا، جس میں دوسرے خاندان کے بچوں سمیت ان کے خاندان کے بچے پڑھا کرتے تھے، ان کی تعلیم میں بڑی برکت تھی، کہتے ہیں کہ جس نے بھی ان سے کچھ پڑھا ہو، وہ خدا رسیدہ بزرگ ہوگئے تھے۔

حضرت اکبرعلی مرجی:

میرجی پرانے زمانے میں ارکان میں ان حضرات کو کہا جاتا تھا جو دینی اور مذہبی تعلیم یافتہ ہوتے تھے، آج کل یہ محاورہ بدل گیا ہے، میرجی کی جگہ مولوی کا محاورہ ہوا کرتے ہیں، اکبرعلی صاحب کے حوالے سے جتنے معلومات فراہم ہوئے، ان کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ ایک دینی عالم ہونے کے علاوہ بڑے عامل اور درویش صفت بزرگ تھے، ہر وقت باوضو رہا کرتے تھے، دین کے بڑے پابند ،مشرب کے حوالے سے نقش بندی تھے، سماج میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بحالی کے لئے ہمہ تن کوشاں رہا کرتے تھے، خدمت خلق کے بڑے رسیا تھے، آپ زندگی بھر یاد الٰہی کو اپنا شیوہ بناتے ہوئے اس جہان فانی سے کوچ کر گئے۔

اکبرعلی فارسی زبان کے ماہر تھے، مثنوی مولوی روم اور دیوان حافظ شیرازی کے گویا حافظ تھے، ہر ہر باتیں وہاں سے تراش تراش کر بتایا کرتے تھے۔

اکبرعلی اپنی اولاد کو زیادہ تعلیم یافتہ تو نہیں بنا سکے، لیکن انہوں نے اپنی اولاد کو قرآن کریم اور دینیات کی مبادیات اور ضروری چیزوں کی تعلیم ضرور دی، آپ نے میرے دادا مرحوم نجوم الدین صاحب کو پڑھانے کی بڑی کوشش کی تھی، مگر گھر کی معاشی حالت بڑی خراب تھی، آخرکار دینیات کے مبادیات سے آگے بڑھ سکے، میرے دادا مرحوم نجوم الدین اپنے والد کی طرح بڑے دین دار اور علماء پسند بزرگ تھے، دینداری اور خلق خدا کی خدمت گزاری ان کی زندگی کا شیوہ بن چکی تھی، باتوں کے سچے، بڑے عامل اور وعدے کے پکے تھے۔

ایفائے وعدے کے حوالے سے اکبر علی صاحب کے متعلق بہت ساری باتیں سنی گئیں، حیات مستعار کے پچاس سال گزرتے نہ گزرتے آپ پر بیماری کا شدید حملہ ہوا، وقت وقت پر پیٹ اور پیروں میں درد رہا کرتا تھا، آخرکار یہ بیماری خطرناک بلکہ جان لیوا ثابت ہوئی، اور ساٹھ سال کے لگ بھگ ۱۹۶۸ء میں اس دنیا سے کوچ کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میری دادی مرحومہ دھنائی بی صاحبہ بڑی بھولی بھالی اور پاکیزہ صفت خاتون تھی، میں نے جب سے دیکھا ان کو یاد الہی کی رسیا دیکھا، باوضو رہنے کو بہت پسند کرتی تھی، بہو بیٹیوں کو وضو سے رہنے کے لئے ہمیشہ تلقین کیا کرتی تھی، ان کی باتیں بڑی سیدھی سادھی اور بھولی بھالی سی تھیں، علمائے کرام سے محبت، حفاظ اور طلباء سے شفقت اور بزرگان دین کا احترام کرتی تھی، کہیں اگر ایک ننا منا سا دینی طالب علم نظر آئے تو ان کو پیار سے بلاتی تھی، اسے پیار اور محبت بھری دعائیں دیتی تھی، ان کی بڑی آرزو تھی کہ ان کا جنازہ راقم سطور ہی پڑھائے، مگر قسمت سے ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہوسکی، کیوں کہ میں اس دوران مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ میں زیر تعلیم تھا، بہرحال نماز جنازہ میرے والد صاحب نے پڑھائی، میری دادی میرے والد سے بہت خوش تھی، دعائیں دیتی تھی کہ اللہ ان کی اولاد میں علماء اور حفاظ پیدا کرے، شاید ان کی یہ دعائیں قبول ہوئیں، اور ان کے نواسوں میں راقم السطور کے علاوہ بھی چند عالم اور حافظ پیدا ہوئے، اللہ تعالی مرحومہ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا کرے، امین یارب العالین۔

میرے والد الحاج حافظ مولانا جمال الدین احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی میں ہوئی، کچھ بڑے ہوئے تو دارالعلوم سعد اللہ سر میں داخلہ کروایا گیا، یہاں سے متوسطہ اور ثانویہ کی تعلیم پاکر جامعہ اسلامیہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ میں بھرتی ہوئے، یہاں آپ نے حضرت مولانا مفتی عزیز الحق صاحبؒ (بانی جامعہ) کی ایماء پر قرآن کریم کا مکمل حفظ کیا، اس کے بعد کتاب خانے میں داخل ہوکر بالآخر دورۂ حدیث تک کی تعلیم مکمل کی اور سند فراغت حاصل کرکے وطن واپس آگئے تھے۔

والد صاحب نے اپنی آبائی بستی میں چند دن گزار کر برمی دارالحکومت رنگون کی راہ لی، لیکن بدقسمتی کہئے یا زہی قسمتی سے اکیاب جاکر آپ کو شدید بیماری لاحق ہوگئی، جس کی وجہ سے واپس ہونا پڑا، شہر بوسیدنگ کے معروف محلے ''آنوک گوانگ'' میں میرے والد کی تین تایا زاد بہنیں رہائش پذیر

تھیں، یہاں آپ آٹھہرے، اور علاج ومعالجے کے بعد شفایاب ہوگئے، اس کے بعد آپ نے اس مذکورہ محلے کی جامع مسجد میں تقریبا ایک سال امامت وخطابت کا فریضہ انجام دیا، اس زمانے میں میرے نانیہال کا پورا گھرانہ جامع مسجد بوسیدنگ کے بغل میں رہائش پذیر تھا، میرے نانا جناب مفضل احمد صاحب کی نظر میرے والد صاحب پر پڑی تو انہوں نے میرے والد صاحب سے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہماری گاؤں باغکونہ والی مسجد کی امامت وخطابت آپ کے لئے حاضر ہے، یوں اگلے سال والد صاحب باغکونہ (بوسیدنگ) کی جامع مسجد میں منتقل ہوگئے، جہاں آپ امامت وخطابت کے ساتھ فرقانیہ میں بچوں کو تعلیم بھی دیا کرتے تھے، ویسے ایک دو سال گزر جانے کے بعد آپ کی شادی وخانہ آبادی ہوگئی۔

شادی کے چند سال بعد میرے والد صاحب نے اس علاقے کی چند مساجد ومدارس اور ایک سے زیادہ حفظ خانوں میں مسلم بچوں کو پڑھایا، اس درمیان ایک دو سال شمالی بوسیدنگ کی بستی ''تامی'' میں بھی بچوں کو درس دیا، غرض والد صاحب نے اپنی پوری زندگی تقریبا امامت وخطابت اور مسلم بچوں کی تعلیم میں گزار دی۔

میرے والد صاحب نہایت کم گو، خلیق وشریف بزرگ تھے، کسی دکان کے سامنے بیٹھنے اور بازار میں گھومنے ٹہلنے سے آپ گویا چھیڑ تھا، تہجد گزاری کے ساتھ نیم شبی اور نالۂ آہ سحر گاہی آپ کی زندگی کا گویا شیوہ تھی، ہر تہجد کے بعد دعا کرتے تھے کہ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے مشرف ہو جائیں، ویسے اللہ تعالی آپ کی دعا قبول کی، چنانچہ ۱۹۸۰ء میں آپ کو حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی توفیق ہوگئی۔

حجاز مقدس سے واپس آکر آپ نے دوبارہ مسجد کی امامت وخطابت کے ساتھ مدارس میں بچوں کو پڑھانے میں مشغول ہوگئے تھے، ایسی حالت میں آپ کو ۱۹۹۵ء کے دوران شدید بیماری لاحق ہوگئی، ارکان اور چاٹگام کے مختلف ہسپتالوں میں مقدور بھر تشخیص ومعالجہ کرا گیا، لیکن آخرکار مکمل شفایاب نہ ہوسکے، ایسی حالت آپ نے ۲۰۰۸ء میں داعی اجل کو لبیک کہا، انا للہ وانا الیہ راجعون، آپ کی نماز جنازہ باغکونہ کی مسجد کے آنگن میں پڑھی گئی اور اسی جامع مسجد کے بغل میں میرے نانیہال والی

قبرستان میں آپ کو سپرد خاک کر دیا گیا۔

میری والدہ ماجدہ فیروزہ خاتون بنت مفضل احمد بانگونوی نہایت پاکیزہ صفات والی عابدہ و پارسا خاتون ہیں، الحمدللہ تادم تحریر حیات سے ہیں، جن کے بطن سے ہم دو بھائی اور چار بہنیں ہیں، سب کے سب حیات سے ہیں، عمر کے لحاظ سے بالترتیب یہ ہیں:

۱۔محمد طاہر جمال ندوی: راقم سطور کا مختصر تعارف زیر نظر اسی کاوش میں ایک علیحدہ عنوان کے تحت موجود ہے۔

۲۔ پارسا خاتون بنت جمال: اس نے متوسطہ تک کی دینی وعصری تعلیم پائی، اس کی شادی ماسٹر محمد طاہر مورا فاروی بانگونوی سے ہوئی، دو بیٹے اور سات بیٹیوں کی ماں ہے، آج کل عیدگاہ کوکس بازار میں مقیم ہے۔

۳۔محسنہ بیگم بنت جمال: متوسطہ تک کی دینی وعصری تعلیم پا کر اس کی شادی لمبابیل، علی چنگ والے ایک لڑکے سے شادی ہوئی، ماشاءاللہ تین بیٹے اور دو بیٹیوں کی ماں ہے، آج کل عیدگاہ کوکس بازار میں مقیم ہے۔

۴۔ حسینہ بیگم بنت جمال: ثانویہ تک کی دینی وعصری تعلیم پا کر اس کی شادی نجومیاں بوسیدنگی سے ہوئی، چار بیٹے اور دو بیٹیوں کی ماں ہے، آج کل برمی سابق دارالحکومت شہر رنگون میں خوش حال رہائش پذیر ہے۔

۵۔محمد طیب جمال: ثانویہ تک کی دینی وعصری تعلیم پا کر ملائشیا پہنچا، اس کی شادی میری چچا زاد بہن زبیدہ خاتون سے ہوئی، الحمدللہ دو بیٹیوں کا باپ ہے، آج کل امریکہ میں کسی قدر خوش حال مقیم ہے۔

۶۔ جمالیدہ بنت جمال: ثانویہ تک کی دینی وعصری تعلیم پا کر مکہ مکرمہ پہنچی، اس کی شادی مولوی نور الامین نائسا فوری منگڈوی سے وہیں مکہ مکرمہ میں ہوئی، ماشاءاللہ تین بیٹیوں کی ماں ہے، تا حال مکہ مکرمہ میں مقیم ہے۔

مولوی فروخ احمد صاحب کجافوی علی چنگی، بوسیدنگیؒ:

مولوی فروخ احمد بن لطیفہ خاتون بنت حضرت مولانا عبدالباری بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کی پیدائش بیولہ فارہ (کجافہ) علی چنگ میں ہوئی، اس بات میں کسی قسم کی شک نہیں ہے کہ آپ کے والد صاحب بھی اس خاندان میں سے تھے، لیکن افسوس ہے کہ ان کے متعلق معلومات حاصل نہیں ہو سکیں۔

مولوی صاحب نے ابتدائی دینی تعلیم اپنے نانا بزرگوار حضرت مولانا شاہ عبدالباریؒ سے پائی، اور اس کے بعد علاقے کے مختلف مدارس میں پڑھتے رہے، آپ نے جن کئے مدارس میں تعلیم پائی تھی ان میں مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ بھی ہے۔

مولوی صاحب نے حضرت مولانا مفضل احمد صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ خم کرتے ہوئے دینیات کی متوسطہ تک کی تعلیم مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں حاصل پائی، اس کے بعد علاقے کے کسی مدرسہ سے سند فراغت کی۔

کہتے ہیں کہ آپ جید عالم دین اور عبادت گزار انسان تھے، بہت کم سخن اور مدبر بھی، ظاہر ہے کہ آپ بانئ تحریک آزادی حضرت محمد جعفر حسین قوال کے حقیقی ماموں ہیں، چنانچہ میں نے لوگوں سے بارہا سن رکھا تھا کہ آپ کا بانئ تحریک کے نشوونما اور تعلیم میں کافی حصہ رہا ہے، اور قومی کاز کے حوالے سے بھی آپ نے قوم وملت کی کافی خدمات کی تھیں حتی کہ بعض لوگوں کو یہاں تک کہتے ہوئے سنا کہ آپ کا اپنے پیارے بھانجے کو میدان عمل وتطبیق میں اتار میں بھی آپ کا حصہ رہا تھا۔

علاوہ ازیں مولوی صاحب حضرت محمد جعفر حبیب کے خاندن کے فرد ہونے کے علاوہ بھی قریبی راشتے داروں میں سے ہیں، ان دونوں کے آپس میں کافی محبت اور خاصا لگاؤ تھا، جس زمانے میں قائدِ حبیب قومی وملی کام کو آگے بڑھا رہے تھے، اسی دوران مولوی صاحب نے ان کا دامے درمے، قدمے اور سخنے غرض ہر اعتبار سے بھرپور تعاون کیا تھا، آپ نے اپنی بستی میں وفات پائی اور خاکِ علی چنگ میں مدفون ہیں۔

مولوی دبیر احمد صاحب کجافوی علی چنگی، بوسیدنگی:

مولوی فروخ احمد کا بھائی مولوی دبیر احمد بن لطیفہ خاتون بنت حضرت مولانا عبدالباری بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کی پیدائش بیولہ فارہ (کجافہ) علی چنگ بوسیدنگ میں ہوئی، ظاہر ہے کہ آپ بانی تحریک آزادی ارکان محمد جعفر حسین قوال کے حقیقی ماموں اور حضرت مولانا عبدالباری صاحبؒ کے حقیقی نواسے ہیں۔

مولوی صاحب نے ابتدائی تعلیم بستی کے مکتب کے علاوہ اپنے بزرگ نانا حضرت مولانا شاہ عبد الباریؒ سے پائی، اس کے بعد مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے دیگر اساتذہ کے علاوہ حضرت مولانا مفضل احمد صاحب سے کافی استفادہ کیا، اس کے بعد علاقے کے ایک دینی درس گاہ سے سند فراغت حاصل کی۔

ظاہر ہے کہ مولوی صاحب حضرت محمد جعفر حسین قوال کے حقیقی ماموں تھے، آپ نے بھی اپنے بڑے بھائی مولوی فروخ احمد کی طرح تحریک آزادی کے کاموں میں کافی حصہ لیا تھا، کہتے ہیں کہ جس زمانے میں محمد جعفر حسین قوال اندرون وطن میں قومی وملی فریضہ انجام دے رہے تھے، اسی زمانے میں مولوی صاحب کا کام دعوت الی الجہاد کے علاوہ تحریک کے مفاد میں پروپیگنڈہ کرنا تھا، اور آپ نے یہ خدمت بڑی ہشیاری اور راز داری سے نبھائی تھی۔

مولوی صاحب حضرت محمد جعفر حبیب کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، روہنگیا فدائین محاذ کے زمانے میں انہوں نے جو خدمات انجام دی تھیں، ان کو قوم کی تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھا جانا چاہئے، جن میں سے ایک خدمت یہ بھی تھی کہ آپ کا ذمہ اندرون وطن سے عام مسلم جوانوں اور نوجوانوں کے علاوہ اسکول ومدارس کے طلبہ کو محاذ میں عسکری تربیت کے لئے پہنچانا تھا، کہتے ہیں کہ اس میں آپ کافی کامیاب رہے، علاوہ اس کے آپ نے قائد تحریک محمد جعفر حبیب کا دامے درمے، قدمے سخنے ہر اعتبار سے تعاون کیا، بہر حال آپ نے اپنی زندگی میں ملت وقوم کی کافی خدمات انجام دے کر اپنی بستی میں انتقال کیا اور یہیں مدفون ہیں۔

مولوی محمد صاحب مرحوم کجافوی علی چنگی، بوسیدنگی:

مولوی فروخ احمد اور مولوی دبیر احمد کا چھوٹا بھائی مولوی محمد بن لطیفہ خاتون بنت حضرت مولانا عبد الباری بن علیم الدین بن غلام علی بن محسن علی بن شاہ عبداللطیف حجازی کی پیدائش بیولہ فارہ (کجافہ) علی چنگ بوسیدنگ میں ہوئی، آپ حضرت بانی تحریک آزادی حضرت محمد جعفر حسین قوال کے ماموں اور حضرت مولانا شاہ عبدالباری معرف بہ بڑے مولوی صاحبؒ کے حقیقی نواسے ہیں۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب کے ساتھ ساتھ اپنے لائق وفائق بزرگ نانا حضرت مولانا عبدالباریؒ سے پائی، اس کے بعد علاقے کے دیگر مدارس میں چند سال پڑھ کر مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں داخلہ لیا، اور اپنے بڑے بھائیوں کی طرح حضرت مولانا مفضل احمد صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ خم کرکے آ مشکوۃ المصابیح تک تعلیم پائی، اس کے بعد علاقے کے ایک دینی درس گاہ سے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ نے اپنی آبائی بستی کے مکتب میں پڑھانا شروع کیا، اور عرصۂ دراز تک بلکہ ایک روایت کے مطابق زندگی کے آخری ایام تک مسلمانوں کے بچوں کو دینی تعلیم دیا۔

کہتے ہیں کہ آپ نے اپنی والدہ کی بڑی اور قابل رشک خدمت کی، والدہ ہر وقت ان کو دعائیں دیتی رہیں، ویسے اللہ تعالی نے آپ کی زندگی کو ہمیشہ خوش حال رکھا۔

ساتھ ہی ساتھ آپ ملک وملت کی خدمات میں بھی پیچھے نہیں رہے، کہتے ہیں کہ آپ نے روہنگیا فدائین محاذ کے زمانے میں تحریک آزادی کی خدمات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، اندرون وطن میں رہ کر تحریک کے لئے بڑی راز داری کے ساتھ چندہ وصول کرتے اور بڑی امانت داری سے کام لیتے ہوئے محاذ کو پہنچایا کرتے تھے۔

غرض اس حوالے سے آپ نے اپنے دونوں بڑے بھائیوں مولوی فروخ احمد اور مولوی دبیر احمد کی طرح ملک ووطن اور قوم وملت کی بڑی قابل قدر خدمات انجام دی تھیں، اللہ تعالی آپ کی تمام خدمات کو قبول فرمائے۔ آپ نے بھرپور زندگی گزار کر اپنی بستی میں وفات پائی اور وہیں کی خاک میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب گرجنڈیاوی، منگڈویؒ:

حضرت مولانا محمد اسماعیل بن عبدالحق بن عبدالغفور بن فرّان علی کی ولادت جنوبی منگڈو کی معروف و مردم خیز بستی گرجنڈیا میں ۱۹۳۴ء میں ہوئی۔ آپ ایک زمین دار اور حکمران خاندان کے چشم و چراغ تھے۔

مولانا کے والد جناب مرحوم عبدالحق رواسوگری ایک عالم دوست انسان ہونے کے علاوہ بڑے سخی اور انسانیت نواز بزرگ تھے، علاقے کے بہت سے معمر حضرات سے یہ بات سنی گئی ہے کہ انہوں نے ۱۹۴۲ء کے ہنگاہائے رستخیز کے دوران بہت سے مسلمانوں کی جان بچائی تھی۔ اس حوالے سے اس علاقے کے ایک معمّر آدمی کا کہنا ہے کہ:

> ”تاریخ ارکان کے حالات سے وقفیت رکھنے والے حضرات جانتے ہیں اور میں نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھا بھی ہے کہ برما اور ارکان سے بہت سارے ہندوستانی لوگ اپنی زندگی کے تمام سروسامان چھوڑ چھاڑ کر بنگال اور ہندوستان کی طرف جانے لگے تھے، وہ اس لئے کہ برمی اور مگھوں نے مسلمانوں کو یہ کہہ کر ستانا شروع کیا کہ برما اور ارکان تمہارا وطن نہیں ہے، تم جدھر سے آئے ہو ادھر چلے جاؤ، برمی اور مگھوں نے ان ہندوستانی مسلمانوں میں سے ہزاروں کی جان لی، ایسے افراتفری کے عالم میں ہزاروں بنگالیوں اور ہندوستانیوں کا ہماری بستی کی طرح گرجنڈیا وغیرہ کی دیگر بساتیں میں ٹھہرنا ہوا تھا، تو اس پریشانی کے عالم میں عبدالحق رواسوگری نے ان پریشان حال لوگوں کی بہت ہی خدمت کی۔ ان کو اپنے علاقے میں ٹھہرایا، کھانا کھلایا کپڑے دیے، اور کشتی وغیرہ کے ذریعے بنگال اور ہندوستان کی طرف بھیجا تھا“۔

ان خدمات کے حوالے سے خود حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کا بیان ہے کہ:

> ”میرے والد محترم و مرحوم جناب عبدالحق رواسوگری نے جو ۱۹۴۲ء میں مصیبت کے مارے مسلمانوں کی خدمت کی تھی وہ تو علاقے بھر کے لوگ جانتے ہیں، وہ بڑے عالم پسند اور بڑے مہمان نواز انسان تھے، جو بھی ان کے ساتھ کہیں جاتا تھا، راہ صرفہ اور توشۂ سفر سب ان کا ذمہ ہوا کرتا تھا، کسی کا دل نہیں دکھاتا تھا، بڑے

> نیک اور پاکیزہ صفات والے بزرگ تھے، حتی کہ ۱۹۴۲ء کے ہنگامے کے بعد برطانوی حکومت نے ان کو اس انسان دوستی اور انسانیت نوازی کے صلے میں ایک سرکاری تلوار اور ایک تلائی کپ بھی عطا کیا تھا، تلائی کپ اور وہی سرکاری تلوار میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اللہ تعالیٰ میرے والد مرحوم کو رحم کرے اور جنت الخلد میں جگہ عطا کرے، آپ نے بھرپور زندگی گزاری، اور مرتے دم تک علمائے دین، مدارس اسلامیہ اور مساجد کی خدمات کیں، اور سرزمین ارکان کے اس خادم دین نے ۱۹۴۱ء میں اس جہان فانی سے رخصت لی۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کی والدہ مرحومہ زلیخا بنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب نلبیلوی معروف بہ بوڑھا مولوی صاحب بھی بڑی نیک، عالم دوست اور پاکیزہ صفات خاتون تھی، مولانا محمد اسماعیل کے نانا حضرت مولانا عبدالشکور صاحب بڑے جید عالم دین، خدارسیدہ بزرگ اور علاقے بھر میں ایک حیثیت سے مرجعیت کے مقام رکھنے والے بزرگ تھے۔ مولانا عندالشکور صاحب نے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم علاقے میں حاصل کر کے ہندستان کا سفر کیا، اتنا تو معلوم نہ ہوسکا کہ آیا حضرت نے از ہر ہند دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارنپور سے اپنی تعلیم کی تکمیل کی تھی یا دیوبندی لائن کے کسی اور مدرسے سے، تاہم اتنا حال یقینی حد تک معلوم ہوا کہ آپ نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت کی اور مدّت دراز تک شیخ کی خدمت میں رہ کر منازل سلوک طے کئے تھے۔ انہوں نے وطن واپسی کے بعد رشد و ہدایت، وعظ و تلقین اور درس و تدریس کی خدمات انجام دی تھیں، چنانچہ بستی نلبیلا کے معروف عالم دین حضرت مولانا مرتضی حسن صاحب وغیرہ آپ کے تلامذہ ہیں۔ حضرت نے بڑھاپے کے عالم میں سفر حج کیا، اور ۱۹۴۷ء کے حج کے دوران ان کا انتقال مکہ مکرمہ میں ہوا، کہا جاتا ہے کہ انہوں نے نوے سال سے زیادہ عمر پائی تھی۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے حقیقی ماموں مولانا محمد نسیم بن حضرت مولانا عبدالشکور صاحب ایک جید عالم دین، فصیح اللسان اور بطور خاص اردو کے ادیب تھے۔ اعلی دینی تعلیم ہندوستان کے کسی دینی مدرسہ سے حاصل کر کے وطن واپس آئے، وطن آ کر انہوں نے درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا تھا، مگر افسوس ہے کہ ۱۹۴۵ء کے دوران جاپان برٹش والی جنگ میں آپ نے شہادت کا

جام نوش فرمایا، ان کی شہادت حسرت آیات کے حوالے سے مولانا محمد اسماعیل صاحب کا بیان ہے کہ:

> ''میرے ماموں حضرت مولانا محمد نسیم صاحب بڑے جید عالم دین تھے، اعلی دینی تعلیم ہندوستان سے حاصل کر کے وطن آئے ، اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا تھا، حضرت کا سسرال بوسیدنگ کی معروف بستی چاؤفرانگ کے رہائشی تھا، آپ اپنے سسرال کے یہاں گئے ہوئے تھے، ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے کہ آپ مسجد میں نماز ادا کر رہے تھے کہ اچانک مسجد پر ایک بم گرا، جس میں آپ شہید ہو گئے، آپ ایک فصیح اللسان عالم ہونے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کے ماہر تھے، بڑے بردبار اور مدبر اور دوراندیش انسان تھے''۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے ایک زمین دار گھرانے کے چشم وچراغ تھے۔ یوں بچپن اور لڑکپن بڑی ناز پروردگی سے گزرا، کچھ بڑے ہوئے تو مکتب نشینی کرائی گئی، پھر ابتدائی تعلیم مدرسہ امدادالعلوم علی تانجو سے شروع کی، اس مدرسہ میں آپ کے اساتذۂ کرام میں حضرت مولانا بشیر اللہ بن حضرت مولانا عبدالجبار صاحب شہید انڈانگی اور حضرت العلامۃ مولانا نور احمد صاحب گدوسراوی ناقابل فراموش شخصیات ہیں ۔

حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے متوسطہ کی تعلیم جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں پائی۔ متداول نصاب تعلیم کی معروف کتابیں: کافیہ، سلم العلوم، ہدایۃ کامل حضرت العلامۃ مولانا محمد ابراہیم صاحب قطنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں، اس کے بعد آپ نے چاٹگام کی معروف دینی درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے تفسیر جلالین اور مشکوۃ شریف وغیرہ کتابیں پڑھیں۔

۱۹۵۳ء میں مولانا اسماعیل نے حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کی نیت سے ایک درخواست دی تو لاٹری میں آپ کا نام آیا، یوں آپ حجاز مقدس پہنچے، حج اور زیارت مدینہ سے سرفراز ہوئے۔ حج وزیارت کے بعد پھر تکمیل تعلیم کی نیت سے دارالعلوم کراچی میں داخلہ لیا، اور ۱۹۵۷ء میں سند فراغت حاصل کی۔

ذیل میں آپ کے دورۂ حدیث کے اساتذہ اور کن کن اساتذہ سے کون کونسی کتابیں پڑھیں اس کا اجمال بتا رہا ہوں:

(۱) مفتی رشید احمد لدھیانوی سے بخاری اوّل ودوم۔

(۲) مولانا اکبر علی سہارنپوری سے مسلم اوّل ودوم۔

(۳) مولانا سلیم اللہ صاحب سے ترمذی شریف کامل۔

(۴) مولانا رعایت اللہ صاحب سرحدی سے ابوداؤد شریف۔

(۵) مولانا سلیم اللہ خان صاحب سے نسائی شریف۔

(۶) مولانا سبحان محمود صاحب سے موطا امام محمد۔

(۷) مولانا سلیم اللہ صاحب سے طحاوی شریف۔

(۸) مولانا سلیم اللہ خان صاحب سے موطا امام مالک۔

۱۹۵۹ء کے اواخر میں مولانا اسماعیل صاحب وطن واپس آئے۔ ۱۹۶۰ء کی ابتدا میں آپ ارکان کے دارالحکومت اکیاب پہنچے، جہاں آپ نے تجارت اور دیگر کاروبار کا آغاز کیا۔ ۱۹۶۲ء میں بدنام زمانہ جنرل نیون کی حکومت نے ملک کی ساری تجارت پر ڈھاکہ ڈالا اور ساری کی ساری تجارت قومیائی گئی تو آپ کی تجارت بھی بھاڑ میں گئی۔

۱۹۶۴ء تک پھر بھی آپ اکیاب ہی میں رہے، بعد میں آپ وطن واپس آئے۔ ۱۹۶۶ء میں آپ کو بستی کا سرپنچ بنایا گیا، جو آپ کے آباد اجداد کی گویا میراث تھا۔

۱۹۷۰ء میں حضرت مولانا ابراہیم صاحب قطنی جو آپ کے استاد تھے کی طرف سے ایک رسالہ آیا، جس میں لکھا گیا کہ آپ جید عالم دین ہیں، ٹیکناف کے مدرسہ میں ایک جگہ خالی ہے، اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ جگہ آپ کے لئے حاضر ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنے لائق وقدر دان استاد کے رسالہ پا کر ٹیکناف میں اپنے استاد کے یہاں حاضری دی، یوں آپ نے جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کی مدرسی قبول کر لی تھی۔ جہاں آپ نے ایک سال پڑھایا، یہاں ہدایہ اوّلین، نفحۃ العرب، جلالین شریف، کنز الدقائق اور کافیہ جیسی کتابیں آپ کے حصے میں تھیں۔

۱۹۷۱ء کی خانہ جنگی میں آپ پھر سے وطن واپس لوٹے اور مدرسہ اسلامیہ چارکمبو میں ایک سال تک تدریسی خدمت انجام دی، یہاں آپ نے مقامات حریری، نفحۃ العرب وغیرہ کتابیں پڑھائیں، مولانا محمود الحسن گڑھا خالوی اور مولانا ابوالقاسم چارکمبوی مقیم حال کیلوار بعۃ عشر جدہ جیسے جید علماء آپ کے تلامذہ میں سے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں آپ نے دوبارہ تجارت اور کاروبار شروع کی، جس میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت دی تھی۔ ۱۹۷۷ء کے بعد ہر سال حجاز مقدس جانا شروع کیا، اور ۱۹۸۰ء میں آپ نے سرزمین مقدسہ مکۃ المکرمۃ میں سکونت اختیار کرلی، البتہ اس کے بعد بھی دو تین مرتبہ وطن واپس آئے تھے، مگر آپ نے ۱۹۸۳ء میں اپنے اہل خانہ کو مکۃ مکرمہ میں بلالیا اور مستقل طور پر وہیں سکونت اختیار کرلی۔

آپ نے اپنی زندگی میں اکیس مرتبہ حج کئے، حضرت مولانا سیدالامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی معیت میں چند حج کرنے کی سعادت حاصل کی۔ راقم سطور نے حضرت مولانا اسماعیل صاحب سے نومبر ۲۰۱۵ء میں ڈاکٹر مولوی دین محمد صاحب منگنماوی کی معیت میں ملاقاتیں کیں، مولانا سے حضرت مولانا سیدالامین صاحب کے متعلق بہت ساری قیمتی معلومات ملیں، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ:

''میرے دوست مولانا سیدالامین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے جلیل القدر عالم دین تھے، جتنے بڑے عالم ٹھیک اس سے بڑھ کر عامل اور عابد بھی تھے۔ فن تفسیر، حدیث، فقہ، فتاوی، غرض معقولات ومنقولات میں آپ کے پایہ کا عالم میں نے کم سے کم سرزمین ارکان اور بنگال میں کہیں نہیں دیکھا۔ مولانا شمس الضحی جیراج پوری بھی جامعہ اشرفیہ میں آپ کے ہم کلاس رہ چکے تھے، وہ بھی جید عالم دین اور حضرت مولانا سیدالامین صاحب کے قائل رہ چکے تھے۔ مولانا سیدالامین صاحب کے اندر تکلف نام کی کوئی چیز نہیں تھی، جس سے بھی ملتے بڑے تواضع کے ساتھ بے تکلفی سے ملتے تھے، ان کے اندر بڑے اخلاص وللّٰہیت تھی، جو کام بھی کرتے تھے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی اور خوشنودی کے لئے کرتے تھے۔ میرے ساتھ حضرت کے گہرے تعلقات تھے۔ جس وقت میں جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں پڑھارہا تھا، اسی زمانے میں آپ بطور خاص میری ملاقات کے لئے ٹیکناف آیا کرتے تھے، ہم دونوں یہاں ہونے والی کشتی بازی دیکھنے کے لئے جایا کرتے تھے، ہم دونوں کے مابین ہدایا وتحائف کا تبادلہ اکثر ہوا کرتا تھا۔ وطن میں بھی آپ جبھی ہمارے یہاں آتے تھے، تو ہم ان کی تشریف آوری کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور جبھی ہم ان کے یہاں مہمان ہوا کرتے تھے، آپ دل کھول

کر مہمان نوازی کرتے تھے۔ بڑے سخی اور مخلص انسان تھے۔ اخلاق وللّٰہیت، خلوص ومحبت کے حوالے سے آپ یکتائے روزگار تھے۔ آج آپ ہمارے مابین نہیں ہیں، نہ جانے میرا بھی بلاوا کب آنے والا ہے، اللہ تعالی حضرت پر راضی ہوجائے، اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے''۔

راقم سطور خود حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب کے بیانات اور ان کے ساتھ حضرت مولانا سیدالامین صاحب کے گہرے تعلقات اور دوستی کے حوالے سے دیگر جاننے والوں کے بیانات سے اس نتیجہ پر پہنچا کہ مولانا محمد اسماعیل حضرت مولانا سیدالامین کے درمیان غیرمعمولی تعلقات تھے، ان دونوں کی دوستی طالب علمی کے زمانے سے شروع ہوئی۔ چنانچہ خود مولانا محمد اسماعیل صاحب کا بیان ہے کہ:

''غالباً ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے کہ میں جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں پڑھ رہا تھا، مولانا سید الامین ٹیکناف آئے تو ان سے ملاقات ہوئی، بعد میں ہم دونوں ایک دوسرے کے گہرے دوست ہوگئے، اللہ تعالی کا کرم ہے یہ دوستی ان کی زندگی کے آخری لمحات تک باقی رہی، میری ان کی دوستی کی نوعیت مولانا کی اس بات سے سمجھی جاسکتی ہے کہ چند سال پہلے حضرت مکۃ المکرمۃ تشریف لائے تھے، میرے گھر مہمان بنے، ایک وقت کسی گفتگو کے دوران آپ نے فرمایا، بھائی مولانا محمد اسماعیل آپ بھی سن رکھیں اور مجلس والے بھی گواہ رہیں کہ میں تمہارے (مولانا محمد اسماعیل کے بغیر) جنت نہیں جاؤں گا، تو میں نے مولانا سے کہا کہ میں تو ایک گناہ گار آدمی ہوں، تو مولانا فرمانے لگے کہ جب میں جنت جاؤں گا تو اس وقت اس حدیث سے استدلال کروں گا کہ ''المرء مع من احب'' یعنی جس سے میں محبت کرتا ہوں اس کے بغیر جنت میں نہیں جاؤں گا''۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب اپنے اساتذہ سے بہت تعلّق رکھتے تھے، چنانچہ آپ کے استاد اور سرزمین پاکستان کے بڑے اہل کمال اور نامور عالم دین ومجاہد ملّت حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانویؒ ۱۹۸۴ء میں حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے لئے حجاز مقدس تشریف لائے تو آپ مولانا اسماعیل صاحب کے گھر مہمان بنے، یہ نہ صرف مولانا محمد اسماعیل بلکہ ارکانی مسلمانوں کے لئے ایک فخر کی بات ہے کہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی جیسے عظیم المرتبت انسان ایک

ارکانی اگر چہ وہ ان کے شاگرد کیوں نہ ہوں کے گھر تشریف لائے تھے۔

مولانا محمد اسماعیل صاحب سے راقم سطور نے پوچھا کہ سرزمین ارکان میں تبلیغی جماعت کے متعلّق آپ کی کیا رائے ہے؟ تو مولانا نے فرمایا کہ:

"تبلیغی جماعت نہ صرف سرزمین ارکان وبرما، بلکہ پوری دنیا میں دین اسلام کی بڑی خدمات انجام دے رہی ہے، یہ سورج کی طرح عیاں حقیقت ہے کہ سرزمین ارکان میں تبلیغی جماعت کی دعوت کس بزرگ کے واسطے سے پہنچی وہ تو محققین ہی بتا سکیں گے، تاہم حضرت مولانا ثناء اللہ بیرسٹر صاحب مرحوم تبلیغی جماعت کے زیر سائے اوّلین داعی تھے، بڑے خوب صورت فربہ جسم کے مالک تھے، اور ایک بات آپ لکھ سکتے ہیں کہ از ہر ہند دارالعلوم میں اختلافات کے دوران مولانا ثناء اللہ صاحب مجلس شوری کے ممبر تھے، کسی اختلاف کے دوران آپ کو دارالعلوم دیوبند کے ارباب بست وکشاد نے دارالعلوم دیوبند بلایا تھا، اور آپ وہیں تشریف بھی لے گئے تھے۔ علاوہ ازیں مولانا ثناء اللہ بیرسٹر صاحب دارالعلوم معین الاسلام ہاٹہزاری اکثر جایا کرتے تھے۔ بڑے متوازن اور معتدل فکر کے انسان تھے، میں نے ان کی زبان سے یہ شعر کئی مرتبہ سنا کہ۔

رضینا قسمة الجبار فینا ÷ لنا علم وللجهال مال"۔

مولانا سید الامین صاحب کا یہ گہرا دوست اور راز دار ساتھی حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب نے ۲۰۱۷ء میں مکۃ المکرمہ میں انتقال کیا، جنت البقیع میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد طیب صاحب فالی فرانگی، راسیدنگیؒ:

دور آخر میں سرزمین ارکان کے جلیل القدر عالم دین حضرت مولانا محمد طیب بن سلیمان بن عبد الرحمن صاحب ۱۹۴۵ء میں علاقۂ راسیدنگ کی بستی فالی فارہ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد صاحب نہایت دین دار، خدا ترس اور عالم دوست بزرگ تھے، اور والدہ بھی نہایت پاکیزہ صفات خاتون اسلام تھی۔

مولانا کا بچپن اور لڑکپن مکتب کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ اپنے والدین کے آغوشِ تربیت میں گزرا، کافی بڑے ہوئے تو ۱۹۶۷ء میں مدرسہ قاسم العلوم فرینڈنگ میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے جماعتِ دہم اور نہم کی تعلیم پا کر ۱۹۶۹ء میں مدرسہ محی العلوم یونگ چنگ میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے جماعت ہشتم سے لے کر جماعتِ سیوم تک مسلسل چھ سال دینی تعلیم حاصل کی، اس درس گاہ میں آپ نے اس زمانے کے نامور عالم دین حضرت مولانا محمد صالح فرندگی ثم یونگ چنگیؒ کے علاوہ حضرت مولانا عبد اللہ صاحب فاضل دار العلوم کراچی سے خوب خوب استفادہ کیا، کہتے ہیں کہ یہاں آپ کے ہم سبقوں میں حضرت مولانا محمد حنیف راغبؔ فرندگی ارکانی بھی تھے۔

اس کے بعد آپ اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ۱۹۷۶ء میں برما کے دارالحکومت رنگون پہنچے، اور جامعہ اسلامیہ صوفیہ میں داخلہ لیا، یہاں بطور خاص مولانا مفتی داؤد یوسف صاحب استفادہ کیا، جہاں سے آپ نے جماعت اولی اور دورۂ حدیث کی تعلیم پا کر ۱۹۷۷ء میں سند فراغت حاصل کی۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ نے رنگون کے کسی دینی مدرسہ میں تدریسی خدمات شروع کیں، اس دوران وطن سے خبر آئی کہ مولانا کے بڑے بھائی جناب فیض احمد صاحب پر ان کی بستی والوں نے شدید مظالم ڈھائے، جس کے سبب سے ان کا انتقال ہو گیا، یہ خبر مولانا پر بجلی بن کر گری اور وطن واپسی کا سبب بنی، ویسے آپ وطن آ گئے تھے۔

وطن واپسی کے معا بعد آپ نے مدرسہ عزیزیہ روح العلوم زوفرانگ میں دوبارہ تدریسی خدمات کا آغاز کیا، ساتھ ہی ساتھ انتظامی امور کے حوالے سے آپ نائب مہتمم کے علاوہ صدر المدرسین جیسے مناصب پر بھی فائز رہے، جب کہ اسی زمانے میں اس درس گاہ کے مہتمم صالح احمد چوہدری زوفرانگی تھے۔ بہر حال یہاں آپ مسلسل پانچ سال تدریسی وانتظامی خدمات انجام دے کر مدرسہ احسن

المدارس چانگانہ منتقل ہوگئے، اس زمانے میں اس موخر الذکر مدرسہ کے مہتمم حضرت مولانا حافظ اشرف علی صاحب (خلیفہ ومجازِ بیعت حضرت مولانا شیخ مظفر احمد صاحب منگیرویؒ) تھے۔

مولانا مدرسہ احسن المدارس میں مدرس ہونے کے علاوہ صدر المدرسین کے منصب پر فائز رہے، جہاں آپ نے اٹھارہ سال تک مسلسل تعلیمی، تدریسی اور انتظامی خدمات انجام دیں، کہتے ہیں کہ اللہ تعالی کا خاص کرم تھا مولانا کی کوشش اور جانفشانی سے تعلیمی اور انتظامی امور کے حوالے سے اس مدرسہ کی کافی ترقی ہوئی، اس مدرسہ میں آپ کے ساتھ درج ذیل حضرات علمائے کرام بھی مدرس تھے:

☆ مولانا مفتی حبیب الزمان صاحب سیندنگی۔
☆ مولانا محمود الحق صاحب فتح علی فاروی، بوسیدنگ۔
☆ مولانا قاری محمد طاہر صاحب فوئمالوی۔
☆ مولانا ابوالہاشم صاحب۔
☆ مولانا مفتی حسین احمد صاحب زوفرانگی، صاحبِ کنوز المسائل۔
☆ مولانا نور محمد بن ضمیر الدین خلیقؔ صاحب چانگانوی۔
☆ مولانا احمد صاحب فریندنگی۔
☆ مولانا محمد طاہر بن عبدالسلام صاحب چانگانوی۔
☆ مولانا حافظ کلیم اللہ صاحب یونگ چنگی۔
☆ مولانا حافظ محمد امین صاحب سیندنگی۔
☆ مولانا حافظ عبدالرحیم صاحب سیندی فرانگی۔

بعد ازاں بعض وجوہات کی بنیاد پر آپ دوبارہ مدرسہ قاسم العلوم فریندنگ چلے آئے، یہاں چند سال تعلیمی خدمات انجام دینے کے بعد معہد الاطفال چانگانہ اور مدرسہ انصار العلوم موئیڈنگ میں پڑھاتے رہے، یادر ہے کہ موخر الذکر تینوں مدرسوں میں آپ نے آٹھ سالوں تک تدریسی وانتظامی خدمات سرانجام دیں، آخر کار آپ شدید علالت میں مبتلا ہوگئے، بساط بھر علاج وتشخیص تو کی گئی، مگر بے سود، ویسے بالآخر آپ نے یکم/ مارچ/ ۲۰۱۵ء بروز اتوار بعد المغرب سات بجے جان جانِ

آفرین کا حوالہ کردیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ مولانا کے ارشد تلامذہ یہ ہیں:

مولانا عارف اللہ بن محمد حسین زوفرانگی۔
مولانا عبداللہ بن رشید احمد اکیابی۔
مولانا محب اللہ بن نبیہ حسین فالی فرانگی۔
مولانا عبدالوہاب بن عبداللطیف زوفرانگی۔
مولانا روح الامین صاحب زوفرانگی۔
مولانا ساجد اللہ بن جعفر احمد چانگانوی۔
مولانا محمد شریف بن محمد الیاس بوسیدنگ۔
مولانا عبدالمعبود بن رشید احمد زوفرانگی۔
مولانا کلیم اللہ بن سعید احمد بربیلی۔
مولانا عطاء اللہ بن رشید احمد چانگانوی۔
مولانا محمد علی بن فجر علی چانگانوی۔
مولانا سلیم اللہ چانگانوی۔
مولانا فیاض اللہ فریندنگی۔
مولانا منیر احمد فریندنگی۔
مولانا عبدالشکور راجاربیلی۔
مولانا نور حسین راجاربیلی۔
مولانا محمد ایوب مقیم حال پاکستان۔
مولانا رحیم اللہ مقیم حال پاکستان۔
مولانا حافظ نور محمد بن ابراہیم کیتاربیلی۔
مولانا حافظ مختار احمد بن مولانا حسین احمد کیتاربیلی۔

آپ کے دو بہنوں کے علاوہ تین بھائی تھے، بھائی بالترتیب درج ذیل ہیں:

۱۔ فیض احمد: آپ نے چوتھی جماعت تک اردو کی تعلیم حاصل کی، بڑے زمیندار مگر سخی منش تھے، اپنے گاؤں کے سرکردہ لوگوں میں آپ کا شمار تھا۔

۲۔ فضل احمد: بڑے شریف النفس ہونے کے علاوہ دین دار پرہیزگار ہونے کے ساتھ بستی کی جامع مسجد کے مؤذن تھے۔

۳۔ حضرت مولانا قاری محمد احمد صاحب: مدرسہ ضمیریہ قاسم العلوم کے کے فاضل تھے، سن فراغت ۱۹۵۶ء ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی اولاد بالترتیب یہ ہیں:

۱۔ مسماۃ: نورالانوار۔ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۲۔ مولوی برہان الدین: ماشاء اللہ عالم دین ہونے کے علاوہ بڑے کریم اور شریف النفس انسان ہیں، ۲۰۰۸ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد ۲۰۱۶ء تک مدرسہ احسن المدارس چانگانہ میں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے، ۲۰۱۷ء میں ہجرت کی، حالیا بنگلا دیش میں مہاجرت کی زندگی گزار رہے ہیں، جہاں آپ ایک دینی مدرسہ ''دارالقرآن بالوخالی ٹیکناف'' کے مدیر ہیں، اللہ تعالی ان کے مدرسہ کی ترقی کے ساتھ ان کی حیات دراز فرمائے۔

۳۔ مسماۃ: راشدہ بیگم۔ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

۴۔ ماسٹر عبداللہ۔ حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

بہر حال حضرت مولانا محمد طیب صاحب وقت کے ایک جلیل القدر مخلص عالم دین تھے، فن نحو و صرف اور منطق کے علاوہ تفسیر حدیث اور فقہ وکلام میں ید طولی رکھتے تھے، جہاں تک معلوم ہوا کہ درس وتدریس کے حوالے سے فقہ وفرائض کے ساتھ آپ کی خاصی دل چسپی رہی تھی، دعا ہے کہ اللہ تعالی حضرت کو غریق رحمت کرے، آمین یارب العالمین۔

مولانا محمد شفیع صاحب کوائندنگی، بوسیدنگی:

سرزمین ارکان کے جید اور باصلاحیت لیکن گمنام عالم دین، عابد وزاہد حضرت مولانا محمد شفیع صاحب کی پیدائش بستی کوائندنگ، علاقۂ بوسیدنگ میں ہوئی، نشوونما اپنی آبائی بستی میں ہوا، اور ابتدائی ومتوسطہ کی تعلیم علاقے کے دینی مدارس میں پائی، اس کے بعد بنگلا دیش کی معروف دینی، علمی اور روحانی درس گاہ دارالعلوم معین الاسلام ہاٹھزاری میں پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مولانا محمد شفیع صاحب وطن واپس آئے، اور علاقے کے چند دینی مدرسوں میں پڑھاتے رہے، جن میں جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے علاوہ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ، بوسیدنگ قابل ذکر ہیں۔

سن رکھا تھا کہ مولانا محمد شفیع صاحب حضرت مولانا محمد ادریس صاحب سعد اللہ سری کے مرید اور مجازِ بیعت تھے۔ بعد میں آپ ترک وطن کر کے پاکستان پہنچے، اور عرصۂ دراز تک وہاں کراچی کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، آپ کے شاگرد رشید مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب لمبابیلی بوسیدنگی کے بیان کے مطابق مولانا محمد شفیع صاحب حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کی نیت سے حجازِ مقدس کا سفر کیا، سالوں وہیں رہ کر بعد میں پاکستان چلے گئے، شنید ہے کہ تادم تحریر آپ حیات سے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے، اور جہاں بھی ہوں سلامت سے رکھے۔ آمین۔

مولانا محمد شفیع صاحب کے متعلق آپ کے مایۂ ناز شاگرد مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب لمبابیلی صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ''جامعہ اسلامیہ عالیہ میں میرا جماعت نہم کا سال تھا، مولانا محمد ادریس صاحب تشریف لائے، والد محترم حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب نے مجھے آپ کا حوالہ کیا، لیکن آپ نے میری عمر اور حالت پر ترس کھاتے ہوئے فرمایا کہ: حسین احمد ابھی بہت چھوٹا ہے، میں اسے مولانا محمد شفیع صاحب کا حوالہ کرتا ہوں، جن پر مجھے اعتماد ہے، انشاء اللہ وہ اچھی تعلیم دیں گے، اور اس کی تربیت میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوڑیں گے، بعد میں انشاء اللہ دیکھا جائے گا''۔

مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری تمنگ چنگی، بوسیدنگیؒ:

سرزمین ارکان کے مفکر عالم دین ومبصر، سیاسی ومنتظم حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری بن وصی الرحمن ۱۹۳۱ء میں بوسیدنگ شہر کی شمالی مغربی جانب میں واقع قدیم مسلم رہائشی بستی تمنگ چنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے ہندوستان کا سفر کیا، اور مدرسہ مظاہرالعلوم سہارنپور میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے چندسال پڑھ کر ۱۹۵۴ء میں سندفراغت حاصل کی، اس کے بعد وطن واپس آئے۔ وطن پہنچتے ہی آپ کی شادی خانہ آبادی کے متعلق کچھ ناقابل بیان امور سامنے آگئے تو آپ دوبارہ ہندوستان گئے، اور دارالعلوم دیوبند میں دوسال دورۂ تفسیر کی تکمیل کرکے پھروطن آگئے تھے۔

اب کی بار وطن آتے ہی آپ نے شادی خانہ آبادی کی سنت ادا کی، اور حضرت مولانا مشتاق احمد صاحب ندوی سانگری بیلی کی بیٹی سے آپ کا نکاح ہوگیا۔ اس کے بعد علاقے کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، بالآخر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے مدرس بنے، پھروقت گزرنے پر آپ کی انتظامی صلاحیات سامنے آئیں تو جامعہ کی مجلس شوری نے آپ کو اس کا مہتمم بنایا، یوں آپ نے اس دینی درس گاہ کی تعمیر وترقی کے حوالے سے دور دراز کے کئے سفر کئے، اس سلسلے میں بارہا برما کے دارالحکومت رنگون کے علاوہ سعودی عرب کے مختلف دورے کئے، آپ کی مسلسل جدوجہد سے الحمدللہ اس محسن ادارہ کی خاصی ترقی ہوئی تھی۔

اگرچہ مولانا بعد میں مع اہل خانہ رنگون چلے گئے تھے، لیکن عرصۂ دراز تک جامعہ اسلامیہ بوسیدنگ کے منصبِ اہتمام پر برقرار رہے تھے، بعد میں جہاں تک مجھے یاد ہے کہ آپ نے اپنی ذمے داری حضرت مولانا ابوالحسین صاحب کوائنگی کی سپرد کی، تاہم ہر حالت میں اس محسن ادارہ کی ترقی اور کامیابی کے لئے کوشاں رہے۔

۱۹۹۲ء کا واقعہ تھا کہ مولانا حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے علاوہ جامعہ اسلامیہ عالیہ کی فلاحی پروگرام لئے حجازِ مقدس گئے تھے، واپسی پر بنگلادش اترے اور چاٹگام آئے تھے، اسی دوران آپ سے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کی رہائش گاہ میں ملاقات ہوگئی تھی، اس ملاقات کے دوران

آپ نے مجھے مستقل طور پر رنگون جانے کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ:

''مولوی طاہر! تم جیسوں کے لئے رنگون کی سرزمین بڑے کام کی ہے، اور تمہاری وہاں خاصی ضرورت بھی، میں جانتا ہوں کہ وہاں تم سے جو کام ہو سکے گا، اس کا امکان بنگلادیش میں نہیں ہے، اور جہاں تک میں دیکھ رہا ہوں کہ وہاں تمہارا مستقبل بہت روشن ہے، منظور ہو تو اس حوالے سے میری خدمات حاضر ہیں، میں اصرار سے کہہ رہا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو، ورنہ یاد رکھو کہ ایک دن تجھے میری بات ستائے گی''۔

مولانا بڑی نستعلیقی کیفیت کے بزرگ تھے، افتادِ طبع اور مزاج کے اعتبار سے آپ کو ایک خوش طبع انسان کہنا آپ کا حسبِ حال تھا، ہماری طالب علمی کے زمانے میں آپ جامعہ اسلامیہ عالیہ کے مہتمم تھے، آپ جبھی جامعہ میں تشریف لاتے تو فوراً چند بزرگ ترین شخصیات آپ کے گرد جمع ہوجاتی تھیں، جن میں سے درج ذیل شخصیات ناقابلِ فراموش ہیں:

۱۔ حضرت مولانا ابوسعید صاحب ہولی مرنگی، ناظم برائے امور تعلیمات، جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ۔

۲۔ جناب ماسٹر عزیز احمد صاحب بن حضرت مولانا اصحاب الدین صاحب زادی فرانگی، بوسیدنگی۔

۳۔ جناب الحاج عبدالمطلب صاحب رواسوگری، بوسیدنگی۔

مذکورہ تینوں حضرات بشمول مولانا مظاہری صاحب جبھی ایک جگہ جمع ہوتے تو محفل میں چار چاند لگ جاتے تھے۔ نہ جانے یہ حضرت آپس میں کیا کچھ کہتے تھے، ہنستے، مسکراتے اور کبھی کبھار سرگوشیاں بھی کر لیتے تھے۔

حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری اور حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب کے مابین ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا، دونوں بزرگوں کے آپس کی محبت دیکھی جانے والی تھی، یہاں تک دیکھا گیا تھا کہ ان دونوں کے درمیان اتنی بھائی چارگی اور دوستی تھی کہ جسے دیکھ اکثر لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ دونوں آپس میں بھائی ہیں، ہماری طالب علمی کے زمانے میں حضرت مفتی صاحب کافی عمر رسیدہ تھے، پھر بھی ہم نے جہاں تک دیکھا کہ جبھی حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب جامعہ تشریف لاتے تو حضرت مفتی صاحب کے چہرے میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔

اللہ تعالی نے حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب کو چند بیٹیوں سے نوازا، جب کہ حضرت مفتی صاحب کو زیادہ اولاد نرینہ عطا کی، سن رکھا تھا کہ جبھی مفتی صاحب کے گھر مولانا حسین احمد صاحب پیدا ہوئے تو حضرت مظاہری صاحب نے مفتی صاحب سے گزارش کی کہ مفتی صاحب! آپ ازراہ کرم حسین احمد کے بدلے مجھ سے اپنی ایک بیٹی لئے لیں، تو اس بات سے ظاہر ہے کہ ان دونوں کے مابین کتنی محبت اور کیسا لگاؤ تھا۔

جہاں تک اندازہ ہوتا کہ مولانا مظاہری صاحب کو اپنے لائق شاگرد مولانا حسین احمد کی لیاقت وصلاحیت، قابلیت واستعداد پر نہایت اعتماد اور بھروسہ تھا، چاٹگام کی مذکورہ ملاقات کے دورانِ گفتگو ایک موقع پر فرمانے لگے تھے ''حسین احمد! خدا کرے تو تم ہمارے اسلاف کی لاج رکھو گے''۔

حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب ایک بڑے عالم اور قوم کے بڑے خادم بزرگ تھے، آپ نے اپنی مستعار زندگی میں دین وملت اور قوم ووطن کی بڑی بڑی خدمات انجام دیں، آپ رنگون میں عرصۂ دراز تک علالت میں مبتلا رہے، اور آخرکار ۲۰۲۱ء میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے اس جہانِ فانی رخصت لے چلے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت مولانا مظاہری صاحب کی اولاد میں محمود الحسن صاحب ایک زیرک اور قومی امور کے حوالے سے فکرمند دانشور ہیں، عرصۂ دراز تک رنگون سمیت ملک کے دیگر علاقہ جات میں اقوام متحدہ کے تحت مختلف رفاہی کام کرتے رہے تھے، لیکن افسوس ہے کہ آپ کو ملک کے سیاسی حالات کے شکار ہوکر وطن چھوڑنا پڑا، آج کل تھائی دارالحکومت بنکاک میں عارضی طور پر مقیم ہیں۔ علاوہ ان کے مولانا کی اولاد میں برادر عزیز مولوی اکرام الحسن صاحب مقیم حال مکہ مکرمہ بھی ماشاء اللہ ایک عالم دین اور مجاہد فی سبیل اللہ ہیں، عرصۂ دراز تک ہماری زیرزمین کام کرنے والی تنظیم ''روہنگیا اسلامی محاذ'' کے سرگرم رکن رہے، جہاد کے سلسلے میں افغانستان بھی گئے، دشمنان اسلام کے خلاف ہونے والے جہاد میں بھی شرکت کی، آپ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کے حالیہ خیراندیش ساتھیوں میں سے ایک ہیں، ماشاء اللہ بڑے بااخلاق اور نہایت خوش مزاج ہیں۔ اللہ تعالی سلامت سے رکھے۔

مولانا ولی احمد صاحب خیرمورہ فارویؒ، بوسیدنگی:

مولانا ولی احمد بن علیم اللہ بن عبدالحمید بن علیم الدین شاہ صاحب کی ولادت ۱۹۴۵ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معروف ومردم خیز مسلم بستی خیرمورہ فارا میں ہوئی، یہ بستی شہر بوسیدنگ سے کوئی بارہ میل کے فاصلے پر کوہ مایو کے مشرقی ڈھلوان میں صدیوں سے آباد ہے، دور آخر میں اس بستی سے بڑے بڑے علماء اور خدامانِ قوم پیدا ہوئے، جن میں مولانا ولی احمد صاحب کے علاوہ مولانا رشید احمد صاحب، مولانا محبت علی صاحب، مولانا نور محمد بن علیم اللہ صاحب اور صدیق مکرم مولانا جمال احمد صاحب مقیم حال ولایاتِ متحدہ امریکہ قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا ولی احمد صاحب کے والد گرامی علیم اللہ صاحب ایک کاشتکار آدمی تھے، علماء، صلحاء اور طالبان علوم نبوت سے نہایت محبت کرنے والے بزرگ تھے، اور آپ کے والدۂ مرحومہ رقیہ بنت نور الزمان نہایت سنجیدہ اور عابدہ خاتون تھیں۔

مولانا کی مکتب نشینی اپنی آبائی بستی کے مکتب میں ہوئی، اس کے بعد مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے جماعتِ سیوم تک تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مشرقی پاکستان گئے،، اور مدرسہ اسلامیہ چاریہ۔شمالی چاٹگام۔ میں جماعت دوم اور اولی کی تعلیم پائی، اس کے بعد دورۂ حدیث کے لئے چاٹگام کی معروف درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، یوں یہاں ایک سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد آپ وطن لوٹے، ابتدا میں علاقے کے دو ایک مدارس میں تعلیم دی، پھر جامعہ عالیہ میں مدرس بنے، یہاں ابتدائی کتابوں سے لے کر منتہی تک کی کتابوں کا درس دیتے رہے تھے۔

نہ جانے کیوں کہ آپ نے مع اپنی اولاد واہل مغربی پاکستان ہجرت کی، اور مدت دراز تک کراچی میں مقیم رہے، یہاں آپ نے امامت وخطابت کے تہ بتہ مختلف دینی مدارس میں تعلیم دی، اس کے بعد مع اہل واولاد سعودی عرب جانا مناسب سمجھا، تو بڑی کوشش سے سرزمین مقدسہ مکہ مکرمہ پہنچ گئے، یہاں بھی آپ نے اپنے انتقال تک مختلف مساجد کی امامت کے ساتھ ساتھ چند دینی مدارس میں مسلم بچوں کی تعلیم دی، بالآخر سرزمین ارکان کے اس بزرگ ترین عالم دین نے ۲۰۱۵ء میں داعی اجل کو

لبیک کہا، اور خاک مقدس مکہ مکرمہ میں مدفون ہیں، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا کی اہلیہ محترمہ حافظ نور احمد یونگ چنگی کی صاحب زادی ہیں، تادم تحریر زندہ اور سلامت سے ہیں، مکہ مکرمہ میں مقیم ہیں، جن کے بطن سے مولانا کے چھ اولاد نرینہ اور چار لڑکیاں پیدا ہوئیں۔

مولانا نور محمد (برادر عزیز حضرت مولانا ولی احمد صاحبؒ) کے بیان کے مطابق مولانا ولی احمد صاحب نے چند کتابیں بھی تصنیف کیں، لیکن تادم تحریر ان میں سے کوئی بھی تصنیف آج تک منظر عام پر نہیں آسکی، خدا معلوم ہے کہ آپ کی ان تصانیف کا کیا حال ہے؟

ادھر راقم سطور نے بھی اپنے عنفوان شباب میں (وہ جماعت پنجم یا چہارم کا طالب علم اور جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں پڑھتا تھا) آپ کی ایک تصنیف حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب ہولی مرنگی (خلیفہ ومجازِ بیعت حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی) کے پاس دیکھی تھی، جہاں تک یاد ہے کہ یہ تصنیف فن نحو کی معروف اور ہمارے مدارس میں متداول کتاب ''کافیہ'' کی شرح ہے، چوں کہ مولانا ہولی مرنگی صاحب اس زمانے میں شاید بعد میں بھی ہوں کہ کافیہ اور شرح ملا جامی کے استاد تھے، اس لئے یہ شرح ہمیشہ ان کے پاس رہتی تھی، یہ مخطوطہ شرح مجھے پڑھنے کی نوبت تو نہیں ہوئی، لیکن بس دیکھنے کی حد تک جتنا یاد ہے کہ مولانا ولی احمد صاحب کی تحریر میں نہایت جدت وندرت تھی، خط بڑا خوش نما تھا، شاید آپ خطاط نہ بھی تھے، لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ آپ خوش نویس ضرور تھے، آہ! آج آپ کے ساتھ ہی ساتھ استاد محترم مولانا شاہ ابوسعید صاحب بھی اس دنیا میں نہیں ہیں، نہ جانے آپ کی تصنیف کردہ اس شرح کا کیا حال؟

مولانا ولی احمد صاحب کے متعلق مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا ابوسعید صاحب کے علاوہ بہتوں سے بہت کچھ سن رکھا، ان تمام سنی سنائی باتوں کو سر دست یک جا کرنا آسان کام تو نہیں ہے، تاہم ان سب کا خلاصہ کچھ یوں ہے کہ حضرت مولانا ایک جلیل القدر عالم دین، ماہر علوم وفنون، ایک مستعد وقابل مدرس ومعلم، نہایت بلند اخلاق اور صفات وکمالات کے بزرگ تھے، ساتھ ساتھ زاہد و عابد اور دل دردمند اور فکر ارجمند کے حامل شب زندہ دار ولی اللہ بھی۔

مولانا نور احمد صاحب زادی فرانگیؒ، بوسیدنگی:

ہمارے اساتذہ میں سے ایک بڑے عالم دین، قابل قدر مدرس ومعلم حضرت مولانا نور احمد صاحب کی پیدائش شمالی بوسیدنگ کی معروف ومردم خیز مسلم بستی زادی فرانگ میں ہوئی، عام قومی روایت کے مطابق آپ کی ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی میں ہوئی، اس کے بعد علاقے کے مختلف دینی مدارس میں متوسطہ تک کی تعلیم پائی، اس کے بعد اعلی دینی تعلیم کے سلسلے میں ہندوستان کا سفر کیا، اور معروف روایت ہے کہ آپ نے دار العلوم دیوبند میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد مولانا سیدھے اپنے وطن آئے، اور علاقے کے مختلف دینی مدارس میں تعلیم دیتے رہے، آپ مولانا حسین احمد ابو الفضل صاحب کے علاوہ میرے بھی شفیق استاد ہیں، پڑھاتے وقت دیگر اکثر مدرسین ومعلمین کرام کے برعکس ہمیشہ کتاب کے موضوع میں رہتے تھے، اور درس میں طول طویل تقریر سے نہایت پرہیز کیا کرتے تھے، کان کے تھوڑے بہرے تھے، لیکن بڑے باشعور اور حساس، آپ نے عرصۂ دراز تک جامعہ اسلامیہ بوسیدنگ میں علم دین اور طلبائے علوم دینیہ کی خدمت کی، اور وہ بھی بڑی شان اور آن بان سے۔

مولانا ایک جلیل القدر عالم دین ہونے کے علاوہ درویش صفت انسان تھے، جہاں تک میں نے دیکھا کہ آپ نماز بڑے اطمینان سے ادا کرتے، اور رات کے آخری حصے میں تہجد کے لئے بڑی پابندی سے جاگ جایا کرتے تھے، یوں ایسے بزرگوں کو ایک عالم دین کے ساتھ ساتھ عابد وزاہد بھی کہا جاسکتا ہے، ماشاء اللہ بڑے شب زندہ دار انسان تھے۔

مولانا ہماری طالب علمی کے زمانے میں درجۂ متوسطہ اور درجۂ علیاء کے استاد تھے، اور سطور بالا میں جس طرح عرض کی جا چکی ہے کہ آپ کتابیں پڑھانے کے دوران عام مدرسین کرام کے برخلاف طول طویل بحث نہیں کرتے تھے، اور مسئلہ کو ذہن نشین کرا کے آگے بڑھ جاتے تھے، دوران درس باتوں کے بتنگڑ بنانے کی عام روایات جو ہمارے مدارس میں پائی جاتی ہیں، آپ کو ان سے گویا نفرت تھی۔

مولانا تمیز الرحمن صاحب گوفیوی، بوسیدنگیؒ:

سرزمین ارکان کے بزرگ ترین عالم دین حضرت مولانا تمیز الرحمن صاحب کی پیدائش شمالی بوسیدنگ کی بستی گوفی میں ہوئی، علاقے کے دینی مدارس سے ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پا کر بنگلا دیش کی معروف دینی درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں داخلہ لیا، اور وہیں سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ وطن لوٹے، اور جامعہ اسلامیہ عالیہ میں درس دیتے رہے، ہمارے زمانے میں آپ ابتدائی، متوسطہ اور درجۂ علیاء کی مختلف کتابیں پڑھایا کرتے تھے، مولانا حسین احمد صاحب کے علاوہ راقم بھی آپ کے شاگردوں میں سے ہے۔ جہاں تک میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ نہایت ذکی الحس، باشعور عالم دین اور نہایت قابل مدرس و منتظم تھے، آپ اپنے حصے کی کتابیں بڑی خوش اسلوبی سے پڑھایا کرتے تھے، اور جتنے بھی پڑھاتے طلباء کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔

مولانا جامعہ اسلامیہ عالیہ کے عرصۂ دراز تک ناظم برائے امور تعلیمات رہ چکے تھے، حتی کہ ''ناظم صاحب'' آپ کا نام بن چکا تھا، آپ وقت کے نہایت پابند تھے، طلباء کی غیر حاضری کبھی اور کسی بھی حالت میں آپ کو برداشت نہیں تھی، دل کے سچے، کم گو مگر زبان کے پکے عالم دین ہیں۔

مولانا نے ۱۹۸۳ء میں وطن سے ہجرت کی، سبب یہی تھا کہ ایک روز آپ اپنی رہائش گاہ ''بوسیدنگ ریلوے والے محلے'' سے معمول کے مطابق جامعہ کی طرف آرہے تھے، راستے میں ایک بدمعاش قسم کے بدمزاج بودھ بھکشو جو دوسری جانب سے آرہا تھا کے سائے پر آپ کا قدم پڑا تو بھکشو نے آگ بگولہ ہو کر زبان درازی کے ساتھ آپ پر ہاتھ رنگانے کی کوشش کی، تو آپ بھی چھوڑنے والے کب تھے؟ حتی کہ آپ نے اس بھگوڑے کی ایسی پٹائی کی کہ لہولہان ہوگیا، اب معاملہ ایسا بگڑا کہ دیکھتے ہی دیکھتے مذہبی رنگ اختیار کر گیا، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس معاملہ کی وجہ سے آپ کا یہاں جینا دوبھر ہوگیا تھا، ویسے آپ نے غیرت میں آکر وطن سے مع اہل وعیال ہجرت کی تھی، مولانا کی ہجرت پر نہ صرف یہاں کے علماء وطلباء بلکہ عوام الناس بھی روئے، مجھے ذاتی طور پر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کا ماحول وفضاء سونی سونی سی محسوس ہوتی تھی۔

بہر حال مولانا وطن سے ہجرت کر کے مع اہل وعیال سرزمین مقدس مکہ مکرمہ پہنچے، راقم سطور نے وہاں آپ سے چند مرتبہ ملاقاتیں کیں، جبھی ملنے جاتا نہایت مسرت کا اظہار کرتے تھے۔

مولانا ابوالحسین صاحب کوائنڈنگی، بوسیدنگیؒ:

علاقۂ بوسیدنگ کے معروف عالم دین اور جامع مسجد بوسیدنگ کے خطیب حضرت مولانا ابوالحسین صاحب کی پیدائش بوسیدنگ کی مردم خیز مسلم بستی کوائنڈنگ میں ہوئی، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم علاقے میں پا کر ایک مشہور روایت کے مطابق چاٹگام کی معروف دینی، علمی اور روحانی درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

دستور کے مطابق آپ فراغتِ تعلیم کے بعد وطن واپس آئے، اور علاقے کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے، بالآخر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کا مدرس ہوئے، یہاں آپ نے درجۂ ابتدائیہ اور متوسطہ کی مختلف کتابیں پڑھائیں، میں نے بھی آپ سے نورالایضاح اور نفحۃ الیمن وغیرہ کتابیں پڑھیں، بڑے نیک اور مخلص استاد تھے، طلباء کو سبق یاد کرانے کی بڑی کوشش کیا کرتے تھے۔

ہمارے زمانے میں مولانا نگران برائے امور طلباء (ہاسٹل) تھے، جسمانی اعتبار سے کافی موٹے فربے تھے، لیکن رات کے آخری پہر جاگتے اور طلباء کو بڑے اہتمام سے جگایا کرتے تھے، طلباء کو جگانے کے متعلق آپ کا انداز تھوڑا غصیلا تھا، ایک مرتبہ جگانے کے بعد اگر کوئی طالب علم تھوڑی بھی غفلت کا مظاہرہ کرتا تو پٹ جاتا تھا، بعض طلباء کو آپ کا یہی غصیلا انداز بہت پسند تھا، کبھی کبھار دانستہ طور پر میں بھی آپ کے اس انداز سے محظوظ ہوا کرتا تھا۔

مدرسی کے زمانے میں مولانا جامعہ اسلامیہ عالیہ کے بغل میں پائی جانے والی شہر کی سب سے بڑی قدیمی جامع مسجد کے امام اور خطیب تھے، آپ کی آواز کافی بلند اور وزنی تھی، جمعہ اور عیدین کے خطبے بڑے میٹھے لہجے اور نرالے انداز میں دیا کرتے تھے، عوام تو عوام بلکہ علماء اور طلباء بھی آپ کی قرأت اور خطبے بہت پسند کرتے تھے، ویسے آپ کو ہر کجا امام صاحب کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری مستقل طور پر رنگون منتقل ہوجانے کے بعد جامعہ اسلامیہ عالیہ کے اہتمام کی ذمے داری آپ پر ڈالی گئی تھی، جہاں تک معلوم ہوا کہ آپ نے اپنی ذمے داری کو بڑی خوبی سے نبھایا تھا، یوں آپ نے ملک وملت اور علماء وطلباء کی مقدور بھر خدمات کر کے ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ داعیٔ اجل کو لبیک کہا، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا شاہ ابوسعید صاحب ہولی مرنگی، بوسیدنگیؒ:

ہمارے زمانے میں سرزمین ارکان کے ایک بلند پایہ کے مشہور عالم دین، صاحب دل و صاحب نظر بزرگ، عارف کامل حضرت مولانا شاہ ابوسعید حاحب کی پیدائش ۱۹۴۸ء میں بستی ہولی مرنگ میں ہوئی، یہ مسلم بستی شہر بوسیدنگ کی مغربی جانب تقریباً ایک میل کے فاصلے پر زمانۂ قدیم سے آباد ہے، ہمارے لڑکپن کی بات ہے کہ عموماً اس بستی کے باشندے سنجیدے تھے، لیکن اخلاقی لحاظ سے ان کے مابین کچھ اچکے قسم کے لوگ بھی پائے جاتے تھے، جن کی نازیبا اور غیر عادلانہ حرکات وسکنات کی وجہ سے پورے علاقے کے باشندوں کو کبھی کبھار پریشانی میں مبتلا ہونا پڑتا تھا، خدا معلوم آج کل اس بستی کی کیا حالت ہے؟

مولانا کے والدگرامی محترم مرحوم جلال احمد صاحب ہولی مرنگی نہایت سادہ لوح، علماء دوست اور طلباء پسند بزرگ تھے، اور کبھی کبھی فرمایا کرتے تھے کہ میں جب کسی عالم یا طالب علم کو دیکھتا ہوں تو اسے میرا بیٹا ابوسعید جیسا لگتا ہے۔ اور مولانا کی والدہ بھی بہت ہی سیدھی سادھی اور پاکیزہ صفات خاتون تھی (۱)۔

مولانا کے خاندان اور خاندان کے دیگر بزرگوں کے متعلق آج لکھنا بڑا مشکل ہے، نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ اس دودمان عالی مقام ہستی کے خاندان اور اس خاندان کے بزرگوں کے متعلق معلومات میرے پاس نہیں ہیں، تاہم جہاں تک مولانا کے والدین کو دیکھا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شاید آپ کے خاندان میں شرفاء اور نجباء کی کمی نہیں تھی۔

مولانا کے ناظرۂ قرآن کریم، مبادیات دینیہ، فارسی اور اردو کے علاوہ بنگالی کی ابتدائی تعلیم اپنی آبائی

---

(۱) حضرت مولانا شاہ ابوسعید صاحب کے والدین کریمین سے مجھے بڑی شفقت اور پیار ملا تھا، شام کو مدرسے کی چھٹی کے بعد میں جبھی مولانا کے گھر پہنچتا تو ان دونوں بزرگوں کے چہرے خوشی سے تمتما اٹھتے، مغرب کے بعد کھانے کے دسترخوان پر دونوں میرا انتظار کرتے تھے، کبھی میرا وہاں جانا نہیں ہوتا تو سنا ہے کہ مولانا سے پوچھتے تھے کہ آج طاہر آیا کیوں نہیں ہے؟ پھر اگلے دن شام ڈھلے میں پہنچتا تو کہتے تھے کہ طاہر! کل تم کہاں تھا؟ آیا کیوں نہیں تھا؟؟ آہ! آج یہ دونوں بزرگ تو کیا خود مولانا بھی اس دنیا میں نہیں رہے، ان کی یادیں ستاتی تو ضرور ہیں، لیکن آخر کرنا ہی کیا، سوائے دعاؤں کے۔

بستی میں ہوئی، جہاں تک اندازہ کیا کہ آپ کے والدین کو اپنے اکلوتے بیٹے سے حد درجہ محبت تھی، یوں انہوں نے آپ کو بڑے شوق سے تعلیم دلوائی تھی، کچھ بڑے ہوئے تو جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخل کروایا، تعلیمی اعتبار سے اس زمانے میں اس درس گاہ کی نہایت شہرت تھی، جس میں حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب، حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب، حضرت مولانا مشتاق احمد ندوی صاحب، حضرت مولانا ولی احمد صاحب جیسے بلند پائے کے علمائے دین درس دیا کرتے تھے، آپ نے یہ اور ان جیسے دیگر علمائے عظام سے خوب خوب استفادہ کیا، آپ کے بیانات سے معلوم ہوا کہ آپ نے تعلیم کے دوران بڑی محنت اور کافی عرق ریزی سے کام لیا تھا، اپنے سنہرے اوقات کی بڑی قدردانی کی تھی، گویا آپ مدسے کے اور مدرسہ آپ کا بن چکا تھا، بالآخر اسی مدرسے سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔ آپ نے مکتب نشینی کے بعد سوائے جامعہ اسلامیہ عالیہ کے کسی دوسری دانش گاہ سے تعلیم حاصل نہیں کی، یوں کبھی کبھار آپ اپنے نام کے آخر میں جامعی بھی لکھا کرتے تھے۔

فراغت تعلیم کے بعد آپ نے جنوبی بوسیدنگ کی بستی منی بیل کے ایک معزز گھرانے کی ایک خوش خصال خاتون سے شادی کی، جس گھرانے سے آپ کی شادی خانہ آبادی ہوئی، اس گھرانے کے متعلق بہت ساری معلومات میرے ذہن میں محفوظ ہیں، تاہم سر دست اتنی سی بات بتا تا چلوں کہ اس گھرانے کے ساتھ ہم اور ہمارے رشتے داروں کے قریبی تعلقات تھے، اور اب بھی ہیں، علاوہ ازیں مولانا کے رشتے کا بھائی مولوی محمد الیاس منی بیلی جو ہے وہ میرا ہم سبق تھا، اس کی وجہ سے میرا اس خاندان کے یہاں آنا جانا ہوا کرتا تھا۔

یہاں مولوی محمد الیاس صاحب کا تذکرہ آیا تو ان کے متعلق بہت ساری بھولی بسری باتیں یاد آ گئیں، ان تمام باتوں سے قطع نظر بس اتنی سی بات بتا دیتا ہوں کہ مولوی صاحب ماشاءاللہ بڑے محنتی طالب علم تھے، اور نہایت خوش خصال بھی، ہم دونوں مولانا سے مدرسے میں ایک ساتھ پڑھتے تو تھے ہی، البتہ وہ کبھی کبھار میرے ساتھ شام ڈھلے مولانا کے گھر آتے، اور رات گئی تک میرے ساتھ شریک درس رہتے تھے۔

میری معلومات کی حد تک مولانا ابوسعید صاحب نے پہلی والی اہلیہ کے انتقال کے بعد (جب کہ

ایک روایت کے مطابق خود پہلی والی اہلیہ کی زندگی میں) مرحوم مولوی ابوالکلام لوادنگی کی بیوہ سے نکاح کیا، لیکن قدرت کو اور ہی منظور تھا کہ اس شادی کے چند سال بعد دوسری اہلیہ نے بھی داغ فراغ دیتے ہوئے داعی اجل کو لبیک کہا، ان دونوں بیویوں کے داغہائے فراغت کے حوالے سے آپ نے راقم سطور سے ایک ٹلفونک رابطے کے دوران نہایت حسرت و یاس کا اظہار فرمایا، اور ان دونوں کے متعلق ماضی کی بھولی بسری یادوں کا تذکرہ فرمایا تھا، جس سے اندازہ ہوا کہ آپ ان دونوں کی جدائی کے بعد ذہنی طور پر شاید جسمانی طور پر بھی ہو کہ قدرے ٹوٹ گئے تھے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ جامعہ اسلامیہ عالیہ کے مدرس ہوئے، اور حضرت مولا تمیز الرحمن صاحب کی ہجرت کے بعد نظامتِ تعلیم کی ذمے داری آپ پر ڈالی گئی، ہمارے زمانے میں آپ اس ادارے کے گویا سب کچھ تھے، مہتمم حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب مظاہری صاحب نے گویا آپ کو اس ادارے کا رکھوالا بنا دیا تھا، لیکن جہاں تک دیکھا اور اندازہ کیا کہ آپ نے اپنی ذمے داری اور فرائض منصبی کو بڑی خوبی سے نبھایا، نماز فجر کے معا بعد اور کبھی کبھار پو پھٹے آپ مدرسہ پہنچ جاتے تھے۔

مولانا کے پڑھانے کا ڈھنگ بڑا نرالا تھا، پڑھانے کے حوالے سے آپ بڑے لگن اور محنت سے کام لیتے تھے، طلباء سے آپ کی بڑی محبت تھی، ہر ایک کو اپنی اولاد جیسے سمجھتے تھے، اور طلباء بھی آپ پر جان چھڑکتے تھے، ڈرانے دھمکانے اور ڈانٹ ڈپٹ سے ہمیشہ گریز کرتے تھے، ڈرانے دھمکانے کے انداز کو نہ آپ طلباء کے لئے اور نہ اساتذہ کے لئے مفید سمجھتے تھے، اللہ تعالی نے آپ کی ذات وشخصیت میں خاصی کشش رکھی تھی، طلباء تو خیر طلباء بلکہ بعض وہ اساتذہ جو ہمارے زمانے میں آپ کے اساتذہ نہ تھے، وہ بھی آپ کی شخصیت کے زیر اثر رہتے تھے، لیکن آپ حسبِ مراتب ہر ایک کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے، آپ کے خلاف کسی استاد، طلباء، حتی کہ شہر کے شرفاء ونجباء تک کی کوئی شکایت نہیں سنی گئی، اس طرح آپ کی زبان سے بھی کسی کے خلاف کوئی حرف غلط صادر ہوتا ہوا نہیں دیکھا گیا تھا۔

میں نے جماعتِ نہم سے لے کر جماعتِ سیوم تک کی تقریبا ساری اہم کتابیں مولانا سے پڑھیں، نحو، صرف، بلاغت، منطق اور ادب عربی کی اہم متداول کتابوں کے پڑھنے کے علاوہ فقہ واصول فقہ

کے بعض ضروری مضامین کے حوالے سے آپ سے استفادہ کیا، یوں آپ کی لیاقت واستعداد سے اندازہ ہوا کہ آپ کی تعلیمی زندگی کے مراحل جس درس گاہ میں طے ہوئے، اور آپ کو جن جن جید اساتذہ اور صاحبانِ علم وفضل کی صحبتیں میسر ہوئیں، وہ حقیقت میں بڑے پائے کے اساتذہ اور معلم ہوں گے، جنہوں نے آپ کی فطری صلاحیت کو نکھارا اور سنوارا تھا۔

چلتے چلتے ایک بات یاد آ گئی ہے کہ راقم سطور کی پڑھائی کے حوالے سے آپ کا انداز ہی الگ تھا، آپ یوں تو ہمارے زمانے میں اور بعد میں بھی درجات علیاء کے استاد تھے، لیکن راقم جس جماعت میں ہوتا تھا اس جماعت کی اہم کتابیں آپ اپنے حصے میں لیتے تھے، ان کتابوں کو یوں تو عام طلباء کے ساتھ درس میں پڑھا دیتے، لیکن راقم کے لئے بطور خاص ایک طرح کا معمول بنا رکھا تھا کہ شام کو مدرسے کی چھٹی کے بعد مجھے اپنے ساتھ گھر لے جاتے، اور بعد مغرب دوبارہ مدرسے میں پڑھائے گئے مضامین پڑھاتے اور ذہن نشین کرا دیتے تھے۔

تعجب کی بات تھی کہ مولانا بنگلا زبان بھی بڑی روانی کے ساتھ پڑھتے اور قدر قلیل لکھ بھی لیا کرتے تھے، اس حوالے سے ایک واقعہ یاد آیا کہ جمعرات کی رات تھی کہ بعد العشاء دو معمر شخص (جن کو میں اس سے پہلے نہیں جانتا تھا) آپ کے گھر آئے، جن کے ہاتھ میں ہمارے عبقری قومی شاعر حضرت علاول کی معروف شاعری کی کتاب ''پداوتی'' تھی (یاد رہے کہ ہمارے علاقے میں اس نوعیت کی شاعری کی کتابوں کو ''فوتی'' کہا جاتا ہے، ہمارے زمانے میں گاؤں کے معمر لوگ چراغ جلائے کبھی کبھار اور بطور خاص شادی بیاہ کے موقع پر ذوق وشوق سے پڑھتے اور شائقین وسامعین کان لگا کر سنتے تھے، ایک آدمی ترنم کے ساتھ پڑھتے، جب کہ دوسرا اس کا ترجمہ کرتے تھے، اکثر ترجمہ کرنے والا آدمی بڑا عجیب وغریب کا ہوا کرتا تھا، پڑھنے والے کی پڑھائی سے بڑھ کر مترجم کی زبان میں لذت وحلاوت ہوا کرتی تھی، نہ جانے آج کل کیا حال ہے؟) انہوں نے آپ کے سامنے کتاب کھولی، اور جن جن مقامات کو سمجھنے سے وہ دونوں قاصر تھے، ان مقامات کو آپ سے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے، جہاں تک مجھے یاد ہے کہ آپ نے ان کو ایسا سمجھایا جیسے کہ وہ عرصۂ دراز سے آپ کے شاگرد ہیں۔

مولانا ایک بلند پایے کے خطیب (واعظ) تھے، جس رات پند ونصیحت کا پروگرام نہیں ہوتا، اس رات بڑی محنت اور لگن سے راقم کو پڑھاتے تھے (اس مخصوص پڑھائی میں کبھی کبھار مولوی محمد الیاس صاحب منی بیلی بھی شریک ہوتے تھے) اور جس رات پند ونصیحت کا پروگرام ہوتا تھا، آپ مجھے اپنے ساتھ لے جاتے، اور محفل وعظ کے درمیانی راستے پر چلتے چلتے درس کے کسی اہم موضوع پر بحث چھیڑ دیتے، اور بات کے اواخر میں مجھے ٹٹولا کرتے تھے کہ بات کہاں تک ذہن نشین ہوچکی ہے۔

پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ جس طرح مولانا کی ساری تعلیم جامعہ اسلامیہ عالیہ میں ہوئی، اسی طرح آپ کی تدریسی خدمات بھی ساری کی ساری اسی ادارے میں ہوئی تھیں، ماشاء اللہ آپ کے ہزاروں تلامذہ ہیں، جو وطن کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔

یوں بھی مولانا جو کچھ پڑھاتے تھے، بڑی محنت اور لگن کے ساتھ پڑھاتے تھے، اور کوشش کرتے تھے کہ طلباء کو آپ کی پڑھائی سے فائدہ پہنچے۔ تو آج خیال آرہا ہے کہ آپ نے جس تندہی اور شفقت و لگن سے اس حقیر کفش بردار کو پڑھایا تھا، شاید دیگر کسی کو پڑھایا ہوگا، اس حوالے سے بھی ایک بات یاد آگئی ہے کہ غالباً ۲۰۰۸ء کا واقعہ تھا کہ ہزار کوشش کے نتیجے میں آپ سے ٹیلفونک رابطہ ممکن ہوا، تو آپ نے دوران گفتگو ایک موقع پر فرمایا کہ:

> ''میری اس پچاس سالہ تدریسی زندگی میں دو غیر معمولی طالب علم میرے ہاتھ لگے، ان میں سے ایک مولوی حسین احمد ابوالفضل جب کہ دوسرا تم ہو، خصوصاً تمہارے ساتھ میری بہت ساری تمنائیں، آرزوئیں اور امیدیں وابستہ ہیں، خدا کرے کہ تمہاری ذات سے جو امیدیں اور تمنائیں وابستہ ہیں وہ پوری ہو جائیں، تاہم تم دونوں کے علاوہ ایک اور طالب علم تھا، سلامت اللہ (مرنگناوی، علی چنگی) اس کا نام تھا، لیکن اس سے جو امید تھی وہ بھر نہیں آئی، اللہ تعالیٰ تمہیں مزید فضل وعنایات سے نوازے، آمین''۔

راقم سطور نے مولانا کے دامنِ تعلیم وتربیت سے وابستہ ہوکر جو کچھ پایا، اور آپ کی کفش برداری کی برکت سے جو کچھ حاصل کیا، وہ کبھی بھی بھولے سے بھلائے جانے کے قابل نہیں، اور تو اور آج جو اس کا

قلم بزرگوں کے تذکرے وتراجم کو زیر قرطاس لانے کے لئے راہوں پر چل پڑا ہے، محسوس ہوتا ہے کہ آپ کی نیک تمنائیں اور خصوصی دعائیں اندر ہی اندر کام کر رہی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اگلی زندگی کے ہر قدم پر آپ کی محبت وشفقت کی یادیں مزید پھیلتی پھلتی ہوئی رنگ لائیں گی، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس محبت وشفقت صادقہ کی برکت وفیضان ہو کہ آج اس ناکارہ کفش بردار کو آپ کی حیات وکوائف پر قلم اٹھانے کی توفیق اور سعادت نصیب ہوئی ہے، تاہم یہ ایک سچی بات ہے کہ قحط الرجال کے اس دور میں سرزمین ارکان کی اس ممتاز شخصیت اور اس خادم دین وملت کا تذکرہ بڑی درک بینی اور سلیقے سے لکھنا اور مرتب کرنا ضروری تھا، جو ہماری اگلی نسل کے لئے مشعل راہ اور سوغات سفر ہو سکے، لیکن حقیقت حال یہی ہے کہ ایک تو میری یادداشتیں بڑی کمزور ہوچکی ہیں، اس پر مستزاد یہی ہے کہ آپ جیسی ہستیوں پر قلم اٹھانے کے لئے جس استعداد ولیاقت کے ساتھ جن محنتوں کی ضرورت ہے، وہ مجھ ناچیز کی بس کی بات نہیں ہیں، علاوہ ازیں برسوں کی طویل فرقت وجدائی اندر ہی اندر اپنے کام کرنے کے ساتھ ہی ساتھ ملنے ملانے کی عدم سہولیات دیوار بن کر کھڑی ہیں، آج کل اگر چہ کچھ سہولت ہوگئی ہے لیکن افسوس ہے کہ آج مولانا اس دنیا میں نہیں رہے، پھر بھی میری امید ہے کہ سردست جتنی بھی خامہ فرسائی کی توفیق ہو رہی ہے، اس کے مطالعے سے ہمارے وطن کی ایک ناقابل فراموش شخصیت کے حالات ونقوش زندگی سے قارئین کرام ان شاء اللہ محظوظ ہوسکیں گے، دراصل آپ کا تذکرہ لکھنا مجھ ناچیز پر ایک قرض تھا، جسے ادا کرنے کی کوشش اپنی بساط بھر کی گئی ہے، ممکن ہے کہ قارئین کرام کو جذبات کی شکل میں اس میں عقیدت ومحبت کی کچھ غیر ضروری جھلکیاں بھی نظر آئیں گی۔

اس بات میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کے حالات اور تذکرے کے مطالعے سے انسان کے علم وعمل میں اضافے کے ساتھ ساتھ ذات وصفات میں حسن نیت، اخلاص و للّٰہیت اور اخلاق وسلوک کی کھونپلیں کھل جاتیں اور آہستہ آہستہ نمو پانے لگتی ہیں، اسی اعتبار سے راقم نے مولانا کو جہاں تک دیکھا، آپ کی صحبت سے جتنا کچھ پایا، آج وہ بلا تردد یہ کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا مطالعہ اوروں کے لئے کتنا بھی مفید کیوں نہ ہو، مگر ہم جیسوں کے لئے شبِ تاریک میں ایک قندیل نورانی سے کسی بھی معنی میں کم نہیں ہوگا، وہ اس لئے کہ آپ کی شخصیت میں ایک خاص قسم کی

جاذبیت اور دلاویزی کے ساتھ ساتھ ادب واطوار، زہد وورع، علمی وعملی انہاک، کتاب وسنت کا روحانی ذوق وشوق، بصیرت وفراستِ ایمانی، امانت ودیانت داری، تعلیمی وتدریسی استعداداور عملی سیرت وکردار کے نقوش دکھائے دیتے تھے، یہ اوران جیسی اعلی صفات کو دیکھ کر بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ اپنے وقت کے ایک قابلِ قدر مدرس ومعلم، مستعد عالم دین، شریعت وطریقت کے رموز و اسرار سے واقف ودانا اور ایک صاحب دل مرشد تھے، آپ جیسوں پر قلم اٹھاتے وقت دل میں یہی احساس غالب ہوجاتا ہے کہ ایسی ہستیوں کو موضوع سخن بنانا ایک جسارت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، مگر کیا کروں؟ کہ قحط الرجال کے اس عالم میں فرار کی بھی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔

۲۰۰۳ء کے کسی مہینے میں مولانا اپنے علاج کے سلسلے میں چاٹگام تشریف لائے تھے، اور آپ کے لائق شاگرد مولانا حسین احمد صاحب کی رہائش گاہ میں آپ کا قیام تھا، افسوس ہے کہ آپ کی تشریف آوری کے متعلق مجھے اس وقت خبر ملی جب آپ تشخیص وعلاج کے بعد واپس وطن جا چکے تھے، بعد میں سنا کہ آپ نے میرے متعلق کسی سے پوچا بھی تھا، توجس سے پوچا تھا، اس نے شاید دانستہ طور پر ہو کہ لاعلمی کا اظہار کیا۔ کاش اس وقت آپ سے ملاقات ہوئی ہوتی، تو یہ ملاقات آپ سے میری اس مستعار زندگی کی آخری ملاقات ہوتی، اس حوالے سے میں نے آپ کے نام ایک غم نامہ ارسال کیا تھا، جو شاید دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا:

”گرامی قدر محترم استادِ مکرم حضرت مولانا ابوسعید صاحب مدظلہ العالی۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، وبعد:

امید ہے کہ مزاج گرامی عافیت سے ہوں گے۔

آج شہر چاٹگام کی اس نرالی اور البیلی شام میں دعاؤں اور مناجاتوں کے دوران آپ کی بے حد یاد آئی تو صبح زندگی کے تمام دریچے کھل گئے ہیں، یوں تو مجھے جدائی کے پل سے آج تک آپ کی یادیں ستاتی رہتی ہیں، اور ہمیشہ دل چاہتا ہے کہ کسی بھی طریقے سے آپ کے دیدار سے مشرف ہوکے آؤں، لیکن وطن عزیز کی تندو تیز ہواؤں کی کرم فرمائیاں تھیں کہ پیہم کوششوں کے باوجود دیدار کرنے میں آج تک

بری طرح ناکام ہوں، دراصل بادِ سموم کی کرشمہ سازیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے باپ بیٹے کے درمیان پائی جانے والی الفت ومحبت شدید سے شدید ترین متأثر ہوچکی ہے، اب میں کیا کروں اور کیا کرسکتا ہوں، سوائے دعاؤں اور مناجاتوں کے، خدا کرے کہ وطن عزیز کے اس خزاں دیدہ چمن پھر بادِ بہار سے آشنا ہوجائے۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ آپ نے ایک سہمے ہوئے اور کم زور طالب علم کو اس کے بچپن میں جس درسِ خود آگہی سے آشنا کرایا، وہ کبھی بھی بھولے سے بھلائے جانے کے قابل نہیں ہے، جس کا نتیجہ تھا کہ جس نے اس کے قریب قریب مرجھی ہوئی زندگی کے تیور کو ایک البیلے اور نرالے حال میں بدل دیا، اس حوالے سے آج جبھی میں اپنے دل کی گہرائیوں میں اتر کر سوچتا ہوں تو آپ کی ذاتِ عالی مرتبت کے ساتھ ساتھ آپ کی تعلیم وتربیت کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا، ویسے اس حوالے سے آپ پر جتنی بھی داد تحسین اور خراج عقیدت کے گلدستے نچھاور کئے جائیں تو بھی کم ہوں گے، اللہ تعالی آپ کو دونوں جہاں میں سرخرو فرمائے، اور ملت وقوم کے متعلق آپ کی طرف سے کی جانے والی تمام خدمات کو شرفِ قبولیت بخشے۔ آمین۔

حضرت! گئے گزرے چند مہینے کی بات ہے کہ سنا تھا کہ آپ وطن مقدس کی اس پار تشخیص وعلاج کے سلسلے میں تشریف لائے تھے، اور مولانا حسین احمد صاحب کی رہائش گاہ میں آپ کا قیام تھا، بات تحقیق کی حد تک پہنچی تو مجھے شدید دکھ ہوا کہ آپ کے دیدار سے مشرف نہیں ہوسکا، دل کو سمجھانے نہیں پایا کہ کہیں آپ مجھ سے ناراض تو نہیں ہیں، ورنہ وجہ کیا تھی کہ یہ غریب الدیار کفش بردار شرفِ باریابی سے محروم رہا؟ دنیا میں کوئی برا مانے یا بھلا، مجھے اس کا کوئی غم نہیں، لیکن میں آپ کی نظرِ کرم کا شدید محتاج تھا، اور اب بھی ہوں، بھلا آپ کی نظر میں میں اتنا سیہ کار کب ہو چکا ہوں کہ کفش برداری کی سعادت تک مجھ سے چھین لی گئی؟ کاش اس وقت لمحہ بھر کے لئے سہی آپ کی زیارت نصیب ہوئی ہوتی، تو میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ

میرے خزاں دیدہ گلشن میں بہار آئی ہوتی، اب میرا خیال یقین کی حدیں چھورہا ہے کہ میں ایک گنہگار ہوں، اور اللہ تعالی کے نیک بندوں کی نظروں سے گر چکا ہوں، تو خداوند قدوس کے حضور میری بس یہی التجا ہے کہ وہ اپنے خاص فضل وکرم سے اپنے نیک اور مخلص بندوں کی خدمت اور کفش برداری کی توفیق سے نوازے۔

حضرت! آپ سے امید ہے کہ آپ میرے تمام اساتذۂ کرام، اور بطور خاص حضرت مولانا کوثرؔ صدیقی صاحب اور حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب کو سلام مسنون پہنچادیں گے، باقی آپ سے دعاؤں کی درخواست کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں، والسلام علیکم۔

کفش بردار:

محمد طاہر جمال ندوی۔

۲۰۰۸ء کے اواخر میں میں سعودی عرب سے چاٹگام پہنچا تو ایک کوشش کے نتیجے میں میرا حضرت مولانا ابوسعید صاحب سے ٹلفونک رابطہ ممکن ہوا، دراں حالیکہ آپ منگڈو آئے اور اپنے کسی مرید خاص کے گھر قیام فرما ہوئے تھے، اس رابطے کے دوران آپ سے بہت ساری باتیں ہوئیں، جن میں کچھ ذاتی تھیں اور کچھ قومی امور کی، دوران گفتگو آپ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ:

''میں نے تزکیہ واحسان کے موضوع پر ایک چھوٹی سی کتاب ''**انوار الفجر فی اوراد المظفر**''، لکھی ہے، جو رنگون سے چھپ کر منظر عام پر آچکی ہے، انشاء اللہ مولوی حافظ ابوشمع کے ذریعے تم تک ضرور پہنچاؤں گا، امید ہے کہ یہ کتاب تم ضرور پڑھو گے، اس پر ضروری ملاحظات اور اضافہ وترمیم کے بعد اسے طبع ثانی کی لائق بنادو گے''۔

اگلے ایک مہینے کے اندر مولانا کی کتاب حافظ ابوشمع کے ہاتھوں مل گئی، اور آپ کی تعمیل حکم کے بطور شروع سے آخر تک بغور مطالعہ کیا، اس کے بعد مذکورہ ٹلفون کے متعلق بعض مندرجات کے علاوہ

کتاب کی وصول یابی کے حوالے سے آپ کے نام ایک عریضہ لکھا گیا، یہ عریضہ اگرچہ تھوڑا طویل ہے، لیکن امید ہے کہ قارئین کرام کا ضرور فائدہ ہوگا، بعد میں پتہ چلا کہ یہ عریضہ آپ کے پاس پہنچ گیا، اگرچہ باضابطہ اس کا جواب آپ نے نہیں لکھا، لیکن خبر بھیجی کہ عریضہ دستیاب ہوچکا ہے:

''بخدمت عالی مرتبت حضرت استاد محترم مولانا ابوسعید صاحب (مجاز بیعت حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزویؒ) دامت برکاتکم وفیوضکم العالیہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، وبعد،،،

اللہ تعالی آپ کی ذات اقدس کو ہمارے لئے سدا بابرکت بنائے رکھے، آپ اور آپ کی اولاد، تلامذہ و متعلقین سلامت وعافیت سے رہیں، آمین یارب العالمین۔

میں اللہ تعالی کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے میرے اساتذۂ کرام کی فہرست میں آپ کی ذاتِ عالی مرتبت کو شامل فرمایا ہے، آپ نے میری زندگی کی صبح امید میں جو بہاریں بھر دیں، اس کے لئے اگر میں سرتاپا شکر گزار بن جاؤں تو بھی کم ہوں گا، آپ نے اپنی شمع محبت سے میری اندھیری زندگی میں جو روشنی اور توانائی بھر دی وہ آج تک رہی اور خدا کرے تو مرتے دم تک رہے گی، یہ وہی شمع محبت تھی، جو مشکوۃ ولایت کی توانائی سے جلتی اور سارے جہاں کو روشن اور تاباں کر دیتی ہے، اللہ تعالی آپ کی شفقت کو اپنے اس حقیر بندے کے حق میں سدا جواں رکھے۔

آپ نے اپنے گراں مایہ رسالہ ''انوار الفجر فی اوراد المظفر'' میرے پاس ارسال فرما کر ایک اور بھاری احسان فرمایا ہے، جس نے میرے دل کو ایک خاص قسم کا جلا بخشا اور روح کو منور اور تاباں کر دیا ہے، اس کے مطالعہ سے ایک درماندہ اور خستہ جاں کی اداس اور خزاں دیدہ زندگی میں بہار نو کی امیدیں آئی ہیں:

نو بہار است جنوں چاکِ گریباں مددے
آتش افتاد بجاں جنبش داماں مددے

آپ کا میں احسان مند ہوں کہ آپ نے ایک طویل عرصے کے بعد ٹلفون کے ذریعے ہی سہی مجھے یاد فرمانے کی تکلیف گوارہ فرمائی، ساتھ ہی ساتھ اپنے گراں قدر رسالہ کو زیور علم وفن سے آراستہ کرنے کا

اہل سمجھا۔تو آپ کا یہی حسن ظن اور اعتماد اس تہی دامن علم وفن اور اس راندۂ بارگاہ کے لئے سعادت کے علی الرغم ایک تائیدِ غیبی اور نوید خداوندی سے کم درجہ نہیں رکھتا۔

حضرت! آپ کی تالیف پر سر دست اتنی سی بات عرض کرنے کی جرأت رندانہ ہے کہ شک نہیں ہے کہ اس کتاب میں آپ کا مدعا اور تعلیمات کی روح سمیٹ کر آ گئی ہے، جس سے سلوک وطریقت کے نہ صرف مبتدی بلکہ اذکار واوراد، شغل ومراقبات کے حوالے سے سالکین منتہی بھی مستفید اور محظوظ ہو سکیں گے، علاوہ ازیں سلوک وطریقت کے بعض ضروری مصطلحات بھی بڑی خوبی کے ساتھ برمحل طور پر آ گئے ہیں، سچ تو یہ ہے کہ آپ نے دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے، پھر اس کی دیگر خوبیوں میں سے ایک خوبی یہی بھی ہے کہ یہ رسالہ سلوک وطریقت کے چاروں معروف مسلک ومشرب یعنی چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ (مجددیہ) والوں کے عام افادہ واستفادہ کے حوالے سے ایک چشمۂ حیواں کا درجہ رکھتا ہے، سالکین میں سے ہر مقام کے لوگ انشاء اللہ اس سے مستفید ہو سکیں گے۔

باقی آپ کے حکم کے مطابق اس کے بعض مضامین کی توضیح وتشریح اور بعض ضروری اضافے کے علاوہ اس میں پائی جانے والی بعض علمی اور فنی فروگذاشتوں کو دور کرنے کی مقدور بھر کوشش کی جا چکی ہے، الحمد للہ۔

دراصل اس راہ کے سالکین اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ اسلامی تصوف روحانی اور وجدانی احوال کے ساتھ ہی ساتھ ایک عملی اقدام سے عبارت ہے، یونانی دیومالائی فلسفہ کی طرح صرف لفظی معرکہ آرائی، عقلی موشگافی، لاطائل اور لاحاصل مباحث پر سر دھنے اور جان کھپانے کا نام نہیں ہے، یعنی عملی اقدامات کے ذریعے سالک کو روحانی مقامات طے کرنا ہے، جو ایک مرشد کامل کی رہنمائی اور اس کی روحانی توجہ سے حاصل ہوتا اور ہو سکتا ہے، تاہم اگر کسی نے تکوینی طور پر کچھ حاصل کر لیا ہو تو وہ الگ بات ہے، ورنہ عام سالکین طریقت کے لئے ایک شیخ برحق کی اتباع امر لازمی ہے، اس کلیہ سے میرے خیال میں نہ صرف نادان و ناواقف بلکہ علمائے دین بھی خارج نہیں ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ رومیؒ کے سامنے تبریزیؒ کیا معنی رکھتے تھے؟

درحقیقت بات یہ ہے کہ اسلامی تصوف (جسے قرآن کریم کے الفاظ میں تزکیہ اور حدیث نبوی صلی

اللہ علیہ وسلم کے الفاظ میں احسان کہا گیا ہے) روز اول سے سینہ بسینہ چلے آنے والے سلسلے اور ایک طرح کے مظہر کا نام ہے، جو عملی اقدامات سے حاصل ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ سالک وجودی مشرب کا ہو یا شہودی مشرب کا، اسے بقا سے فنا کی طرف، وجود سے عدم کی طرف، اور مکان سے لامکان کی طرف سفر کرتے ہوئے پھر دوبارہ بقائی اور مکانی ہونا پڑتا ہے، اسے اپنے آپ کو خنجر تسلیم ورضا کے سامنے سرنگوں ہونا پڑتا ہے:

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را+ ہر زماں از غیبِ جانِ دیگر یست

حضرت! چلتے چلتے راقم نالائق اپنے بھولے بسرے ماضی کا کچھ احوال سنا دے تو شاید آپ کے لئے باعثِ مسرت ہوگا، اور مزید دعائیں دینے کا سروسامان بھی، وہ یہ ہیں کہ میں جماعتِ ششم میں آپ کے حلقۂ درس میں شامل تھا، اس زمانے میں میں نے موضع نائن چنگ (منگڈو) والے ایک مرشد کامل حضرت شیخ جمال احمد صاحب (مرید حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانی گودام فارویؒ، ومجاز بیعت حضرت مولانا نور محمد خنڈ لی، کیوکتو یؒ) کے مبارک ہاتھ پر طریقۂ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ میں بیعت کی، جنہوں نے مجھے سلسلہ کے اذکار واوراد اور شغل ومراقبے کی تلقین کی، ویسے اللہ تعالی کی خاص عنایات اور مرشد کی توجہ سے اگلے پانچ سالوں میں لطائف عشرہ سے آگے بڑھا، اس کے بعد ایک طرف حضرت شیخ اس دنیا سے رحلت فرما گئے اور دوسری طرف میں بھی اعلی دینی تعلیم کے سلسلے میں دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، انڈیا جا پہنچا۔ مرشد برحق کے انتقال کی خبر ملی تو میں نے مرشدنا، و شیخنا ومربینا مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے مبارک ہاتھ پر ٹھیک اسی سلسلے پر بیعت کی، حضرت مولانا سے تعلق کی وجہ سے اتنا فائدہ ملا کہ جس کے بیان سے میری زبان وقلم قاصر ہیں، یہاں آپ کے سامنے اس گئی گزری کہانی کے تذکار سے میرا مدعا یہی ہے کہ اب حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی اس جہانِ فانی سے رحلت فرما چکے ہیں، اس حالت میں میں ایک کس مپرس، مسکین اور بے سہارا ہو گیا ہوں، چوں کہ تصوف اسلامی درحقیقت بارگاہِ ایزدی سے انبیاء علیہم السلام کے مقدس سینوں کے راستے خواص بندوں پر آنے والے فیوض وبرکات اور فضل وعنایات کا نام ہے، جو ہمیں ایک شیخ کامل کی توجہ اور رہنمائی سے حاصل کرنا ہے، تو ظاہر ہے کہ میں سر تا پا ایک

گنہگار وخطا کار آدمی ہوں، اب آپ سے امید ہے کہ اس حوالے سے آپ میری رہنمائی فرمانے کی تکلیف گوارہ فرمائیں گے، تاکہ میں اس حوالے سے مزید درمزید بے دست وپا نہ رہ جاؤں۔

حضرت! اگر میرے ناقص حافظے نے کوئی کوتاہی نہیں کی تو یہ تھا آپ کے پہلے والے ٹیلفونک بیان کا خلاصہ کہ:

> ''ہم نے مدرسہ کے نصابِ تعلیم میں علوم اسلامیہ کے ساتھ علوم عصریہ (سائنس اور ٹکنالوجی) کی طرف بھی توجہ دی ہے، جو وقت کا تقاضا بھی ہے اور یہاں کے حالیہ حکام کا مطالبہ بھی، اور میں نے بھی بذاتِ خود عصری علوم کا مطالعہ کیا ہے، اگر مؤخر الذکر علوم کے حامل کسی عامی سے میرا پالا پڑا تو انشاء اللہ جیت میری ہوگی، اور تم ہمارے ممکنہ جدید نصابِ تعلیم کی تشکیل اور اسے عملی جامہ پہنانے کے حوالے سے ممکن تعاون کرنا، اور میں قریبی مدت میں ایک آدمی تمہارے پاس بھیجوں گا، جس کے ہاتھ میں میرا ایک شائع شدہ رسالہ بھی ہوگا، اس کی زبانی تفصیلات سن لینا'' (مفہوم ہے)

حضرت! آپ نے مجھ جیسا درماندہ، اداس وبدحواس اور تہی دامن علم وفن پر اتنا بھروسہ کیا تو پہلی بات یہی ہے کہ میں آپ کے اس جیسے حسن ظن اور اعتماد کا سرے سے مستحق نہیں ہوں، لیکن یہ میرے لئے باعثِ سعادت ضرور ہے، اس حوالے سے میری پہلی گزارش یہ ہے کہ آپ جیسے برگزیدہ انسان کے مبارک کلمات پر کسی قسم کے تبصرہ کی گنجائش ہے اور نہ میرے لئے جائز۔ تاہم پھر بھی بات چوں کہ ملت اور فرزندان ملت کی بقاء وازدھار کے متعلق ہے، اس لئے متعلقہ تمام جزئیات سے قطع نظر صرف کلیات کے بطور چند سطور لکھ کر آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں، امید ہے کہ خطاؤں کی اصلاح فرمائیں گے:

۱۔ اس بات میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے کہ ارکان میں پائے جانے والے مدارس اسلامیہ کے حالیہ متداول نصابِ تعلیم کی فوری تطویر کی شدید ضرورت ہے، پوری تبدیلی کی نہیں، میری رائے میں دراصل یہی نصاب جو درس نظامیہ کے نام سے معروف ہے، اس میں درس کی بعض کتابیں بغیر کسی غور وفکر کے اضافہ شدہ ہیں، جسے درس نظامیہ کی بگڑی ہوئی شکل بھی کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ مجموعی طور پر اس نصاب میں قوت مطالعہ کا خیال زیادہ ہے لیکن تحصیل فن کی طرف توجہ بہت کم،

چوں کہ دور عباسی کے بعد علوم اسلامیہ میں نادانستہ بلکہ بعض ماہرین کی رائے میں پوری دانستہ طور پر یونان کے ارسطالیسی فلسفہ ومنطق کو داخل کر دیا تو پوری دنیائے اسلام میں علوم اسلامیہ کے ساتھ ساتھ فلسفۂ یونان کا چرچا ہو گیا، جس کی وجہ سے اس زمانے میں اور اب بھی اسلافِ امت کے اس عظیم کتب خانہ کے مطالعہ اور اس سے افادہ واستفادہ کے لئے منطق وفلسفۂ ارسطو کے مصطلحات کا جاننا ضروری ہو گیا ہے، اس اعتبار سے عرض ہے کہ آپ کے الفاظ میں اگلے ممکنہ نصاب تعلیم میں ایک دو بنیادی کتابوں کو رکھ کر باقی تمام منطق وفلسفہ کی کتابوں کو خارج از نصاب کر دیا جائے، چوں کہ فکری طور پر منطق وفلسفۂ یونانیہ روح اسلامی اور اس کے مزاج کا ضد ہے، بلکہ دشمن، اب چوں کہ دشمن گھر گھس چکا ہے، اور اس نے اپنے لئے ایک خاص جگہ بھی بنالی ہے، تو سردست اس سے فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، اب آپ سے گزارش ہے کہ میری ان معروضات پر خاص توجہ فرمائیں۔

۳۔ حضرت علامہ شبلی نعمانی جیسے ماہرین سے مستفید ہو کر عرض ہے کہ المنطق، تیسیر المنطق، صغری کبری، ایساغوجی، قال اقول، میزان منطق، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، حمد اللہ، شمس بازغہ، رسالہ میر زاہد، صدرا، غلام یحیی، ملا جلال، سلم العلوم، اور قاضی مبارک ہیں تو منطق! نصاب تعلیم کے دسترخوان میں یہ اور ان جیسے بن بلائے مہمانوں اور ماہرین تعلیم کے الفاظ میں ان سبزۂ خود رو کو ذہن طالب ومطلوب سے یک سر دھوڈالا جائے، تاہم پچھلی سطور میں جیسی عرض کی جا چکی ہے کہ ان میں سے ایک دو بنیادی کتابوں کا انتخاب کیا جائے، جن کے ذریعے ہمارے دماغوں یا گردنوں پر سوار مصیبت کو اتارا جا سکے، اور گلوخلاصی ممکن ہو۔

۴۔ حضرت! خود آپ بھی ملاحظہ فرمائیں، ہمارے اس نصاب میں اتنی منطق وفلسفہ کی کتابیں تو داخل ہیں، لیکن تفسیر القرآن الکریم جو اصل الاصول ہے، اس کی صرف دو کتابیں ہیں بس، اور وہ بھی بیضاوی شریف اور جلالین شریف، ماہرین تفسیر کے مطابق تفسیر بیضاوی کا یہ حال ہے کہ وہ اکثر ہمارے مدارس میں سرے سے پڑھائی نہیں جاتی، اگر کہیں پڑھائی جاتی ہے تو سورۂ بقرہ تک، جب کہ جلالین کو مجموعی طور پر تفسیر کی کتاب کہنے کے بجائے حل لغات القرآن کہنا بجا ہے، ماہرین کے مطابق اس کے اختصار کا یہ حال ہے کہ جلالین کے الفاظ قرآن سے کم یا برابر، اس لئے نصاب میں تفسیر کی کتابیں بڑھا

دینی کی اشد ضرورت ہے، اور انتخاب بھی خوب سے خوب تر ہونا لازمی امر ہے۔

۵۔ ماہرین کے مطابق درس نظامیہ کے نصاب میں منطق کی جو کتابیں داخل نصاب ہیں، ان میں منطق کے مسائل سے زیادہ فلسفہ اور امور عامہ کی شکل میں خلط مباحث ہے، جب کہ اس نصاب میں ادب عربی اور انشاء کا درجہ نہ ہونے کا برابر ہے، اس لئے سفارش یہی ہے کہ منطق کی بے کار کتابوں کو نصاب سے ہٹا کر ان کی جگہ ادبِ عربی، انشاء، بلاغت، علم اعجاز القرآن اور تاریخ کے ساتھ حساب اور جغرافیہ وغیرہ جیسے ضروری فنون کا اضافہ کر دیا جائے، اور جہاں تک لسانیات کا سوال ہے، اگر انگریزی اور برمیز کو مساوی نہ ہو تو بھی ایک درجہ ضرور دیا جائے، تاہم اس ضمن میں اس ممکنہ نصاب کی تشکیل دینے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ادب عربی سے بے اعتنائی علوم اسلامیہ سے بے اعتنائی کا عین مترادف ہے، اس لئے ادب عربی کو ممکنہ نصاب میں امتیازی درجہ دیا جائے۔

۶۔ آپ نے اپنے مذکورہ ٹیلفونک رابطے میں سائنس اور ٹکنالوجی کا تذکرہ فرمایا ہے، اس حوالے سے میری گزارش یہ ہے کہ ماہرین علوم وفنون جن میں مولانا آزاد بھی ہیں کے مطابق فلسفہ ومنطق، سائنس و ٹکنالوجی سارے کے سارے فنون ایک ہی تنور کے سوختہ ہیں، منطق وفلسفہ کا منبع یونان ہے تو سائنس و ٹکنالوجی کا مرکز یوروپ، فرق صرف اتنا ہے کہ یونان کا وہ مایۂ ناز فلسفہ ومنطق فرسودہ و بے کار ہے، جب کہ ان کے مقابلے میں سائنس وٹکنالوجی ایک حد تک کارآمد، ماہرین کے مطابق دنیا کو بہر کیف یوروپ کے ان محسنین کا احسان اٹھانا چاہئے، جنہوں نے منطق وفلسفۂ یونانیہ کو چھوڑ کر علوم کشفیاتی، تجربی اور استقرائی کا دروازہ کھولا، ان معروضات سے میرے مدعا یہی ہے کہ بنیادی طور پر ان مذکورہ یونانی ویوروپی تمام فنون کی روح ایک ہے، تاہم مادی اور طبیعی اعتبار سے بہر حال یونانیوں کے بجائے یوروپ والوں کی استقرائی علوم کارآمد۔ اس لئے ہمارے ممکنہ نصاب میں طبیعیات کی ریڈرز داخل کی جائیں، مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ یونان کے بے کار اور فرسودہ نظریات کے پرستار ہونے کے مقابلے میں یوروپ کی تجربی اور استقرائی عالموں کا حلقہ بگوش ہونا مفید اور افضل ہے، اور عصر حاضر کے اعتبار سے بلاشبہ ضروری بھی۔

۷۔ حضرت! آپ کے بیان کے مطابق نصاب کے حوالے سے حالیہ حکام کی چاہت ومطالبہ کا

جہاں تک سوال ہے، عرض ہے کہ میں ان لوگوں کے مزاج سے بخوبی واقف ہوں، مجھے ان پرستاران خدایانِ مادیت سے کچھ امید ہے اور نہ ان پر کوئی بھروسہ، ان حکام سے آپ کا مطلب غیر مسلم ہے تو ظاہر ہے کہ ان پر بھروسہ کرنا ہی عبث ہے، اگر مسلمان ہے تو گزارش ہے کہ میرے ناقص خیال میں ان نام نہاد مسلم حکام جو علم وفن سے نا آشنا ہوں تو ظاہر ہے کہ علم وفن کے حوالے سے ان سے کسی قسم کی بھلائی اور قوم وملت کے حوالے سے دردمندی کی توقع بے کار ہے، آپ بخوبی واقف ہیں کہ علم و فن کے اس معرکے میں ان لوگوں کا کیا عمل دخل ہے؟ وہ لوگ علوم اسلامیہ سے واقف ہیں نہ علوم عصریہ سے باخبر، سراسر نادان اور مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے الفاظ میں حشب مسندہ ہیں، ان کی رائے اور مطالبہ سے علمائے اسلام کو کیا لینا دینا؟ علماء اپنی توقع ان سے وابستہ رکھیں تو یہ ان کی بے مائیگی اور کم ظرفی ہوگی۔

میری سمجھ کی حد تک وہاں پائے جانے والے نام نہاد دانشوروں کا جہاں تک تعلق ہے، یہ لوگ مغربی ہیں نہ مشرقی، نہ مغرب کے صحیح معنی میں پرستار بن سکے اور نہ مشرقی علوم کے حقیقی معنی میں عقیدت مند، میری نظر میں یہ لوگ نہ رند ہیں نہ پارسا، آپ نے شاعر مشرق علامہ اقبال کا تذکرہ فرمایا تھا، شاعر مشرق اور ان جیسے دانشوران تو مشرقی تھے، مگر تیور مغرب سے بخوبی واقف، بلکہ نا قد، ہمارے یہاں والے تو نہ رندان مغرب کے تیور سے واقف ہیں اور نہ زاہدان مشرق کے شیوہائے پارسائی سے باخبر، میری نظر میں یہ لوگ سراسر نا سمت شناس مسافر اور ناعاقبت اندیش ہیں، ویسے ان لوگوں پر اعتماد علمائے اسلام کے لئے علمی وفکری خودکشی کا مترادف ہوگا، تاہم میرے اس کلیہ سے دو ایک حضرات خارج ہوں تو میں سردست ان سے واقف نہیں ہوں۔

لیکن میری ذاتی رائے میں اس وقت ان دونوں طبقوں سے کلی طور پر فرار اور علیحدگی کی گنجائش ہے نہ ضرورت، اب علمائے کرام میں سے وہ حضرات جو علوم عصریہ ومادیہ کے مادی مزاج اور علوم اسلامیہ کے روحانی مزاج کے عناصر ترکیبی اور ان دونوں قسم کے علوم وفنون کی حدود اربعہ سے پورے واقف ہوں، ان کے لئے امر لازمی ہے کہ ان دونوں مذکورہ طبقوں سے کلی طور پر علیحدگی کے بجائے ان کے ممکنہ مادی تعاون سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمات انجام دیں۔

حضرت! مجھے معلوم ہے کہ وہاں کی زمین ان گزارشات کے حوالے سے بڑی پرخار اور سنگلاخ ہو چکی ہے، پھر بھی ایک راہ نکالنی ضرور ہے، راستہ بنا کر چلنا ہے مگر قدم سنبھال کے، ورنہ چل تو کسی طرح سکیں گے، لیکن پاؤں میں چھالے پڑ جائیں گے، دراصل میری معروضات کا حاصل یہی ہے کہ جس حوالے سے ہم بات کر رہے ہیں، یہاں نہ ان نادان حکمرانوں کا کوئی کام ہے اور نہ ان نام نہاد دانشوروں کا، علمی اور فکری اعتبار سے جامد علماء بھی اس کلیہ سے خارج نہیں ہیں۔ یہاں کام ہے صرف اور صرف عالم جسم توانا، چشم بینا، صاحبانِ علم ویقین اور ایمان وفراست کا، ان سے کام لینا ہوگا مگر جوش و جذبات سے دور، بس ہوش سنبھا کے۔

۸۔ حضرت! آپ کا بھیجا ہوا آدمی سے ملا، حکم کے مطابق اس کی زبانی آپ کے حالات تفصیل سے سنے، جہاں تک اندازہ کر سکا کہ آپ آج کل بڑے اداس، سہمے ہوئے اور بے حد صدمہ رسیدہ ہیں، کیوں نہ ہوں؟ کہ یکے بعد دیگرے دو دو اہلیہ کے انتقال کے حادثے، جن کا تذکرہ آپ نے مذکورہ ٹیلفونک رابطہ میں بھی کیا تھا، مجھے ذاتی طور پر ان حوادث کا شدید رنج اور بے حد افسوس ہے، جہاں تک آپ کی پہلی والی اہلیہ مرحومہ کا تعلق ہے، میری زندگی میں ان سے بڑی شفقت اور ماں کا ممتا ملا تھا، مجھ پر ان مرحومہ کا جو احسانات ہیں وہ کبھی بھی بھولے سے بھلائے نہیں جاسکتے، آج مجھ گنہگار سے کیا بن سکتا، سوائے دعائے مغفرت کے، اللہ تعالی دونوں کی مغفرت فرمائے، اور اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا کرے، اور آپ سمیت آپ کی تمام اولاد ومتعلقین کو صبر وثبات کی دولت سے نوازے، آمین۔

۹۔ حضرت! آپ کے بیان سے جہاں تک معلوم ہو ہے کہ آپ اپنے مدرسہ والوں کی حرکات وسکنات پر مطمئن نہیں ہیں، اس بارے میں آپ کے حالات حد سے زیادہ پریشان کن نہ ہو تو قابل اطمینان بھی نہیں ہیں، منگڈو کے متعلقین کی طرف سے وہاں ایک خانقاہ کی تعمیر کی جو پیش کش ہوئی ہے، میرے نزدیک قدرے اطمینان بخش ہے، یوں بھی اللہ والوں کے لئے خانقاہی زندگی بڑی پرسکون ہوا کرتی ہے، ادھر آپ کی زندگی کی شام ہونے آرہی ہے، مدرسے کی ذمے داریوں کے ساتھ درس وتدریس نہ سوجھی تو آپ کے لئے کیا ہی اچھا ہوگا کہ خانقاہ میں بیٹھ کر رشد وہدایت کی خدمات انجام دیں، ویسے آپ خود بھی عبادت الٰہی میں یک سو ہو سکیں گے، اور عوام کے لئے بھی آپ کی یہی یک سوئی تلقین وارشاد کے حوالے سے مفید اور

سزاوار ہوگی۔

۱۰۔ حضرت! میں اپنے بعض ناقابل بیان مشکل حالات کی وجہ سے آپ کے حکم کے مطابق جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے خیر خواہوں سے گفتگو نہیں کر سکا، اگر حالات قابل اطمینان ہو جائیں گے تو انشاء اللہ تعمیل حکم میں دیر نہیں ہوگی۔

آخر میں آپ کی دلی توجہ کی درخواست ہے، امید نہیں بلکہ یقین بھی ہے کہ ماضی کی طرح اس کفش بردار کو اپنی خصوصی دعاؤں میں یاد فرمائیں گے، میرے والدین اور میرے بچوں کے حق میں خاص دعا کا متمنی ہوں، معروضات میں کہیں گستاخی ہوگئی تو عفو ودرگزر کی درخوست ہے۔ والسلام علیکم۔

کفش بردار:

محمد طاہر جمال ندوی

جدہ، سعودی عرب

۱۱/جنوری/۲۰۰۹ء

اس کے بعد میرا اور ایک مراسلہ، جسے میں موخر الذکر مراسلہ کے تقریبا دو سالوں کے بعد ارسال کیا تھا، اس پر بھی نظر ڈالنے کی زحمت گوارہ کریں:

گرامی قدر محترم استاد مکرم حضرت مولانا ابوسعید صاحب دامت برکاتہم (مجاز بیعت حضرت مولانا شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی قدس سرہ)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، امابعد،،،،

امید ہے کہ مزاج گرامی عافیت سے ہوں گے۔

عرض ہے کہ آج تک دو سالوں سے زیادہ مدت گزر چکی ہے کہ آپ کے نام خاکسار نے اس کی زندگی کا دوسرا عریضہ ارسال کیا تھا، نہ جانے دستیاب ہوا ہے کہ نہیں ؟ تاہم پہلے والے عریضہ کے متعلق اتنا سا اشارہ ضرور ملا کہ دستیاب ہوا ہے، لیکن دوسرے والے کی دستیابی اور عدم دستیابی کے متعلق کسی بھی قسم کے عندیہ نہ ملنے پر محسوس ہو رہا ہے کہ شاید دستیاب نہیں ہو سکا، چوں کہ دوسرا عریضہ خاکسار کے ناقص خیال

میں بڑی اہمیت کا حامل ہے،اسی لئے زیر تحریر عریضہ کے ساتھ دوبارہ بھیج رہا ہوں۔

حضرت! میں اگر چہ سراپا خطا کار ہوں، اور بعض کرم فرماؤں کے نزدیک نا آشنائے ادب بھی، پھر بھی اتنا ضرور رہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں آپ اور آپ جیسی دیگر برگزیدہ ہستیوں کی کفش برداری ضرور کی ہے،تو بزرگوں کی کفش برداری کرنے والا ایک آدمی راہ ورسم ادب سے نا آشنا ہوسکتا بھی تو کتنا؟ اور تو اور آپ کی مبارک ذات وشخصیت خود بھی گواہ ہے کہ میں نے اپنے عنفوان شباب میں آپ کی کفش برداری کی ہے۔لیکن ادھر حال یہ ہے کہ بعض حضرات خاکسار پر آئے دن یہ الزام لگاتے نہیں تھکتے ہیں کہ میں کوچۂ ادب تک سے نا آشنا ہوں۔اب یہ سارا ماجرا سنانے سے میرا مدعا یہی ہے کہ ایک طرف اگر کبھی کسی لاشعوری میں مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی تو آپ مجھے معاف فرمائیں گے،اور میرے حق میں دعا دیں گے کہ میں راہ ورسم ادب سے مزید آشنا ہوسکوں۔والسلام علیکم۔

کفش بردار:

محمد طاہر جمال ندوی

۱۰ر ستمبر ر۲۰۱۱ء۔جدہ سعودی عرب۔

حضرت مولانا ابوسعید صاحب پر لوگ جو بھی رائے رکھیں، بجا طور پر رائے رکھنے کے حق دار ہیں ،لیکن میری رائے میں آپ ایک وسیع النظر، اور عمیق الفکر عالم دین تھے،علمی اور فکری نقطۂ نظر سے ارکان جیسی حالیہ اندھیر نگری میں میرے اندازے کے مطابق آپ کے ذہن رسا کو ایک قسم کی علمی و فکری بصارت اور ایک حد تک معلمانہ وحکیمانہ بصیرت عطا ہوئی تھی، جو بلاشبہ فیاض ازل کی ایک کرشمہ سازی تھی، ظاہر ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے،عطا کرتا ہے، **ذالک فضل اللہ یو تیہ من یشاء**۔

اس بات میں کیا شک ہے کہ اللہ تعالی اپنے مخلص ،عبادت گزار اور پارسا بندوں کے مقامات و مراتب بلند کرتا ہے۔ وہ بندے جن کے لیل ونہار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور دین حق کی تبلیغ واشاعت میں گزرتے ہوں، اللہ تعالی کی رحمت وسکینت ہمیشہ ان کے

شامل حال رہتی ہے، ان کے دل نیتِ خلوص کی آماج گاہ اور ان کے قلوب حسنات کے مراکز قرار پاتے ہیں۔ان کے اذہان صالحیت کے منبع کی شکل اختیار کر لیتے اور ان کی سوچ وبچار کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔اللہ تعالی کی یاد ان کی زندگی کے معمولات بن جاتی ہے اور ذکر الٰہی ان کے دلوں کی خوراک اور وظیفۂ حیات ہو جاتا ہے۔ایسے بندے اللہ تعالی سے جو بھی مانگتے ہیں، انہیں وہ اپنے فضل وکرم کے بھرپور خزانوں سے عطا کر دیتا ہے۔ویسے حضرت مولانا ابوسعید صاحب کے حالات وکوائف سے مترشح ہوتا ہے کہ آپ کے رجحانات وافکار خالصتا اطاعتِ خداوندی کے تابع تھے، آپ پر اللہ تعالی کے خاص احسانات اور عنایات کی بارشیں ہوئی تھیں، اس لئے آپ کا شمار میرے خیال میں ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے، جن کا تذکرہ قرآن کریم نے ''**مخلصین له الدين**'' اور ''**الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیهم ولا هم یحزنون**'' فرما کر بلند وبرتر کر دیا ہے۔

دور آخر میں ہماری بعض تاریخی شخصیات پر قلم اٹھاتے وقت محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کے حالات و جذبات دراصل شکست وریخت، مایوسی وپسپائی، ناکامی ونامرادی سے عبارت ہے، مزید برآں پس ماندگی اور غربت وافلاس نے ان کی زندگی اور حوصلے کو توڑ کر رکھ دیا ہے، لیکن ایسے حالات میں بھی بعض مخلصین ایسے بھی نظر آتے ہیں کہ جن کی زندگیاں شکست وریخت، مایوسی اور نامرادی سے تقریبا نا آشنا ہوتی ہیں، جنہیں دیکھ کر ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آخر وہ کون سی طاقت وتوانائی ہوتی ہے جو ان کے دل ودماغ کو ہمیشہ تازگی، بالیدگی، قرار وطمانیت بخشتی ہو؟ جواب کی تلاش سے ہم اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ دراصل وہ تھی ان کا ایمان واتقان، اور علم وعرفان کی قوت وشوکت، جو ہمیشہ ان کے دل ودماغ کو اگرچہ جانکنی اور دل شکنی کے عالم میں کیوں نہ ہوں، حوصلہ دیتی اور ناامیدی کے عالم میں امید وامنگ کا قرار بخشتی ہے۔ویسے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولانا ابوسعید صاحب بھی ان برگزیدہ ہستیوں میں سے ایک تھے، جنہوں نے بڑے سے بڑے کرب ناک حالات میں بھی اپنے عزم وحوصلہ نہ صرف بلند رکھا بلکہ شکست وریخت سے دوچار عوام کو بھی اپنے انداز میں روشنی کا مینار دکھایا ہے، سرزمین ارکان اور وہاں کے مسلمانوں پر آپ کی زندگی میں بڑی بڑی پریشانیاں آئیں، مصیبتیں نازل ہوئیں، لیکن آپ نے اپنی بلند حوصلگی سے کام لیتے ہوئے وطن عزیز اور اپنی قوم کو سینے سے لگا رکھا تھا، آپ کے بہت

سارے اہم دوستوں اور احباب نے ترک وطن کر کے ڈھیر سارے ملکوں میں پناہ لی، مگر آپ نے اپنے وطن اور اپنی قوم کو کبھی بھی چھوڑنا پسند نہیں کیا، ویسے حالات کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں، ہر حالت میں آپ نے اپنی قوم کی رہنمائی کی، اور آپ کی رہنمائی اور رہبری کو خاصے لوگوں نے غنیمت بھی جانا تھا۔

مولانا ہماری دینی اور روحانی محفلوں کے لئے اپنے زمانے میں گو ہر شبِ چراغ تھے، آپ کی دینی اور روحانی سرگرمیوں سے ہمارے مسلم ماحول میں نکھار و وقار میسر ہوا تھا، آپ نہایت خوش اخلاق اور خوش مزاج، رعونت سے محفوظ، خشونت و یبوست سے کوسوں دور، عقیدۂ اسلامیہ پر مضبوط، اپنے نظریات میں پختہ اور غایتِ درجہ کے متواضع بزرگ تھے، آپ اپنے بزرگوں کے لئے مجسم ادب اور اپنے عزیزوں کے لئے سراپا شفقت تھے، آپ کو اپنے علاقے میں جو مقبولیت حاصل ہوئی تھی، اس کی اصل وجہ آپ ایک بلند پایہ کے عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے خلوص وللّٰہیت، حب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے جذبۂ صادقہ، اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں غایت درجہ کا انہماک واستغراق، بندگانِ خدا کے ساتھ تواضع وانکسار، اور جذبۂ دعوت وہدایت تھی۔

تبلیغ دین کے فرائض کی ادائیگی کے بطور آپ دینی جلسوں اور مذہبی اجتماعات میں ذوق وشوق سے شرکت کرتے تھے، پند ونصیحت کے ذریعے تبلیغ دین کے فرائض کی انجام دہی میں آپ کو خاصے باریک بین دیکھا گیا تھا، یوں بھی دیہاتی لوگ ایسی مجلسوں میں بڑے خلوص کے ساتھ شریک ہوتے، اور ان میں ہونے والے خطابات سے اپنی اپنی زندگیاں سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں، ویسے آپ نے جہاں کہیں بھی خطاب کیا، آپ کے خطابات سے لوگوں کو متأثر ہوتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

مولانا اخلاص میں ڈوبے تقریر کرتے تھے، وہی بات آپ کی زبان مبارک پر آتی جو حقیقت و صداقت کی میزان میں پوری طرح اترتی ہو، بعض مقررین کی طرح بےضرورت باتوں اور من گھرٹ قصے کہانیوں سے آپ کی زبان تقریبا نا آشنا تھی، آپ کا طریقۂ پند ونصیحت نہایت مؤثر تھا، میٹھی اور پیاری زبان، لہجے نرم اور دل پذیر ہوتے تھے، غرض جو بھی آپ کی تقریر سنتا وہ آپ پر گرویدہ ہو جاتا تھا، تقریر بڑی رواں اور شگفتہ ہوتی تھی، سامعین کبھی کبھار آپ کے بیان کی رو میں بہہ جاتے تھے، دوران تقریر آپ کے منفرد دعوتی اسلوب، سوز دروں کی کرشمہ سازیاں، جگہ جگہ مناسب مواقع پر

عربی، فارسی اور اردو کے روحانی ابیات نے سننے والوں کو اسیر بنالیتا تھا، میرے خیال میں آپ کا انداز خطاب آپ کے مرشدِ اول حضرت مولانا محمد ادریس صاحب نور اللہ مرقدہ (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا عبدالوہاب صاحب مہتمم مدرسہ ہاٹھزاریؒ) سے ملتا جلتا تھا، جس میں ناصحانہ چھاپ نمایاں ہوتا تھا، اور جس میں زبان کی شیرینی، آواز کی خوش نمائی اور طلاقتِ لسانی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔

مولانا ابوسعید صاحب حضرت مولانا الحاج شاہ مظفر احمد صاحب منگیزوی نور اللہ مرقدہ (خلیفہ ومجاز بیعت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ) کے مجاز بیعت تھے، سننے میں آیا کہ آپ کے حلقۂ ارادت میں خاصی وسعت آچکی تھی، اپنے علاقے کے علاوہ منگڈو شہر اور اس کی اطراف میں آپ کی بڑی تعداد میں متعلقین ومریدان پائے جاتے ہیں، محکوم ارکان میں آپ نے اپنی، دعوتی، تبلیغی، تعلیمی اور روحانی سرگرمیوں کے ذریعے جو چراغ روشن کیا، شاید اس کی تابانی اور ضیاپاشی آج بھی ہمارے دینی اور روحانی ایوان میں محسوس کی جاتی ہوگی۔

جہاں تک میں نے دیکھا اور بعد میں لوگوں کی زبانیں سنیں، ان سے اندازہ ہوا کہ آپ کے دن کی جلوتیں درس وتدریس میں بسر ہوئیں، اور شبانہ خلوتیں اپنے خالق ومعبود، مالک ومسجود کے ساتھ راز ونیاز کی عبادت گزاریوں، اوراد واذکار میں صرف ہوئی تھیں، آپ ذوق عبادت سے بہرہ ور بزرگ تھے، جہاں تک آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، کہ قیام اللیل کے حوالے سے آپ کو بہت بلند مرتبہ کا انسان پایا، یہاں تک دیکھا گیا کہ رات گئے آپ پند ونصیحت کی محفل سے گھر آئے، اگرچہ بہت تھکے ہوئے تھے، لیکن آپ اپنے معمول کی نیم شبی اور نالۂ سحرگاہی میں بقیہ رات گزار دیتے تھے۔

جہاں تک میں نے دیکھا کہ آپ نہایت صاف وستھرے لباس زیب تن کرتے تھے، غذا ہلکی کھایا کرتے تھے، کسی خاص غذا سے شاید رغبت تھی، مگر اکثر دیکھا گیا کہ جو میسر آیا آپ نے اسے بصد شکریہ تناول فرمالیا۔

مولانا لوگوں کی دل جوئی میں یکتائے روزگار تھے، ایسی بات زبان پر کبھی نہیں لاتے، جس سے کسی کا دل دکھنے کا اندیشہ ہو، کوئی بھی آپ سے مشورہ لینے آتا، تو آپ اپنی دانست کا صائب مشورہ دیتے تھے، دنیاوی لحاظ سے اگر کسی کم زور کا مقابلہ کسی طاقت ور سے ہوجاتا تو آپ حق بجانب ہو کے کم زور کی مدد کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کرتے تھے، اور کوشاں رہتے کہ کم زور کو اس کا حق مل جائے،

غرض حتی الامکان کسی انسان کی حق تلفی ہونے نہیں دیتے تھے۔

بہر حال اللہ تعالی نے اپنے اس مخلص بندے سے دین کی بڑی خدمت لی، آخری مرض کے علاج وتشخیص کے لئے بنگلا دیش آئے، اور بالآخر ۲۰۱۸ء میں ٹیکناف میں آپ کا انتقال ہوگیا، اوریہیں دفن ہوئے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولوی حافظ محمد میاں صاحب علی چنگیؒ، بوسیدنگی:

علاقۂ علی چنگ، بوسیدنگ کے نامور فرزند ارجمند حضرت مولانا حافظ محمد میاں صاحب کی پیدائش ۱۹۳۸ء میں ہوئی، آپ کے والد گرامی علم دین اور علماء سے محبت کرنے والے ایک نیک آدمی تھے، اور والدہ بھی نہایت پاکیزہ صفت مومنہ خاتون تھی۔

محترم مولانا حافظ محمد میاں صاحب نے مکتب نشینی کے بعد اپنی باضابطہ دینی تعلیم کا آغاز اپنی آبائی بستی علی چنگ (۱) کے شمال میں واقع بستی کجافہ (بیولا فارا) سے کیا، یوں تو ارکان کی دیگر تمام مسلم بستیوں کی طرح اس علاقہ کی بستیوں میں بھی ابتدائی دینی مدسوں (جن کو مکتب کہا جاتا ہے) کی کوئی کمی نہیں تھی، معا اس زمانے میں کجافہ نامی بستی میں ایک ابتدائی دینی مدرسہ بھی تھا، جہاں حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب باغگونوی (سابق شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ) کے علاوہ حضرت مولانا فیض الرحمن صاحب باغگونوی بھی تعلیم دیا کرتے تھے، اس مدرسہ میں حافظ صاحب نے داخلہ لیا، اور ان دونوں بزرگوں کے یہاں جماعت ہشتم تک کی تعلیم پائی، چوں کہ آپ کے یہ دونوں اساتذہ جن کا شمار وقت کے جلیل القدر علماء میں تھا، اور دونوں نہایت محنتی اور تدریس کے حوالے سے کہنہ مشق بھی تھے، اس لئے حافظ صاحب کی ابتدائی اور بنیادی تعلیم کسی قدر مضبوط ہوگئی تھی۔

یہاں چلتے چلتے یہ بھی عرض کردوں کہ کجافہ والا یہ مدرسہ بعض وجوہات سے بند ہوگیا تھا، مولانا فیض الرحمن صاحب غالبا مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ چلے گئے، اور مولانا محمد ہاشم صاحب جامعہ اسلامیہ عالیہ کے ہوچکے تھے، مگر قدرت کا فیصلہ دیکھئے کہ مرور زمانے کے بعد اس مدرسہ کی دوبارہ تاسیس خود اس مدرسہ کے ایک ساختہ پرداختہ

---

(۱) بوسیدنگ شہر سے جنوب میں متصل علی چنگ نامی اس قصبہ نما علاقے میں چند بستیاں صدیوں سے آباد ہیں، جن میں باغگونہ، کجافہ، مرونگنا، لمبابیل، منی بیل اور ازولی فارہ وغیرہ نامی بستیاں قابل ذکر ہیں، اور ان میں ایک بستی کا نام علی چنگ بھی ہے، مگر صدیوں سے ان تمام بستیوں کے مجموعہ کو علی چنگ کے نام سے یاد کیا جاتا رہا ہے، یہ علاقہ اپنے اپنے زمانے کے جلیل القدر علما وصلحاء، دعاۃ ومرشدین، قومی وملی رہنماؤں، مجاہدوں اور غازیوں کی آماجگاہ رہا ہے، اور علی چنگ کی وجہ تسمیہ، جغرافیائی حقائق اور تاریخی حالات کے متعلق کہانی بڑی طولانی ہے، جو راقم کی بعض تحریوں کا حصہ بھی ہے، سردست یہاں تفصیلات کی گنجائش نہیں ہے۔

حافظ محمد میاں صاحب کے ہاتھوں سے ہوئی، حافظ صاحب کے ہاتھوں اس مدرسہ کی کافی ترقی ہوئی تھی، شاید اللہ تعالی کی توفیق کے ساتھ ساتھ یہ اس مدرسہ کے بانیوں کے اخلاص وللّٰہیت کا نتیجہ بھی ہو۔

بہر حال حافظ صاحب کجافہ والی اس درس گاہ سے جماعت ہشتم تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد شمالی بوسیدنگ کی معروف بستی فندو پرانگ کے ''مدرسہ دارالعلوم فندو پرانگ'' میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے ایک سال تعلیم پائی، اور مولانا ابوالقاسم بادھناوی اور مولانا قاری نجات علی وغیرہ نامور اساتذہ سے خوب خوب استفادہ کیا۔

اس کے اگلے سال آپ نے جنوبی بوسیدنگ کی نامور دینی درس گاہ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے مسلسل چار سال تعلیم حاصل کی، جن میں سے پہلے تین سال درسیات کی کتب پڑھتے رہے اور ایک سال شعبۂ تحفیظ میں، تو ظاہر ہے کہ آپ مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ میں جماعت ششم سے لے کر جماعت چہارم تک تعلیم پائے اور ایک سال شعبۂ تحفیظ میں بھی پڑھے، جہاں آپ نے درج ذیل اساتذہ کرام سے استفادہ کیا:

(۱) حضرت مولانا محمد صاحبؒ۔ بانی مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ۔
(۲) حضرت مولانا عبدالمجید صاحب گودام فارویؒ۔
(۳) حضرت مولانا محمد سکندر صاحب سندی فرانگیؒ۔
(۴) حضرت مولانا خلیل الرحمن صاحب فوخونگیؒ۔
(۵) حضرت مولانا حافظ حامد حسین صاحب گودام فارویؒ آل نیبو (صدر برما مسلم آرگنائزیشن)
(۶) حضرت مولانا حافظ عبدالحفیظ صاحب فوئما لویؒ۔

حافظ صاحب اس کے بعد مدرسہ محی العلوم یونگ چنگ گئے، جہاں آپ دو سال شعبۂ تحفیظ القرآن میں پڑھے اور اس کے بعد دو سال یعنی جماعت سوم و دوم کی کتابیں پڑھیں، یہاں آپ کے نامور اساتذے یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا محمد صالح صاحب یونگ چنگیؒ۔
(۲) حضرت مولانا عبداللہ صاحب (نائب مفتی دارالعلوم کراچی)۔

(۳) حضرت مولانا عبدالحی صاحب فوئما لویؒ۔

حافظ صاحب اس کے مابعد اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلا دیش) گئے اور شمالی چاٹگام کی نامور درس گاہ مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے دو سال تعلیم حاصل کی اور جماعت اولی اور دورۂ حدیث نبوی کی جملہ متداول کتابیں پڑھ کر ۱۹۶۲ء سند فراغت حاصل کی۔ مدرسۂ ہاٹھزاری میں آپ اپنی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''میں نے اعلی دینی تعلیم کے حصول کے لئے مشرقی پاکستان کا رخ کیا، اور سیدھے جا کر دارالعلوم معین الاسلام ہاٹھزاری میں داخلہ لیا، یہاں میں نے جماعت اولی اور دورۂ حدیث کی تمام متداول کتابیں وقت کے بڑے بڑے اساتذہ کرام سے پڑھیں، اس کے علاوہ خارجی اوقات اور چھٹیوں کے مواقع میں دارالعلوم کے بعض نامور اساتذہ سے بعض ضروری کتابیں بھی پڑھیں''۔

یہاں مولانا کے اساتذے یہ تھے:

(۱) حضرت مولانا مفتی فیض اللہ صاحبؒ (جن سے آپ نے ابن ماجہ شریف پڑھی)
(۲) حضرت مولانا عبدالقیوم صاحبؒ (ان سے آپ نے بخاری شریف پڑھی)
(۳) حضرت مولانا حامد صاحبؒ (سابق مہتمم مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری)
(۴) حضرت مولانا احمد شفیع صاحب دامت برکاتہم، حالیہ مہتمم (ان سے آپ نے مشکوۃ پڑھی)
(۵) حضرت مولانا مفتی احمد الحق صاحبؒ (مفتی مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری)
(۶) حضرت مولانا عبدالعزیز صاحبؒ (سابق شیخ الحدیث مدرسہ معین الاسلام ہاٹھزاری)

فراغت کے بعد آپ کومیلہ گئے، جہاں آپ نے ایک دینی درس گاہ جو اس وقت تجوید القرآن کے حوالے سے بہت مشہور تھا میں داخلہ لیا، جہاں آپ نے ایک سال شعبۂ تجوید میں تعلیم پائی، اس کے بعد وطن واپس آ گئے۔ آپ نے اپنی پیدائش سے لے کر فراغت تک کے متعلق راقم کے نام اپنے ایک رسالہ میں بیان کیا ہے کہ:

''گرامیٔ محترم مولانا محمد طاہر جمال ندوی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے، میں آپ کا بہت ہی ممنوں ہوں کہ آپ نے مجھ جیسے ناچیز کی سوانح عمری ترتیب دینے کی زحمت اپنے سر اٹھا رکھی ہے، یوں تو میں ایک خاکسار آدمی ہوں، اور اس قابل بھی نہیں ہوں کہ میری سوانح عمری مرتب کی جائے، تاہم یہ ظاہر ہے کہ تاریخ مدرسہ معارف العلوم علی چنگ کے ذیل میں بانی مدرسہ کی حیثیت سے میرا تذکرہ ضرور آسکتا ہے، ویسے اللہ کرے تو اس درس گاہ کی بدولت میرا نام بھی زندہ وجاوید ہو جائے گا، ورنہ میں کہاں اور میری سوانح عمری کہاں؟

علاوہ ازیں یہ سن کر بھی بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے سرزمین ارکان کے ناموروں پر مشتمل سوانح عمریاں لکھنے کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہمارے اسلاف اور بزرگان دین اس لائق ضرور ہیں کہ ان کی سوانح عمریاں لکھی جائیں، اور منظر عام میں لائی جائیں، یہ کام ہم پر ایک قرض تھا، جسے آپ چکانے کی کوشش کر رہے ہیں، اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ آپ کو پل پل میں مدد دیں اور آپ کی تمام جدو جہد اور کوششوں کو شرف قبولیت سے نوزیں، آمین۔

میری پیدائش ۱۹۳۸ء میں علی چنگ میں ہوئی، مکتب نشینی کے بعد باضابطہ تعلیم کا آغاز کجافہ کے ابتدائی مدرسہ سے کیا، یہاں میں نے حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب بانگونویؒ اور حضرت مولانا فیض الرحمن بانگونویؒ سے جماعت ہشتم تک کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم فندو پرانگ میں داخلہ لیا، جہاں ایک سال پڑھ کر مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ چلا گیا، یہاں مسلسل چار سال تعلیم حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ محی العلوم یونگ چنگ گیا، جہاں دوسال مسلسل تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری میں جا داخلہ لیا، جہاں سے جماعت اولی اور دورۂ حدیث پڑھ کر کومیلہ گیا اور وہاں کے ایک مدرسہ سے تجوید پڑھ کر وطن واپس آیا تھا، والسلام''۔

وطن واپس آتے ہی آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کر دیا، آپ کی وطن واپسی کی خبر سن کر مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ کے ارباب بست وکشاد نے آپ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور مدرسہ میں مدرس مقرر کر لیا تھا، جہاں آپ نے ایک سال خدمت کی، شعبۂ تحفیظ القرآن کے ساتھ ساتھ مدرسہ کی بعض کتابوں کا درس بھی آپ کا ذمہ تھا۔ اس کے اگلے سال دارالعلوم سینڈنگ چلے گئے جہاں آپ نے مسلسل سات سال تعلیم دی، اس کے بعد آپ عازم سفر حجاز ہو کر حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ سے سرفراز ہوئے، ارض مقدسہ میں آپ نے چند سال گزارے، اور ۱۹۷۸ء میں وطن واپس لوٹے، پھر ۱۹۷۹ء میں مدرسہ معارف العلوم کی تاسیس کی، جس میں بحیثیت مہتمم ومنتظم اٹھائیس سال متواتر خدمات انجام دیں، یہ اور ان جیسی تفاصیل پر مشتمل مولانا نے ایک تفصیلی بیان راقم الحروف کے نام ارسال کیا ہے، جس میں سے بعض ضروری چیزیں یہ ہیں:

> ''فراغت کے بعد میں وطن واپس آیا، اور مدرسہ معین الاسلام تمنگ چنگ میں مدرس مقرر ہوا، یہاں میرے ذمے شعبۂ تحفیظ القرن کے ساتھ ساتھ مدرسہ کی بعض کتابیں بھی تھیں، یہاں ایک سال پڑھانے کے بعد دارالعلوم سینڈنگ چلا گیا، جہاں میں نے سات سال تک مختلف درجات کی کتابیں پڑھائیں، اس کے بعد ارض مقدسہ گیا اور حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ منورہ کے بعد وطن واپس آیا، اور ۱۹۷۹ء میں مدرسہ معارف العلوم کجافہ کی تاسیس کی، جہاں میں نے بحیثیت مہتمم ومنتظم اٹھائیس سال خدمات انجام دیں، پھر عمر کے تقاضے کے پیش نظر ۲۰۰۷ء میں دوسرے لوگوں پر ذمے داری سونپ کر اپنے گھر میں عمر کے بقیہ حصے گزار رہے ہیں۔ آج کل تو اس مدرسہ پر ارکان کے دیگر مدارس کی طرح تالا لگا ہوا ہے، اللہ تعالی اس دینی درس گاہ کو دوبارہ جاری کرنے کا سامان پیدا کر دیں اور اسے زندہ وجاوید بنا دیں، آمین''۔

مدرسہ معارف العلوم علی چنگ حضرت مولانا محمد میاں صاحب کی انتھک کوشش اور پیہم جدو جہد کا ایک گراں قدر نتیجہ وثمرہ ہے، اور اس سلسلے میں یہ بھی پتہ چلا کہ جب سے یہاں کا وہ چھوٹا سا مدرسہ جس میں آپ کی ابتدائی تعلیم ہوئی تھی، بند ہوا تھا، تب سے آپ کے دل میں اس مدرسہ کی دوبارہ تاسیس کا

شوق دامن گیر ہوا تھا،مگر حالات نے آپ اور آپ کے دیرینہ شوق اور امنگوں کے درمیان سنگ گراں حائل کردیا تھا،تاہم آپ نے اس سلسلہ میں اپنی کوشش جاری رکھی،لوگوں کو اس کی طرف متواتر توجہ دلاتے رہے،بالآخر حجاز مقدس کے دوران سفر آپ کی امنگ اور تمنا اس صورت میں پوری ہوئی، کہ آپ نے ارض مقدسہ میں پائے جانے والے اپنے علاقے کے بعض علماء اور اصحاب خیر کے بھرپور تعاون، امداد اور حوصلہ افزائی اور اللہ تعالی کی غیبی نصرت وامداد پر بھروسہ کر کے یہ فیصلہ کرلیا کہ جلد وطن واپس جائیں اور اپنے اس دیرینہ شوق وامنگ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کریں، یوں آپ ۱۹۷۸ء میں وطن واپس آئے اور اللہ کے نام پر اس مدرسہ کی تاسیس کردی، **ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**۔اور:

جواں ہو عزم تو تارے بھی توڑ سکتے ہیں
کٹھن نہیں ہے کوئی کام آدمی کے لئے

پہلے پہلے اس مدرسہ کے سلسلۂ درس کا آغاز درسیات کے ابتدائی مراحل سے ہوا، معاً شعبۂ تحفیظ القرآن بھی کھولا گیا، بعد میں اللہ تعالی کے فضل وکرم سے حافظ صاحب نے اپنی محنت جاری رکھی اور چند سال گزرتے نہ گزرتے دورۂ حدیث تک کے درجات کھول لئے گئے۔اس حوالے سے حافظ صاحب کا بیان ہے کہ:

> ''میں نے بفضل تعالی ۱۹۷۹ء میں اس مدرسہ کی دوبارہ تاسیس کردی، پہلے پہلے ابتدائی درجات کھولے گئے، جن کے ساتھ تحفیظ القرآن کا شعبہ بھی جاری کیا گیا، پھر اللہ کے فضل وکرم اور مخیر حضرات کے بھرپور تعاون سے ہم دورۂ حدیث تک کے منتہی درجات کھولنے میں کامیاب ہوگئے، اس مدرسے میں میں نے اٹھائیس سالوں تک مسلسل بہ حیثیت مہتمم خدمات انجام دیں، اور ۲۰۰۷ء میں یہ بار گراں دوسروں کی سپرد کر کے اپنے گھر میں عمر کے بقیہ دن یاد الٰہی میں گزار رہے ہیں''۔

حضرت مولانا حافظ محمد میاں صاحب ایک عالم دین بھی ہیں اور جید حافظ القرآن بھی، ساتھ ساتھ

ذہنی اعتبار سے مدبر بھی ہیں اور کام کے حوالے سے منتظم بھی، ان کی بلند و بالا شخصیت کو اللہ تعالی نے بہت ساری خصوصیات سے نوازا ہے، انہوں نے اس زندہ وتابندہ درس گاہ کی تاسیس سے لے کر اس سے علیحدگی تک جو قابل قدر اور ناقابل فراموش جدوجہد اور کوششیں کیں، اور جس محنت ولگن سے کام کیا، اور اس مدرسہ کی تعمیر وترقی کے حوالے سے اپنے تن من دھن کو بروئے کار لایا، اور راہ کی مشکلات ومعضلات اور سنگ گراں کو تدریجی طور پر ہٹایا تھا، انہیں دیکھ کر آج ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ یہ ان کے اخلاص وللّٰہیت کا نتیجہ ہے، اور ساتھ ساتھ یہ دراصل توفیق خداوندی بھی ہے، جو ہر کسی کو عنایت نہیں ہوتی، اللہ جس کسی سے کام لینا چاہتا ہے، شک نہیں ہے کہ اسے توفیق بھی دی جاتی ہے۔

ماشاءاللہ یہ توفیق حضرت حافظ صاحب کو بھی ہوگئی تھی، ورنہ جو کام آپ سے بن پایا، عمومی طور پر ایسے کام کی انجام دہی ہر کس وناکس کی بس کی بات نہیں ہوتی۔اللہ تعالی ان کی زندگی اور ان کی روشن اور تاباں خدمات کو قبول کریں، اور ان کی یہ تمام اخلاص بھری خدمات ان کے ذریعۂ نجات اور بلندئ درجات کا سامان بنیں۔

حافظ صاحب کے بارے میں لوگ اپنی اپنی رائے رکھنے کے حق دار ضرور ہیں، اس دنیا میں یوں بھی کون کس کو روکے گا، اور کون کس کی زبان پر ہاتھ دے گا، ویسے آج کل تو انٹرنیٹ کا زمانہ ہے، جو جس کے متعلق جو بھی چاہے، کہتا ہی جارہا ہے، کوئی کسی کو روکنے والا کہاں ہے؟ لیکن میری رائے میں حافظ صاحب ایک حیثیت سے بڑی خوش قسمت انسان ہیں، انہوں نے سعودی عرب سے واپسی کے بعد جس لگن سے مدرسہ معارف العلوم کی تاسیس کے لئے کوششیں کی تھیں، اور آخرکار بنیاد ڈال ہی دی، اور لوگوں کے طعنے سہتے ہوئے اس کی تعمیر وترقی کے لئے دن رات کو ایک کردیا تھا، اس حوالے سے دوست تو دوست بلکہ بعض دشمن بھی اسے اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکا تھا، صرف یہی نہیں بلکہ کل جو دشمن تھے، آج ان کے لگن اور جان توڑ کوشش کو دیکھ کر وہ بھی دوست بن گئے تھے۔

مولانا حمید اللہ کوثر صدیقی صاحب کوئندنگی ؒ، بوسیدنگی:

استاد محترم مولانا حمید اللہ کوثر صدیقی صاحب بستی کوائندنگ، بوسیدنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم آبائی بستی کے مکتب میں پاکر مدرسہ معین الاسلام ٹمنگ چنگ میں داخل ہوئے، یہاں آپ نے وقت کے بڑے بڑے جید علمائے کرام سے عموما اور حضرت مولانا مفضل احمد صاحب کجافوی، علی چنگی سے خصوصا تعلیم حاصل کی، مولانا کوثر صاحب اپنے استاد مولانا مفضل احمد صاحب کے بڑے مداح تھے، ایک روز ناچیز کے پوچھنے پر کہنے لگے کہ:

> ''استاد محترم حضرت مولانا مفضل احمد صاحب اپنے زمانے کے بہت عالم دین تھے، ساتھ ہی ساتھ عامل بھی، آپ تفسیر وحدیث اور فقہ وفتاوی میں ید طولی رکھتے تھے، آپ کے سامنے وقت کے بڑے سے بڑے علماء بھی سرنگوں ہوجاتے تھے، فتاوی شامی کے گویا حافظ تھے، بڑے سے بڑے مسئلہ کا جواب بھی فی الفور بڑی آسانی سے دیا کرتے تھے، علاوہ ازیں فصیح وبلیغ اور حاضر دماغ بھی تھے''۔

مدرسہ معین الاسلام ٹمنگ چنگ سے ثانویہ کی تکمیل کے بعد کوثر صاحب نے رنگون کا سفر کیا، اور وہاں کے کسی مدرسہ سے سندِ فراغت حاصل کی، اس کے بعد وہاں کے ایک اردو اخبار سے وابستہ ہوگئے، اچھے کالم نگار تھے۔ ہماری طالب علمی کے زمانے میں وطن واپس آئے اور جامعہ اسلامیہ عالیہ میں مدرس مقرر ہوئے، اردو کے شاعر، ادیب، صحافی اور انشاء پرداز تھے، عرصۂ دراز تک جمعیتِ علمائے اسلام بوسیدنگ کے مرکزی سکریٹری اور بعد میں صدر رہے، اس کے ساتھ ساتھ ہماری زیر زمین کام کرنے والی معروف تنظیم ''روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن'' سے آپ کی وابستگی تھی، بعد میں مع اہل خانہ ہجرت کر کے بنگلادیش پہنچے، غالبا ۲۰۰۸ء میں چاٹگام میں آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی، مولانا حسین احمد صاحب سے آپ کی دوستی تھی، ان دونوں کے مابین ملاقاتوں کے علاوہ خط وکتابت بھی جاری رہتی تھی۔

شک نہیں ہے کہ آپ ایک جلیل القدر عالم دین، مبصر مفکر اور سیاسی انسان تھے، آپ نے ۲۰۱۲ء میں چاٹگام میں انتقال کیا، اور خاکِ چاٹگام میں مدفون ہیں۔

مولانا مستفیض الرحمن صاحب باغکونوی، بوسیدنگی:

استاد محترم مولانا مستفیض الرحمن بن مولانا فیض الرحمن صاحب کی پیدائش باغکونہ، بوسیدنگ میں ہوئی، متوسطہ تک کی دینی تعلیم علاقے کے مختلف مدارس جن میں مدرسہ معین الاسلام ٹمنگ چنگ بھی ہے میں پائی، پھر مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام سے سند فراغت حاصل کر کے وطن واپس آئے، آپ جامعہ اسلامیہ مدینۃ العلوم فوئمالی کے علاوہ علاقے کے مختلف مدارس میں تعلیم دینے کے بعد جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ کے مدرس مقرر ہوئے، یہاں ابتدائی، متوسطہ اور درجۂ علیاء کی مختلف کتابیں آپ کے حصے میں ہوتی تھیں۔

راقم سطور کے علاوہ مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے ساتھ آپ کے قریبی تعلقات تھے، اور شاید اب بھی ہیں، علاج وتشخیص کے حوالے سے آپ جبھی چاٹگام تشریف لاتے، مولانا حسین احمد کی رہائش گاہ میں قیام کرتے تھے، غالبا ۱۹۹۲ء کا کوئی مہینہ تھا کہ راقم سطور نے مولانا کی بساط بھر خدمت کی، جس کی طویل تفصیلات ہیں، چلتے چلتے ایک روز مولانا حسین احمد صاحب سے مولانا فرمانے لگے تھے کہ:

> ''اتنے سالوں تک میں سمجھتا رہا تھا کہ طاہر جمال ندوی ادب وتواضع سے بالکل ناآشنا ہے، لیکن اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک باادب اور متواضع انسان ہے، اللہ تعالی اس کی حیات دراز فرمائے''۔

ماشاء اللہ مولانا مستفیض الرحمن صاحب ایک قابل قدر عالم دین ہیں، تادم تحریر حیات سے ہیں، خاکم بدہن آپ کی زبان تھوڑی کڑوی اور لہجے قدرے سخت ہیں، لیکن بڑے حق گو عالم دین ہیں، دل کے بڑے سچے اور وعدے کے بڑے پکے ہیں، آپ مولانا حمید اللہ کوثر صدیقی صاحب کے بہت قریبی دوستوں میں شمار تھے، ہمارے طالب علمی کے زمانے میں یہ دونوں عالم دین ایک دوسرے کے بڑے قریب اور ہم خیال تھے، دونوں علم وفن کے رسیا، عربی اور اردو ادب سے بڑی دل چسپی رکھتے تھے، دونوں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد اور حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ؒ کے شیدائی تھے، حضرت مولانا ندوی کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھا کرتے تھے، اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے، آمین یارب العالمین۔

مولانا محمد حنیف راغبؔ فرندنگی، راسیدنگیؒ:

مولانا محمد حنیف راغبؔ بن ولی احمد بن تراب علی بن نور الدین صاحب ارکان کے مشہور شہر راسیدنگ کی ایک مردم خیز بستی فرندنگ میں ۱۹۵۲ بمطابق ۱۳۷۱ھ پیدا ہوئے، آپ کا نشوونما بھی وہیں ہوا، کہتے ہیں کہ مولانا کا خاندانی تعلق ارکان کے مشہور عالم دین حضرت مولانا محمد صالح فریندنگی، یونگ چنگی سے ملتا ہے۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مدرسہ قاسم العلوم فریندنگ میں پائی، اس کے بعد آپ ارکان کے دارالحکومت اکیاب گئے اور متوسطہ کی تعلیم مدرسہ رحمانیہ ساکی فارہ میں پاکر شمالی منگڈو کی معروف درسگاہ دارالعلوم میانجا نفور سے ثانویہ کی تعلیم حاصل کی، اس کے بعد آپ چاٹگام کی معروف علمی وروحانی درسگاہ جامعہ اسلامیہ اہلیہ دارالعلوم معین الاسلام ہاٹھزاری میں داخل ہوئے، لیکن اگلے سال ۱۹۷۷ء میں دورۂ حدیث جامعہ اسلامیہ ضمیریہ پٹیہ سے پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، علاوہ ازیں یہاں آپ نے فنونات کی بعض کتابیں بھی پڑھیں، بعد میں آپ نے پاکستان کا سفر کیا، اور معہد دارالافتاء ناظم آباد کراچی میں پڑھ کر سند افتاء بھی حاصل کی۔

یادرہے کہ مولانا محمد حنیف راغب نے سرزمین ارکان کے اس زمانے کے مشہور جواں عالم یا طالب علم حضرت مولانا دین محمد شہید فرندنگی سے نحو وصرف اور منطق وغیرہ کی چند کتابیں پڑھیں، اور شنید ہے کہ مولانا شہید آپ کے رشتے داروں میں سے تھے، اور راغب صاحب ان کو ''چچا جان'' کہہ کر پکارا کرتے تھے، اسی طرح مشہور بات ہے کہ مولانا راغب صاحب نے اکیاب کے مشہور و معروف عالم دین حضرت مولانا عبدالحق صاحب سے بھی خاصا استفادہ کیا تھا۔

مولانا دین محمد صاحب شہید کی شہرت ان کے زمانے میں شمالی مغربی ارکان میں عام تھی، یوں ان کے تلمیذ خاص ہونے کی وجہ سے مولانا راغب صاحب کی شہرت بھی بڑھنے لگی تھی، مولانا شہید اگرچہ ایک منتہی طالب علم تھے، لیکن بعض ذرائع کے مطابق پورے مستند عالم نہیں تھے، تاہم جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ آپ وقت کے ایک فن کار اور بالغ نظر معلم واستاد سے کسی معنی میں بھی کم نہیں تھے، کہتے ہیں کہ حضرت مولانا دین محمد صاحب شہید کی ذہنی اور فکری کیفیت کچھ اور ہی تھی، اور ایک

اندازے کے مطابق آپ کی ذات قدامت اور جدت کی سنگم تھی، باوجودیکہ ہمارے درس نظامیہ کے متداول نصاب کی زمینیں بڑی کٹھن، سنگلاخ اور خارزار ہیں، لیکن بعض ذرائع کے مطابق مولانا شہید کے سامنے یہ کتابیں گویا موم تھیں، ساتھ ہی ساتھ کہتے ہیں کہ آپ کی ذات میں افادے اور استفادے کا مادہ بھی کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا، جس نے بھی آپ سے پڑھا وہ شہید کا مداح اور فدا ہوگیا، آپ کے تلامذہ کو جہاں تک دیکھا کہ ہر ایک کو آپ کے مداح نظر آیا، مگر افسوس ہے کہ برمی درندوں نے ایک موقع پر ان کو شہید کردیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد حنیف راغب صاحب جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے فراغت کے بعد پاکستان گئے، اور مشہور روایت کے مطابق سرزمین پاکستان کے مشہور ومعروف عالم دین، مجاہد فی سبیل اللہ حضرت مولانا مفتی رشید احمد صاحب لدھیانوی سے کچھ استفادہ کیا، اس کے بعد آپ سعودی عرب گئے، کیلو اربعۃ عشرۃ جدہ کی ایک مسجد میں امامت کا فریضہ انجام دیتے رہے، اس دوران آپ نے چند دیگر روہنگیا ساتھیوں سے مل کر ''حمایت اسلام'' نامی ایک تنظیم کی بنیاد بھی رکھی اور ساتھ ہی ساتھ ''روہنگیا رسم الخط'' نامی ایک چیز بھی نکالی، اس وقت کے آپ کے ساتھیوں میں حضرت مولانا صالح احمد صاحب نکھوروی، حضرت مولانا سعید حسین صاحبؒ اور مسٹر محی الدین یوسف مقیم حال ولایات متحدہ امریکہ پیش پیش تھے۔

میں نے بذات خود محترم مولانا صالح احمد صاحب نکھوروی مقیم حال کیلو اربعۃ عشر جدہ کی ذاتی فائل میں کچھ چیزیں دیکھیں، جن سے اندازہ ہوا کہ مولانا محمد حنیف راغب صاحب ان مذکورہ کاموں کے حوالے سے اس زمانے میں کافی سرگرم عمل تھے۔ اسی طرح آپ ایک مدت سعودی عرب میں گزار کر بنگلادیش چلے آئے۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے کہ راغب صاحب اس وقت سعوودی عرب سے بنگلادیش یوں ہی بے مقصد نہیں آئے تھے، بات یہی ہے کہ آپ نے وہاں چند لوگوں کو سرزمین ارکان کے حوالے سے کام کرنے کے لئے تیار کیا، جنہوں نے آپ سے بھرپور تعاون کا وعدہ بھی کیا تھا، چنانچہ آپ نے بنگلادیش آتے ہی موضع سابرانگ، ٹیکناف میں ایک مدرسہ ''دارالتربیۃ الاسلامیہ'' کے نام سے قائم کیا، اور ساتھ ہی ساتھ اپنے روہنگیا رسم الخط کی بھی زور شور سے اشاعت شروع کردی تھی۔

مولانا کی تدریسی خدمات کے متعلق پتہ چلا کہ آپ نے اپنی حیات مستعار میں اب تک کئے مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، آج یہاں تو کل وہاں والی بات ہے، یوں بعض حضرات کو آپ کی مستقل مزاجی کے بارے میں کافی شکایات رہی ہیں، تاہم اس بات میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ آپ جہاں اور جس درس گاہ میں بیٹھتے، طلبہ آپ پر ٹوٹ پڑتے تھے، آپ نے جامعہ دارالسنہ نہلا، ٹیکناف کے علاوہ اور بھی دیگر چند مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں، جہاں بھی گئے، آپ کے درس کی نسبت سے طلبہ کی ایک بڑی جماعت آپ کے گرد جمع ہوگئی، تو اس حوالے سے آپ کو ایک کامیاب مدرس کہا جا سکتا ہے، چوں کہ آپ کو خصوصی طور پر فن منطق میں ایک کامیاب مدرس کہا جاتا ہے، ادھر عمومی طور پر ہمارے طلبائے مدارس کو منطق اور یونانی فلسفہ (جسے بعض نادانوں نے اسلامی فن اور فلسفہ بنا دیا ہے) کی لت لگی رہتی ہے، اس لئے بھی شاید آپ جہاں بھی جاتے ہیں کہ طلباء کی توجہ کے محور بنے رہتے ہیں۔

مولانا راغب صاحب کے مطابق کہ ''روہنگیا مسلمانوں کی زبان کا ایک رسم الخط ہونا چاہئے'' ہمارے قومی احساس کی ایک صدائے بازگشت تھا اور ہے، لیکن آپ نے اس احساس میں کافی غیر ذمے داری، کور بینی اور حد درجہ کے غیر منطقی جذبات سے کام لیا ہے، آپ کو اس حوالے سے تاریخی، ثقافتی، علمی اور اسلامی نقطۂ نظر سے کافی غور وفکر کرنا چاہئے تھا، لیکن افسوس ہے کہ آپ نے نہیں کیا، اور دعوی کیا ہے کہ ''روہنگیا ایک علیحدہ قوم ہے اور جس کی ایک علیحدہ زبان بھی ہے، اس لئے اس کا ایک علیحدہ اور منفرد رسم الخط ہونا ناگزیر امر ہے''۔

درحقیقت اورتو اور آپ کا یہ دعوی آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی، جو آپ کر بیٹھے تھے اور آخری دم تک اس پر اصرار کر رہے تھے، شاید بعد میں آپ کو اپنی اس بڑی غلطی کا احساس ہوا بھی ہوگا، لیکن بعض حضرات کے خیال میں آپ نے اپنے غرور و پندار اور اپنے ناروا ''انا'' کی وجہ سے اپنی اس غلطی سے رجوع نہیں کیا اور کرنا بھی نہیں چاہتے تھے۔

اس میں کوئی شبہ اور کسی کی دو رائے نہیں ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کی ایک زبان ہے، کہ اس کے لئے ایک رسم الخط بھی ہونا چاہئے، لیکن اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اس زبان کی ایک منفرد اور علیحدہ

رسم الخط کی تھوڑی بھی ضرورت نہیں، کیوں کہ ہمارے سامنے عربی رسم الخط حاضر ہے، جو تقریبا پورے عالم اسلامی کی بڑی بڑی زبانوں کا مشترکہ رسم الخط ہے۔

یہ تو ظاہری بات ہے کہ اگر پورے عالم اسلامی کو سیاسی، ثقافتی، فکری، دینی، روحانی اور تمدنی غرض ہر ایک اعتبار سے متحد رکھنا ہو تو اسلامیان عالم کے لئے ایک واجبی امر ہے کہ ان کی تمام زبانوں کا رسم الخط عربی رسم الخط پر مبنی ہو، چوں کہ ہم مسلمان ہیں، اس لئے ہماری قومی زبان کا رسم الخط بھی عربی رسم الخط میں ہونا ناگزیر ہے، علاوہ ازیں ہماری قومی تاریخ اس بات کی شاہد عیاں ہے کہ ماضی قریب و بعید میں ہمارے بزرگوں نے ہماری زبان کو عربی ہی لکھا تھا، جسے آج بھی ہمارے تاریخی اوراق اور دستاویزات میں ہم عیاں طور پر دیکھتے ہیں۔

کون سے اہل علم وفکر اس بات سے واقف نہیں ہے کہ عالم اسلام میں ہمارے دشمنوں، شاطروں اور سازش کاروں نے اس بابرکت رسم الخط ''عربی'' سے مسلمانوں کو علیحدہ کرنے کی کتنی ہی سازشیں کیں اور پروپیگنڈے کئے ہیں، اور جس کا سلسلہ ابھی بھی بدستور جاری ہے، اورتو اور صرف ترکی کو ملاحظہ کیجئے! کہ بالآخر مصطفی کمال اتاترک کے آلودہ ہاتھوں ترکی کو اس فکری نہج سے گرا دینے کے لئے اسلام دشمن عناصر اور انجمنوں اور ملکوں نے کیا کچھ نہیں کیا ہے، اسی طرح اندونیشیا اور ملائشیا کے حالات پر نظر ڈالئے۔

لیکن الحمدللہ ان مؤخر الذکر ملکوں کے مسلمانوں نے اس سازش کا مقابلہ بھی کیا ہے، اور اپنے قدیم اسلامی رسم الخط پر ڈھٹے بھی رہے ہیں، ویسے آج کل ترکی، بنگلادیش اور جزوی طور پر اندونیشیا اور ملائشیا کا رسم الخط اسلامی رسم الخط سے مختلف ہونے کی وجہ سے ان پر مقامی غیر اسلامی اثرات وسیع پیمانے پر دیکھے جارہے ہیں، جو اسلامیان عالم کی تاریخ وثقافت کے لئے ایک زہر ہلاہل سے کسی اعتبار سے کم نہیں ہیں، یہ اور اس قسم کے دیگر حقائق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج کل مسلمانان ارکان اور ان کی زبان کا رسم الخط بھی اسلام دشمن ان سازش کاروں کی سازش کا شکار ہو ہی چکا ہے۔

اس حوالے سے ہمارے بعض محققین اور صاحب نظر حضرات کا یہی دعوی ہے کہ روہنگیا مسلمان جس طرح دیگر بڑی بڑی سازش کے شکار ہو چکے ہیں، ٹھیک اسی طرح ان کی زبان کا رسم الخط بھی اسلام دشمنوں کا شکار ہو چکا ہے، لیکن راغب صاحب دانستہ طور پر ان سازش کاروں کی حمایت کر رہے تھے۔

بہر حال یہ ایک قابل ذکر بات ہے کہ ماضی میں چاٹگام بشمول ارکان کی زبان عربی ہی میں لکھی جاتی تھی، اس حقیقت کو برصغیر کے معروف اور نامور مسلم مورخ محترم شیخ محمد اکرام نے اپنی گراں مایہ تصنیف ''آب وثر'' میں واضح کر دیا ہے، چنانچہ آپ لکھتے ہیں کہ:

''غالباً گجرات، مالابار اور معبر کی طرح چٹاگانگ کے پاس (موجودہ مشرقی پاکستان میں) مسلمانوں کی بستیاں تھیں، چٹاگانگ کے گردونواح اور قریبی جزائر (سندیپ) میں بنگالی کی صورت رائج ہے، اس میں عربی اثرات خاص طور پر نمایاں ہیں، اس علاقے میں عربی رسم الخط کو بنگال کے باقی حصوں سے زیادہ اہمیت رہی ہے، یہاں قدیمی بنگالی کتابوں (مثلاً شاہ علاول کی تصانیف) کے مخطوطے دستیاب ہوئے ہیں، ان میں کئی عربی رسم الخط میں ہیں، یہ محض اتفاقی نہیں تھا کہ بنگالی کو حروف قرآن میں لکھنے کی جو تحریک زمانے میں شروع ہوئی تھی، اس کا مرکز چٹاگانگ تھا، یہ عربی اثرات یقیناً عرب تاجروں اور ملاحوں کی آمد ورفت کا نتیجہ تھے، اور اس ساحل پر عربوں کی مقامی نوآبادیاں قرین قیاس معلوم ہوتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تاریخ ان کے متعلق خاموش ہے(۱) اس علاقے میں عربوں کی آمد کا سب سے پہلا سراغ برما کے علاقے اراکان کی مقامی تاریخ میں ملتا ہے، جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں ایک راجا کے عہد حکومت میں جو ۷۸۱ء میں تخت نشین ہوا، عربوں کے کئی جہاز سمندر میں طغیانی کی وجہ سے رامری کے قریب ٹوٹ گئے، اور مسافروں کو اندرونی علاقے میں بسایا گیا، بعد میں اراکان کے ساحل پر اسلامی اثرات بڑھ گئے، چناں چہ کیمبرج ہسٹری میں لکھا ہے کہ تیرھویں صدی میں آسام سے ملایا تک کے ساحل پر جا بجا مسجد نما عمارتیں تھیں، جنہیں بدر مکان یا بدر مقام کہا جاتا ہے۔

---

(۱) جناب اکرام صاحب! خاموش نہیں ہے بلکہ بے شمار تاریخ کی کتابیں اور دستاویزات موجود ہیں۔

ہاروے نے وضاحت کی ہے کہ ان عمارتوں کو نہ صرف مسلمان، چینی اور بدھ مت کے پیرو بھی احترام سے دیکھتے ہیں، ان کا انتساب بدر اولیاء یا بدرالدین اولیاء سے تھا، جن کا چٹاگانگ میں چلہ خانہ بتایا جاتا ہے، لیکن جو بہار میں دفن ہیں، اور ان کے ملاح اور کشتی بان خاص طور پر معتقد تھے''۔(۱)

اسی طرح ارکانی مؤرخ جناب مرحوم اڈووکٹ خلیل الرحمن صاحب نے اپنی تصنیف ''تاریخ اسلام ارکان و برما'' میں حضرت علاول رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دیگر لوگوں کی تصانیف سے طول طویل اقتباسات درج کر دیئے ہیں، جو عربی رسم الخط میں لکھی گئی تھیں، جن سے بات عیاں ہوجاتی ہے کہ سرزمین ارکان کے مسلمانوں کی زبان قدیم زمانے میں عربی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔

اسی طرح مشہور و معروف ارکانی مؤرخ اور سیاست دان و محرک جناب مرحوم ظہیرالدین بی اے علیگ نے اس موضوع کے حوالے سے کمال ہی کر دیا ہے، انہوں نے ''زبان مشرقی بنگال واراکان'' نامی ایک مستقل تصنیف لکھ کر منظر عام پر لائی ہے، جو ابھی میرے سامنے ہے، جس میں بے شمار اقتباسات درج ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ چاٹگام اور ان کے شعرائے کرام اور انشاء پردازوں نے عربی رسم الخط میں بے شمار کتابیں تصنیف کی تھیں، حضرت علاول اور منشی لال محمد وغیرہ کی تصانیف کے اقتباسات کے علاوہ مقامی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے اور لکھے جانے کا طرز و طریقہ بھی مرحوم نے بڑے اچھے انداز میں اور بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے، جن سے بخوبی استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

اہل علم و دانش اور باخبر حضرات سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ ابوالبشر سیدنا آدم علیہ السلام نوع انسانی کے والد بزرگوار اور پہلے انسان ہیں، جنہیں اللہ رب العلمین نے خلافت الارض کے لئے پیدا کیا، جنہوں نے ۹۳۰ سال کی عمر پائی، سیدنا شیث علیہ السلام جب ان کے گھر میں پیدا ہوئے تو اس وقت سیدنا آدم علیہ السلام کی عمر ایک سوتیس سال تھی، قرآن کریم میں سیدنا آدم علیہ السلام کو پیدائش کے بعد جنت میں ٹھہرانے کا ذکر ہے کہ:

---

(۱) شیخ محمد اکرام، آب کوثر، ص: ۵۲۔۵۳۔

{وقلنا یا آدم اسکن أنت وزوجک الجنة وکلا منها رغدا حیث شئتما ولا تقربا هذه الشجرة فتکونا من الظلمین} (البقرة: ۵۳)

ترجمہ: پھر ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، اور یہاں بفراغت جو چاہو کھاؤ، مگر اس درخت کا رخ نہ کرنا، ورنہ ظالموں میں شمار ہوں گے۔

اس سے جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ زمین پر بحیثیت خلیفہ بھیجے جانے سے پہلے ان دونوں میاں بیوی کو بغرض امتحان جنت میں رکھا گیا تھا، تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہوجائے۔

ادھر اس جنت کی تعیین میں علمائے امت کا اختلاف ہے، حضرت امام ابوحنیفہ، ابوالقاسم بلخی، ابن قتیبہ اور ابوالقاسم اصفہانی رحمہم اللہ کا قول ہے کہ یہ زمین یعنی کرۂ ارضی ہی میں ایک مقام تھا جہاں ان کو ٹھہرایا گیا تھا، مگر دیگر علماء اور مفسرین نے اسے آسمان پر بتایا ہے، البتہ موخر الذکر علماء میں سے بعض کا قول ہے کہ یہ جنت جنت الخلد سے الگ تھی، اور بعض نے اسے جنت الخلد ہی بتایا ہے، جو کچھ بھی ہو، آپ جنت میں تھے ہی، اور جہاں تک جنت میں ان کی زبان کا تعلق ہے کہ ظاہر ہے کہ ان کی ایک زبان بھی تھی، ارشاد نبوی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ عربی ہی تھی، کما قال علیہ السلام:

{احبو العرب لثلاث، لانی عربی، والقرآن عربی، ولسان اهل الجنة عربی}

تو عربی ہی اہل جنت کی زبان ٹھہری۔

سیدنا آدم علیہ السلام کی ذریت میں سیدنا نوح علیہ السلام تاریخ انسانی کے پہلے رسول ہیں، بائبل کا بیان ہے کہ سیدنا نوح علیہ السلام کی عمر ابھی ۶۰۰/سال کی تھی کہ طوفان نوح شروع ہوا، چالیس دن چالیس رات تک آسمان سے پانی برستا اور سمندر کے چشموں سے اچھلتا رہا، انہوں نے طوفان سے پہلے ایک کشتی بنائی تھی، جس کا طول ۳۰۰ ہاتھ، عرض ۵۰ ہاتھ، اور بلندی ۳۰ ہاتھ تھی، اور جس کے اندر تین طبقے تھے، اور ایک سو پچاس روز کے بعد پانی زمین سے کم ہونا شروع ہوا، تو ۶۰۱ عمر نوحی سے دوسرے مہینے کی ۲۷/تاریخ کو سیدنا نوح علیہ السلام نے زمین پر قدم رکھا، آپ علیہ السلام اس طوفان کے بعد ۳۵۰/سال زندہ رہے۔ ویسے تاریخ انسانی سیدنا نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد باری ہے: **{وجعلنا ذریته هم الباقین}**

اور سیدنا نوح علیہ السلام کے تین فرزند تھے، سام، حام اور یافث، جن کی نسل تمام معمورۂ دنیا کی آبادی اور رونق بن رہی ہے، البتہ آپ علیہ السلام کا ایک چوتھا بیٹا یام بھی تھا، جو عمل غیر صالح ہونے کی وجہ سے اس مذکورہ طوفان میں غرق آب ہوا۔

پھر سام یا سم سیدنا نوح علیہ السلام کے بڑے فرزند کا نام ہے، سیدنا نوح علیہ السلام کی ۵۰۲/سال کی عمر تھی، جب ان کے ہاں یہ اولین فرزند پیدا ہوئے۔ اور سام ان تمام اقوام کے پدر اور جملہ السنہ کے معلم اول ہیں، جن کا نام یورپین مورخین نے ''سامونٹک'' رکھ دیا ہے۔ اب بھی سامی زبان کا وجود ایشیا اور افریقہ کے اندر برابر پایا جاتا ہے، فونی شین، ارمیک، اسیرین، انتھی او پک زبانیں سامی زبان ہی سے نکلی ہیں، اور یہ تو مسلمات سے ہے کہ عربی اور عبرانی زبانیں تمام سامی السنۃ کے اندر زیادہ شاندار اور خزائن علمی سے مالا مال ہیں۔

مشہور قدیم مؤرخین اس امر کے معترف ہیں کہ سام کی اولاد کا اصلی وطن عرب ہے، قرآن مجید نے اس آیت:

{ لتنذر ام القری ومن حولها } (الانعام: ۹۲)

میں مکہ کو ام القری یعنی بستیوں کی ماں بتایا گیا ہے، اور قرآن کریم کا یہ ارشاد ان مذکورہ مورخین کی اس مورخانہ جدوجہد کی تصدیق فرماتا ہے، اور یہ بات تاریخ سے بھی ثابت ہوگئی ہے کہ قدیم ترین زمانے میں کچھ قومیں ریگستان عرب سے نکل کر اس کے گرد ونواح کی قابل کاشت اراضی پر آباد ہوئی تھیں، اس کا ثبوت اس طرح حاصل ہوا ہے کہ عرب ہی وہ لوگ ہیں، جن میں سیمی ٹک کیریکٹر (یعنی سامی عادات واطوار) اپنی اصلی حالت میں پایا جاتا ہے، اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ ان کی سادہ زندگی ہمیشہ یکساں طریق پر چلی آئی ہے۔

مورخین کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ عربوں کی زبان ہی ہمیشہ سے محفوظ چلی آئی ہے، البتہ عبرانی زبان بھی کسی قدیم زمانے میں محفوظ تھی، جس کی یادگار اس وقت اہل علم ودانش کے ہاتھ میں بیشا کے کتبے یا سلوآم کا کتبہ باقی رہ گیا ہے۔

سلطنت یہود کا زوال اور اشدودیوں کے ساتھ یہودیوں کی مناکحت، بنی اسرائیل کی اسیری، بیت

المقدس کی بربادی اور یہودیوں کا مختلف ملکوں میں منتشر ہو جانا ایسے قدرتی اسباب تھے، کہ عبرانی زبان اپنی اصلی حالت میں باقی نہ رہ سکی، اور ان اسباب سے اس قدر عظیم انقلاب آیا کہ آخر یہود کی اصلی زبان بجائے عبرانی زبان کے ارمیک بن گئی۔ اور جہاں عبرانی کا یہی حال ہے تو وہاں دیگر سامی زبانوں کا ذکر فضول ہے۔ اس بات سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ عربی ہی ایک ایسی زبان ہے، جو اپنی اصلی حالت میں باقی رہ گئی ہے، اور قرآن حکیم جو اللہ تعالی کی طرف سے انسانیت کے نام آخری اور ختمی پیغام ہے، اس کے ذریعے اللہ تعالی نے اس زبان کے ساتھ اس کے رسم الخط کو بھی دوام بخش دیا ہے۔

فونی شین زبان کی واقفیت اہل علم کو صرف ان کتبات سے ہوئی، جو چوتھی صدی قبل مسیح علیہ السلام کے دستیاب ہوئے ہیں، لیکن یہ زبان اس قدر حجاب ونسیان میں آچکی ہے کہ ان کتبات کے پڑھنے والوں کو بھی خود اس پر وثوق نہیں کہ جو پڑھا وہی ٹھیک ہے۔ ادھر آرمیک زبان کبھی تمام کنعانیوں کی زبان تھی، جہاں جہاں کنعانی قومیں عمدہ عمدہ چراگاہوں کی تلاش میں ارض کنعان سے چینی ترکستان تک پہنچتی رہیں، یہ زبان بھی وہاں گئی، مورخین کا خیال ہے کہ لفظ ارم جو قرآن کریم میں بکسر اول وفتح ثانی اور تورات میں دونوں فتح کے ساتھ مستعمل ہوا ہے، اسی قوم کی یادگار ہے، اور اب یہ زبان بھی نقاب نیستی کے پردے میں پنہاں ہے۔

سامری زبان پر غور کرنے والوں نے اعتراف کیا ہے کہ وہ عربی وعبرانی اور ارمیک زبانوں سے بنا ئی گئی ہے، اسی لئے اول تو وہ پہلے ہی سے کوئی مستقل زبان نہ تھی، دوسرے اب اس زبان کا تلفظ یا لغت بتانے سے کل دنیا گونگی ہے، سریک یا اڈیسن زبان اس عیسائی ارمینیا والوں کی زبان تھی، جن کا دارالسلطنت پانچویں یا چھٹی صدی مسیحی میں اڈیسہ تھا، مگر اس نوزائدہ بچہ کو زیادہ عمر نصیب نہ ہوئی تھی۔

غرض! عربی ہی ایک ایسی واحد اور وحید زبان رہ جاتی ہے، جو سیدنا سام علیہ السلام کی تعلیم کردہ زبانوں میں سے زندہ وتوانا موجود ہے، اور شام، عراق، مصر، فلسطین، مراکو، تیونس غرض تمام عرب دنیا اس کے زیر نگین ہے۔ اور یہ زبانیں جو اپنے اندر مماثلت اور مشابہت رکھتی ہیں، بڑے اختصار کے ساتھ وہ یہ ہیں:

(۱) سہ حرفی مصادر کا پایا جانا،

(۲) اسم اور فعل کے قاعدوں میں مشابہت،

(۳) اسماء، ضمائر اور فعل کے درمیان باہمی تعلقات،

(۴) تراکیب نحوی میں مشابہت،

(۵) فعل لازم ومتعدی کے طریقے،

اب جو کوئی شخص عربی میں مہارت رکھتا، نحو وصرف وعربی کو بخوبی جانتا اور عربی ادب کا دانا ہے، اسے بخوبی معلوم ہے کہ ان جملہ امور میں عربی زبان کیسی مکمل، مستقل اور ہمہ گیر ہے، اور یہی اوصاف ظاہر کرتے ہیں کہ عربی زبان ہی ان تمام زبانوں کی ماں ہے، جو طوفان نوح کے بعد کسی متمدن حصۂ عالم پر کبھی پائی گئی تھیں، جس طرح سیدنا سام علیہ السلام ان ممالک کی جملہ اقوام کے پدر بزرگوار ہیں۔

اب روہنگیا زبان کے رسم الخط کے حوالے سے میری اتنی گزارش ہے کہ وہ جس طرز تعمیر کا بھی ہو، مگر اس کا رشتہ اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت سے مکمل طور پر جڑا ہوا ہونا چاہئے، میں روہنگیا قوم کو دنیا کے دیگر مسلمانوں سے ایک علیحدہ قوم کہنے کے بجائے ان کا ایک آٹوٹ حصہ کہنا بجا سمجھتا ہوں، جس کی ایک اسلام سے جڑی ہوئی تہذیب وثقافت تو ہے ہی مگر ایک مانا پہنچانا رسم الخط نہیں ہے، کون نہیں جانتا ہے کہ اسلام کی ایک بین الاقوامی زبان بھی ہے اور رسم الخط بھی، اسی لئے روہنگیا رسم الخط اس اسلامی رسم الخط اور زبان سے کسی بھی معنی میں توڑا ہوا ہونے کے بجائے کلی طور پر جڑا ہوا ہونا چاہئے۔

ناظرین آپ جانتے ہیں کہ روہنگیا رسم الخط کے حوالے سے ماضی میں مختلف لوگوں کے مختلف انداز وفکر کے نتائج ہمارے سامنے آئے ہیں، اور راقم سطور کے ناقص خیال میں جن حضرات نے اس حوالے سے کوششیں کیں، ایک حیثیت سے سب کی کوششیں قابل داد اور لائق صد تحسین ہیں، جن کا اجمال کچھ یوں ہے:

(۱) برمی رسم الخط کے چاہنے والے:

روہنگیا برادری کا ایک مختصر سا طبقہ جو برمی اسکولوں اور کالجوں سے مستفید ہے، اس کی چاہت یہی ہے کہ روہنگیا زبان کا رسم الخط برمی یا برمی زبان کے رسم الخط سے ملتا جلتا ہو، ایک ہی جملہ میں یہی طبقہ

دانستہ یا نادانستہ یا کسی سازش کے لپیٹ میں آ کر اپنی ثقافتی، تہذیبی، ملی اور قومی اقدار کو برمی تہذیب و ثقافت سے جوڑنا چاہتا ہے، اور اس کا یہی بھی کہنا ہے کہ ہم برمی ہیں، اور ارکان کا یہ علاقہ برما کا ایک حصہ ہے، اور ہمارا مستقبل برما کے ساتھ جڑا ہوا ہے، اسی لئے ہمارا رسم الخط بھی برمی رسم الخط یا اس سے ملتا جلتا ہونا چاہئے۔

(۲) لاطینی رسم الخط کے فریفتے:

دوسرا وہ طبقہ جو لاطینی تہذیب وثقافت سے بری طرح متأثر ہے، چاہتا ہے کہ روہنگیا رسم الخط انگریزی یعنی لاطینی رسم الخط پر مبنی ہو، تاکہ اس کے مطابق عالمی تہذیب وثقافت سے روہنگیا مسلمانوں کے رشتے مضبوطی سے جڑ جائیں، اس کے زعم میں مغربی تہذیب وثقافت ہی عالمی تہذیب و ثقافت ہے۔ اول تو بات یہی ہے کہ مغرب کے پاس تو کوئی بامعنی تہذیب وثقافت ہی نہ تھی، اور آج بھی جتنی اور جس قدر اس حوالے سے یہاں مفید چیز نظر آ رہی ہے، وہ اسلام کی رہین منت ہے، یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پر طویل گفتگو کی ضرورت ہے۔ پھر روہنگیا مسلمانوں کے اس طبقے کو اپنی زبان کے لئے لاطینی رسم الخط کے اپنانے میں چند فوائد بھی نظر آ رہا ہے، جو درج ذیل ہیں:

(الف) ایک عالمی رسم الخط سے روہنگیا رسم الخط کا راہ ورسم جڑ جائے گا۔

(ب) آج کل کی دنیا گلوبلائزیشن کی دنیا ہے، لاطینی رسم الخط والوں کی ایک انتہائی جد جہد اور منظم کوشش یہ رہی ہے کہ دنیا کی ساری زبانیں لاطینی رسم الخط میں لکھی جائیں۔ تو اس صورت میں عالمی تہذیب وثقافت سے روہنگیا رسم الخط اپنا ناطہ جڑ کر خود روہنگیا زبان بھی عالمی زبانوں سے قربت حاصل کرلے گی، اور گلوبلائزیشن کے اس پروگرام میں مسلمانان ارکان بھی حصے دار ہوسکیں گے۔

(ج) جب ہمای زبان کا رسم الخط لاطینی رسم الخط ہوگا تو لاطینی زبان ورسم الخط والی آج کل کی مادی اعتبار سے طاقتور دنیا ہماری معاون ہوجائے گی، اس وقت روہنگیا زبان وادب کی ترقی کے لئے ایک راہ ہموار ہوجائے گی، جو ہم جیسی نادار اور پریشان حال قوم کے لئے ناگزیر ہے۔

(د) آج کل کس باخبر سے مخفی ہے کہ انٹرنیشنل اسٹنڈ ریڈ آرگنائزیشن (ISO) جیسی ایک عالمی تنظیم، اپنے دیگر عالمی معیار کے کاموں کے علی الرغم دنیا کی زبانوں کے لئے ایک ایک سیریل نمبر مقرر کر

تی ہے، ماضی میں اس کے یہاں روہنگیا زبان کا کوئی ایک خاص نمبر نہ تھا، بلکہ اس نے روہنگیا زبان کو چاٹگامی زبان کا ایک حصہ قرار دے رکھا تھا، تو چند سال پہلے ہمارے ایک دانشور نے لاطینی رسم الخط میں روہنگیا زبان کا ایک خوب صورت ڈزائن ''روہنگیالش'' کے نام سے اس تنظیم کے سامنے پیش کیا تو اس نے اسے بہت پسند کیا، اور روہنگیا زبان کے لئے ایک علیحدہ نمبر بھی مقرر کردیا، اب اس طبقے کی نظر میں روہنگیا زبان اور لاطینی میں اس کا رسم الخط عالمی زبانوں اور عالمی رسم الخطوں کی صف میں کھڑا ہو گیا ہے، یوں اس کے مطابق جو روہنگیا قوم کی ایک بڑی کامیابی ہے، اور سننے میں آئی کہ روہنگیا زبان اگر لاطینی رسم الخط میں ہوگی، تو اس کے لئے ممکنہ تعاون اور امداد بھی اس کی طرف سے مل جائے گی، ہمارے اس طبقے کے خیال میں یہ ایک بڑا سود مند امر ٹھہرا ہے، جو ان کے زعم میں روہنگیا مسلمانوں کے لئے ایسے حالات میں ناگزیر امر ہے۔

(ھ) لاطینی رسم الخط میں روہنگیا زبان کے ہونے میں اور ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی دکھایا جارہا ہے کہ آج کا دور چونکہ کمپیوٹر کا دور ہے، تو روہنگیا زبان کے لئے کمپیوٹر میں ازسرنو کسی ڈزائن کی ضرورت نہیں ہوگی، ظاہر ہے کہ کمپیوٹر کے تمام پروگرام ہی بنیادی طور پر لاطینی رسم الخط میں ہیں، اور روہنگیا زبان کے لئے ناگزیر حروف ورموز بھی اس میں موجود، تو ہمارے لئے اس حوالے سے کام آسان ہوگیا، اس طبقے کا کہنا ہے کہ روہنگیا ایک غریب اور مفلوک الحال قوم ہے، اور دنیا کی غریب اور مسکین ترین قوموں کی صف میں بھی اس کا نمبر تقریبا اولین سطر میں ہے، تو ایسے حالات میں ہمارے لئے ایک بنے بنائے رسم الخط ہی مفید ہے، روہنگیا زبان کے لئے اگر لامحالہ ایک نیا رسم الخط اپنایا جائے گا تو سینکڑوں مشکلات ہمارے سامنے کھڑی ہوجائیں گی، ہمارے ایسے حالات میں ان مشکلات کے سمندر کو کامیابی سے پار کرنا ہماری بس کی بات نہیں ہے۔

(۳) بنگلا زبان اور رسم الخط پر قانعین:

(ا) آج کل ایک بھاری اکثریت جن میں چند علماء بھی ہیں اور دانشوران بھی، جن میں حضرت مولانا اڈووکٹ شفیق احمد صاحب قابل ذکر اور ناقابل فراموش ہیں، جن کی چاہت یہی ہے کہ روہنگیا زبان کا ایک علیحدہ رسم الخط یا کسی دیگر زبان سے ملتے جلتے رسم الخط کی تھوڑی ضرورت نہیں، بس بنگالی زبان و

ادب ہی کافی ہے، اور یہ حضرات اپنے دعوے کے حق میں چند دلائل بھی پیش کرتے ہیں کہ:

(الف) نسلی، دینی، تہذیبی وتمدنی، اور رسم ورواج، جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے مسلمانان ارکان بنگالی قوم کا ایک اٹوٹ حصہ ہے، اور تو اور چند صدی پہلے کی بات ہے کہ زبان وادب کے حوالے سے پوری سرزمین بنگال جب اندھیری میں ڈوبی ہوئی تھی، تو اس وقت سرزمین ارکان نے ہی بنگلا زبان وادب کو سنبھالا اور سنوارا تھا، جس کی درجنوں دلائل موجود ہیں، اور جس کا اعتراف بنگالی مورخین اور اہل علم ودانش نے بھی کیا ہے، ویسے بنگلا زبان وادب جس طرح بنگالیوں کا قومی ورثہ ہے، ٹھیک اسی طرح روہانگ میں بسنے والے مسلمانوں کا بھی قومی ورثہ ہے، ماضی قریب میں بھی مسلمانان ارکان میں بنگلا زبان وادب کا چرچا تھا، اور حال میں بھی یہاں اکا دکا ایسے لوگ پائے جاتے ہیں، جن کو بنگلا زبان وادب کی مہارت حاصل ہے، اس لئے اگر ارکان کے مسلمان اپنے قومی ورثہ سے رشتہ رکھنا چاہتے ہیں تو ان کے لئے بنگلا زبان وادب کے بغیر دوسری کسی زبان اور رسم الخط کی ضرورت نہیں، بنگلا ہی ان کے لئے کافی ہے۔

(ب) ڈھاکہ، بریسال، کھلنا، سلہٹ، یا مغربی بنگال اور مشرقی بنگال کو رہنے دیجئے، صرف اور صرف چاٹگامی بنگالیوں کو لیجئے، کڑوروں چاٹگامی اگر بنگلا زبان وادب کو اپنا کر اور اس میں پوری مہارت حاصل کر کے اپنا کام کر سکتے ہیں، تو ارکانی مسلمان کیوں نہیں کر سکتے؟ اور چاٹگامی بنگالی اور ارکانی مسلمانوں میں زبان کے حوالے سے فرق ہے تو کتنا فرق ہے؟؟ آخر اتنا فرق بھی تو نہیں ہے، جتنا چاٹگامی اور دیگر مذکورہ علاقے والوں کے مابین ہے۔

(ج) کرۂ ارضی میں بنگالی ایک بڑی قوم ہے، مغربی اور مشرقی بنگال کو ملا کر کوئی تیس پینتیس کڑور پر مشتمل بنگالی قوم آباد ہے، اور تو اور ہندوستان یعنی برصغیر میں زبان کے اعتبار سے بنگالی سب سے بڑی قوم ہے، جس طرح بنگالی لوگ حالیہ ہندوستان میں ہیں اسی طرح بنگلا دیش میں بھی ہیں، ہندوستان میں بسنے والے بنگالی ہندوستانی ہیں اور بنگلا دیش میں بسنے والے بنگلا دیشی، ٹھیک اسی طرح ارکان میں بسنے والے ارکانی یا برمی بنگالی ہو کر رہنے میں کیا خرابی ہے؟ اور بنگلا زبان میں جس طرح:

☆ علاقۂ ڈھاکہ میں رہنے والوں کو (ڈھاکایا) کہا جاتا ہے،

☆ بریسال والوں کو (بریسایلا)

☆ کھلنا والوں کو (کھلنایا)

☆ چاٹگامیوں کو (چیٹاینگیا)

☆ ٹھیک اسی طرح روہانگ جو جغرافیائی اور تاریخی اعتبار سے بنگال کا ایک ملحق علاقہ ہے، یہاں بسنے والے بنگالیوں کو روہنگیا کیوں نہیں کہا جا سکتا؟ اگر سیاسی حد بندی اس میں مانع ہے تو مغربی بنگالیوں (جو ہندوستان میں آباد ہیں) کو بنگالی کہنے میں کیوں کوئی پریشانی نہیں ہوتی؟؟ غرض ان لوگوں کا مدعا یہی ہے کہ ارکان جس کا قدیم معروف نام روہانگ ہے، یہاں کے مسلمانوں نے ماضی قریب اور بعید میں بہت ساری سیاسی غلطیاں کیں، اگر اب بھی بنگلا زبان وادب اور رسم الخط کو اپنائے بغیر ایک علیحدہ رسم الخط یا اور کسی رسم الخط کو اپنا لیا گیا تو ان کا رہا سہا رشتہ بھی اپنے بھائیوں سے ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا، ماضی قریب وبعید میں اپنے ان بھائیوں نے ہماری ہر قسم کی مدد کی، اور مستقبل میں بھی ان سے تعاون اور امداد ونصرت کی توقع ہے، تو بنگلا کو چھوڑ کے کیوں ہم اپنے بھائیوں سے بچھڑنے کا سامان خود پیدا کریں؟ آخر اس میں ہمارا فائدہ تو نہیں، بلکہ نقصان ہی نقصان ہے۔

(د) ہمارے ان حضرات کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہمیں دیگر کسی بھی رسم الخط کی سرے سے ضرورت ہی نہیں، بنگلا زبان وادب ہی ہمارے لئے کافی ہے، ہم نسلی اعتبار سے بھی بنگالی اور زبان کے اعتبار سے بھی بنگالی ہیں، اور ہماری زبان بنگلا زبان کا ایک اٹوٹ شاخ ہے، جس طرح چاٹگامیوں، ڈھاکہ والوں، سلہٹیوں، اور بریسایلیوں کی اپنی اپنی علاقائی بنگالی زبانیں ہیں، ٹھیک اسی طرح ہماری زبان کا معاملہ ہے، رہی بنگلا فصیح زبان جسے بنگلا میں شدھو بھاشا کہا جاتا ہے، یہ تمام بنگلا باسیوں کا مشترکہ ورثہ ہے، ہر ایک کے اپنے اپنے علاقائی لہجے ہونے کے باوجود، ہر ایک کا یہی ماننا ہے کہ بنگلا کی فصیح زبان ہر ایک کی مشترکہ زبان ہے، جس میں کسی کا اختلاف اور دورائے نہیں، اس ضمن میں غور کیا جا سکتا ہے کہ اگر چاٹگام والے بنگلا کی فصیح زبان کو اپنے قومی ورثہ کے بطور اپنی زبان مان سکتے ہیں تو ارکان میں رہنے والے کیوں مان نہیں سکتے؟ ارکانیوں کی زبان اور چاٹگامیوں کی زبان میں کتنا فرق؟ ویسے لب ولہجہ کا فرق تو خود ارکانیوں کی زبان میں بھی ہے، آیا اتنا ہی فرق کی بنا پر منگڈو

اور بوسیدنگ والے اپنے اپنے علیحدہ رسم الخط پر زبانیں لکھا کریں گے؟ یہ تو انہونی چیز ہے۔

(۴) ایک جداگانہ رسم الخط کے متوالے:

پچھلے چند سالوں سے ہمارے ایک مولوی صاحب نے روہنگیا رسم الخط کے حوالے سے ایک انوکھے انداز کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے، ماشاءاللہ ان کی قابلیت اور استعداد کی جتنی بھی تعریفیں کی جائیں کم ہیں، مہارت کا ایک عالم تھا کہ انہوں نے اپنے مطابق ایک نئے رسم الخط ایجاد کر کے روہنگیا جیسی ایک مظلوم قوم کے سامنے اپنی انوکھی خدمت پیش کر دی ہے، اللہ تعالی ان کا بھلا کرے، ماضی میں ان کو ہم ایک اسلامی ذہنیت اور دینی افکار ونظریات کا حامل سمجھتے رہے تھے، قرآن وسنت سے معلوم نہیں کتنا، مگر حکیم سنائی اور سعدی شیرازی وغیرے سے ان کا رشتہ بہت گہرا تھا، ماشاءاللہ بڑے فنکار اور ماہر تھے، انہوں نے اپنی روشن خیالی اور نرالے فن کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک رسم الخط نما چیز سے کچھ لوگوں کو متعارف کرایا، اور اس کے ذریعے ہم جیسے غریبوں اور مسکینوں کو قرآن وسنت کی بنیادی اور لازوال افکار ونظریات سے بچھڑ جانے کی ایک عجیب اور منفرد انداز میں دعوت دی تھی، ان کے بعض حواریوں نے (شاید ان کی ایماء پر ہو) کہ ہمارے بعض نادانوں کے کان میں یہ صور پھونکا تھا کہ :

"روہنگیا اس کرۂ ارضی میں ایک علیحدہ قوم ہے، جس کی ایک علیحدہ زبان ہے، اب
اس زبان کی بقا واز دھار کے لئے ایک علیحدہ رسم الخط ناگزیر ہے، جس کا دنیا کی کسی
زبان کے رسم الخط سے الگ تلگ ہونا ضروری ہے"۔

انہوں نے اپنے دعوی کے مطابق ایک رسم الخط اختراع کر کے روہنگیا مسلمانوں کے ایک چھوٹے اور منفعل سے طبقے کو اگرچہ ایک مدت کے لئے سہی مزید منفعل بلکہ بدحواس بنا دیا تھا۔ یوں بھی ہمارے لئے یہ ایک درد بھرا المیہ ہے کہ امام الہند شاہ ولی اللہ الدہلوی کے مکتب فکر کے کسی ایک مدرسہ کے فارغ التحصیل کے ذہن رسا میں اپنی قومی زبان کے لئے قرآنی رسم الخط کے بجائے ایک جناتی رسم الخط کا تصور آ گیا ہو، جبکہ اس کے بالکل برعکس ہمارے وہ بعض مساٹیر جنہیں دانشوران کہا جاتا ہے، جن کی تعلیمی زندگی قال اللہ وقال الرسول کے زمزمے سے دور تھی، انہوں نے اپنی قومی زبان کو قرآنی رسم الخط میں لکھنے کے لئے سردھڑ کی بازی لگا دی اور اب بھی دے رکھی ہے۔ بہر حال ہمارے اس

سوال کا جواب ابھی تک کہیں سے نہیں ملا کا آیا ہمارے موجد رسم الخط صاحب معذور تھے یا مجبور؟ اور یہی ضرور سچ ہے کہ محترم بڑے پائے کے شہسوار تھے، زخم سے چور دم واپسیں لینے والے، اللہ معلوم کہ مولوی صاحب دنگل سے دور کس جنگل میں اپنے تمام منفرد سروسامان لئے منتظر فردا تھے؟ بچارے اتنے دنوں تک روہنگیا مسلمانوں کی مظلومیت ومعصومیت پر ترس رہے تھے، بالا بالا سنی جارہی تھی کہ ارکان میں وہ روہنگیا مسلمانوں سے بڑھ کر ظالم مگھوں کو زیادہ مظلوم پاتے تھے، تو مرغ بسمل جیسے تڑپ رہے تھے، خدا جانے بات کہاں تک صحیح ہے۔ اور فتوی سازی کا عجیب وغریب سلیقہ تھا، اور انداز بھی بڑا عجیب ونرالا اور حیرت انگیز، لطف یہ ہے کہ ایک طویل مدت تک ارکان کے حوالے سے ان پر فرضیت جہاد کا فتوی صادر کرنا لازم تھا، بعد میں ان کے لئے عدم فرضیت جہاد پر فتوی صادر کرنا لازم ہو گیا تھا، زندگی میں فیصلے بدلنے کا عجیب انداز تھا اور انوکھی ادا تھی، نظر ان کی اتنی عمیق اور اتنی دور رس تھی کہ ارکانی مسلمانوں کی مظلومیت اور معصومیت کی پوری داستان ہی ان کو الٹی اور بدلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ تو اس حوالے سے کیا کہا جائے اور شکایت کروں تو کس سے کروں، افسوس!

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجے فقیہان حرم بے توفیق

رہی ان مولوی صاحب کے بعض حواریوں کی یہ بات: (روہنگیا اس کرۂ ارضی میں ایک علیحدہ قوم ہے، الخ) جس مدعا پر مبنی ہے، ہم اسے سرے سے ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے، ہم کہہ چکے ہیں کہ دینی بنیاد پر ارکان کے مسلمانوں کو ہم دنیا کے دیگر ممالک اور خطے کے مسلمانوں کا ایک اٹوٹ حصہ سمجھتے ہیں، اور سمجھتے ہی رہیں گے، جسے ہم یہاں اس عجالے میں بھی بار بار دہرا رہے ہیں۔ اور قرآن حکیم کا یہ اعلان:

{یا أیها الناس انا خلقناکم من ذکر وأنثی وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا، ان أکرمکم عند اللہ أتقاکم ان اللہ علیم خبیر} الحجرات: ۱۳۔

ترجمہ: لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں، تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔

دراصل اس آیت میں پوری نوع انسانی کوخطاب کرکے اس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے، یعنی نسل، رنگ، زبان، وطن اور قومیت کا تعصب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کرکے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے، جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا گیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور کسی اخلاقی بنیاد پر نہیں، بلکہ اتفاقی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں ان کی بنا ایک خاندان، قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے۔ اور کہیں ایک جغرافیائی خطے میں یا ایک خاص رنگ والی یا خاص ایک زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہونا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے، وہ صرف اس حد تک محدود نہیں رہی کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو کہ ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو، بلکہ اس تمیز نے نفرت، عداوت، تحقیر وتذلیل اور ظلم ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے لئے فلسفے گھڑے گئے، مذاہب ایجاد کئے گئے، قوانین بنائے گئے اور اخلاق کے نام پر غیر اخلاقی اصول وضع کئے گئے ہیں، قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے تو اس حوالے سے کمال کر دیا کہ اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھہرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا، جس کی رو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی، اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھہرائے گئے، اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز کے ذریعے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے گئے، تاریخ ان کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے، یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو بدترین سلوک کیا، اور ایشیا اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کرکے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا، اس کی تہ میں بھی یہ تصور کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان، مال، عزت وآبرو ان پر مباح ہے، اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو جی بھر کے لوٹیں اور من پسند غلام بنائیں، اور ضرورت پڑے تو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالیں۔

مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لئے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے، اس کی بدترین مثالیں پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں دیکھی گئی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور ناڈک نسلیت کی برتری کا تصور پچھلی جنگ عظیم دوم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے، انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے، جس کی اصلاح کے لئے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

اور اس مختصر سی آیت میں اللہ تعالی نے تمام انسانوں کو مخاطب کرکے تین نہایت اہم اور اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

(۱) فرمایا ہے کہ تم سب کی اصل ایک ہے، ایک ہی مرد اور ایک ہی عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے، اور آج تمہاری جتنی بھی نسلیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، وہ درحقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں، جو ایک باپ اور ایک ماں سے شروع ہوئی تھی، اس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اس تفرقے اور اس اونچ نیچ کے لئے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے، جس کے زعم باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے، ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادۂ تخلیق سے تم بنے ہو، ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادے سے بن گئے ہوں، ایک ہی طریقے سے تم پیدا ہوئے ہو، یہ بھی نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کے طریق پیدائش الگ الگ ہوں۔ اور ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو، یہ بھی نہیں ہوا ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں، جن سے دنیا کے مختلف خطوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

(۲) دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہوجانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پوری روئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہوسکتا تھا، نسل بڑھنے کے ساتھ ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں، پھر خاندانوں سے قبائل اور قبائل سے اقوام وجود میں آجائیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ، خد وخال، زبانیں اور طرز بود وماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہوجانے تھے، اور ایک خطے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دور دراز خطوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اس فطری فرق واختلاف کا

تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ اور نیچ، شریف اور کمین، برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کئے جائیں، ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے، ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل وخوار اور حقیر جانیں، ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوق جمائے، اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا، وہ صرف اس لئے کہ ان کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی۔ اسی طریقے سے ایک خاندان، ایک برادری، ایک قبیلے، اور ایک قوم کے لوگ مشترک معاشرت بنا سکتے تھے، اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے معاون و مددگار بن سکتے تھے۔ مگر یہ صرف شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارف کا ذریعہ بنایا تھا، اسے تفاخر و تنافر کا ذریعہ بنالیا گیا، اور نوبت ظلم وعدوان تک پہنچادی گئی۔

(۳) تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے یا ہوسکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے، پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں، کیوں کہ ان کے پیدا کرنے والا ایک ہے، ان کا مادۂ پیدائش اور طریق پیدائش ایک ہی ہے، اور ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے، علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک، قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے، جس میں اس کے اپنے ارادہ وانتخاب اور اس کی اپنی سعی وکوشش کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا، برائیوں سے بچنے والا، اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل، کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو، اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابل قدر ہے۔ اور جس کا حال اس کے برعکس ہو، وہ بہر حال ایک کمتر درجے کا انسان ہے، چاہے وہ کالا ہو یا گورا، مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔

یہی حقائق جو قرآن کی ایک مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر طواف کعبہ کے بعد آپ نے جو تقریر فرمائی، اس میں فرمایا:

{الحمد لله الذی اذهب عنکم عیبة الجاهلیة و تکبرها۔یا ایها الناس، الناس رجلان، بر تقی کریم علی الله، وفاجر شقی هین علی الله۔الناس کلکم بنو آدم، وخلق الله آدم من تراب} (بیهقی فی شعب الایمان، وسنن ترمذی)

ترجمہ: شکر ہے اس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کردیا۔ لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار، جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی، جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر کی جس میں فرمایا:

{ یا أیها الناس، ألا ان ربکم واحد، لا فضل لعربی علی عجمی، ولا لعجمی علی عربی، ولا لأسود علی أحمر، ولا لأحمر علی أسود الا با لتقوی، ان أکرمکم عند الله أتقاکم۔ ألا هل بلغت؟ قالوا بلی یا رسول الله، قال فلیبلغ الشاهد الغائب}(بیهقی)

ترجمہ: لوگو! خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر، اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، مگر تقوی کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ بتاؤ! میں نے تمہیں بات پہنچادی ہے؟ لوگوں نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ! فرمایا: اچھا جو موجود ہے وہ ان لوگوں تک یہ بات پہنچادے جو موجود نہیں ہیں۔

ایک حدیث میں آپ کا ارشاد ہے کہ:

{کلکم بنو آدم و آدم من تراب و لینتهین قوم یفخرون بآبائهم أو لیکونن أهون علی الله من الجعلان}(بزار)

ترجمہ: تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے، لوگ اپنے آباواجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں، ورنہ وہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

{ ان الله لا يسئلكم عن احسابكم و لا عن أنسا بكم يوم القيامة ، ان أكرمكم عند الله أتقاكم}(ابن جریر)

ترجمہ: اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب ونسب نہیں پوچھے گا۔اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جوسب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

ایک اور حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

{ان الله لا ينظر الى صوركم وأموالكم ولكن ينظر الى قلوبكم وأعمالكم} (مسلم۔ابن ماجه)

ترجمہ: اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے مال نہیں دیکھتا، بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔

یہ اسلامی تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک محدود نہیں رہی ہیں، بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہل ایمان کی ایک عالم گیر برادری عملا قائم کر کے دکھا دی ہے،جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں،جس میں اونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق وتعصب کا کوئی تصور نہیں،جس میں شریک ہونے والے تمام انسان،خواہ وہ کسی نسل وقوم اور ملک ووطن سے تعلق رکھتے ہوں، بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں، اور ہوئے بھی ہیں، اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے، اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی مذہب اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، اور نہ کبھی پائی گئی ہے،صرف اورصرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک ہی امت بنا دیا ہے۔

اسی لئے ہم کہنا چاہتے ہیں کہ ارکان کے یہ روہنگیا مسلمان دنیا کے دیگر مسلمانوں کا ایک حصہ ہے، اور اسلام نے مسلمانوں کے مابین جو رشتہ جوڑ دیا ہے اسے ہم توڑنا نہیں چاہتے، بلکہ اسے مزید پائدار کرنا چاہتے ہیں، یوں ہم عربی رسم الخط کو اپنی قومی زبان کا رسم الخط بنا کر پوری مسلم امت کے ساتھ ہمارا رشتہ جڑے رکھنا چاہتے ہیں، اور زبان ورسم الخط کے حوالے سے جس پر امت کی وحدت کا مدار

ہے، جیسے امت مسلمہ کی سب سے بڑی اور بین الاقوامی تنظیم کی قرارداد بتا رہی ہے، ویسے ہم عربی زبان اور رسم الخط کے حوالے سے مسلم امۃ کی بین الاقوامی تنظیم''منظمۃ التضامن الاسلامی'' کی قرارداد بتاریخ ۸ر ۴ر ۱۹۷۷ء کی بھرپور حمایت کرتے ہیں،جس کا نص یہ ہے:

{الحروف العربية: يؤكد المؤتمر على ضرورة الحفاظ على الحروف العربية لكتابة لغات الشعوب الاسلامية حتى لا يباعد بين هذه الشعوب وبين القرآن الكريم}توصيات المؤتمر، ص ۲۵۔

اور ایک دوسری قرارداد بھی ملاحظہ کیجئے:

{ ولما كانت المحافظة على الحرف العربي بشكله و رسمه واجبا مقدسا، يجب أن تلتزم به الدول الاسلامية، مما يستوجب على الدول الاسلامية التي اعتمدت حرفا آخر غير الحرف العربي لكتابة لغاتها، وكذلك الدول التي تفكر في اتخاذ مثل هذه الخطوة، اعادة النظر في هذا الأمر}توصيات المؤتمر، ص ۹۹۔

(۵) عربی رسم الخط کے حامی مفکرین:

اللہ تعالی کا خاص کرم ہے کہ اس منتشر اور دل دوز حالات میں بھی روہنگیا مسلمانوں کا ایک نباض، رمز شناس، دور بین اور دردمند طبقہ بھی ہے،جس کا کہنا ہے کہ روہنگیا مسلمانوں کی ایک علیحدہ زبان ہے اور ضرور ہے، جہاں تک اس کے رسم الخط کا تعلق ہے، وہ عربی ہی ہونا ضروری ہے، ظاہر ہے کہ عربی رسم الخط ایک ایسا رسم الخط ہے،جس کا سروعلن، پیچ وخم،اور رسم وراہ علمی،فکری، دینی اور روحانی اعتبار سے مکمل طور پر اسلام،قرآن وسنت اور مسلمانوں کی دینی روایات سے مربوط ہے، پوری اسلامی تاریخ شاہد ہے کہ مسلمانوں کو اس راہ ورسم سے علیحدہ کر کے منتشر اور سراسیمہ کرنے کے لئے زوردار ایک عالمی سازش پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ چلی اور چل رہی ہے۔جس کی سینکڑوں مثالیں ہیں،اور جس کی تفصیلات کے لئے ایک علیحدہ کوشش کی ضرورت ہے، یہ عجالہ اس کا متحمل نہیں۔

ماضی میں ایک سے زیادہ مسلم قوموں اور اسلامی ملکوں کی زبانیں اس عالمی سازش کی شکار ہوگئی ہیں، جن میں ترکی زبان سرفہرست ہے،ان سازش خوردہ اسلامی زبانوں کے علاوہ میرے علم کے مطابق تمام

کے تمام مسلم ملکوں اور خطوں کی زبانیں جو بھی ہوں مگر ان کا رسم الخط عربی ہے، ہمارے ان مفکرین کا مطالبہ بلکہ مطالبہ سے بڑھ کر حقیقت پر مبنی یہ نظریہ ہے کہ اگر مسلمانوں کو اپنے ماضی سے، دین سے، قدیم مگر روشن تہذیب وثقافت اور روایات سے رشتہ بحال رکھنا ہے تو ان کی زبان کا رسم الخط قرآنی رسم الخط ہونا ضروری ہے، اس لازوال اصول کے تناظر میں ویسے مسلمانان ارکان چونکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک حصہ ہیں، ان کی زبان کا رسم الخط بھی عربی ہونا لازم ہے، جو ظاہر ہے کہ ایک عالمی، خالص دینی، روحانی اور زندہ ثقافتی رسم الخط ہے، اگر مسلمانان ارکان دنیا بھر کے مسلمانوں کا حصہ بن کر رہنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ عربی رسم الخط میں ان کی زبان کو لکھا جائے، ورنہ معاذ اللہ ان کا دینی، روحانی اور ثقافتی رشتہ اسلام سے کٹ کر رہ جانے کا شدید اندیشہ ہے، بلکہ بعض مفکرین کے نزدیک اندیشہ سے بڑھ کر اسلام سے رشتہ کٹ جانا یقینی ہے، ویسے عربی رسم الخط کی طرف اس طبقہ کا رجحان دینی، ثقافتی، علمی اور فکری ہے، جو علمی، دینی اور روحانی اعتبار سے بھی بڑا معنی خیز ہے۔ اور:

(الف) ہمارے عربی رسم الخط کے حامی مفکرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہمیں یعنی ارکانی مسلمانوں کو اسلامی روایات واقدار سے ہر حالت میں وابستہ رہنا ہے، ہم مسلمانوں کو قرآنی زبان اور رسم الخط کا سیکھنا سکھانا ویسے بھی دینی اعتبار سے ضروری ہے، اور تو اور ہم اپنے بچوں کی تعلیمی شروعات ہی اسی سے کرتے ہیں، جو نہ صرف ہم ارکانی مسلمانوں کی ملی وقومی روایت ہے، بلکہ یہی روایت پوری امت مسلمہ کی مشترکہ روایت بھی ہے، اور ظاہر ہے کہ قرآنی رسم الخط اور قرآنی زبان کے سیکھے بغیر قرآن و سنت اور اسلامی لٹریچر سے استفادہ ممکنات سے نہیں ہے، اسی لئے ہم مسلمان اپنی اولاد کو شروع ہی میں اسلامی یعنی قرآنی رسم الخط کی تعلیم دیتے ہیں، ویسے ہماری قومی زبان کا رسم الخط بھی اگر قرآنی رسم الخط پر مبنی ہو تو ایک تیر سے دو نشانے (ہدف) حاصل ہو جائیں گے، یعنی قرآنی رسم الخط کے سیکھنے کے ساتھ ساتھ قومی رسم الخط بھی خود بخود حاصل ہو جائے گا، اور قرآنی رسم الخط کے سیکھنے کے بعد بطور خاص ہمارے بچوں کے لئے قومی زبان کا پڑھنا آسان بلکہ آسان تر ہو جائے گا، جس طرح پاکستان، افغانستان، ایران سمیت دنیا کی بیشتر مسلم قوموں اور اسلامی زبانوں کا حال ہے، البتہ اس ضمن میں یہ الگ بات ہے کہ زبان پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے ضرورت کی بنیاد پر چند ایک حروف اور رموز

کا اضافہ ہو سکتا ہے، جس طرح اردو اور فارسی وغیرہ کی حالت ہے، اور میرے ناقص علم کے مطابق دنیا بھر کی کسی بھی اسلامی زبان میں، جن کا رسم الخط عربی ہے، قرآنی حروف میں کمی نہیں کی گئی، شاید اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی ہو، یوں روہنگیا رسم الخط کے لئے بھی اس تعمیری انداز میں سوچا جا سکتا ہے، اسی سے کم سے کم ہمارے بچوں کو دو فائدے ہوں گے:

☆قرآنی حروف جو ہماری تعلیم کے حوالے سے ہر اعتبار سے بنیاد ہیں، حاصل ہو جائیں گے۔ اور

☆ان قرآنی حروف کے حصول کے ساتھ ساتھ، ہماری قومی زبان کے حروف بھی خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔

بخلاف اس کے ہمارے لئے دو زبان یعنی مذہبی زبان اور قومی زبان کے حصول کے لئے دو مختلف قسم اور دو متنوع طرز تعمیر کے حروف کا حصول لازم ہو جائے گا، جو ایک بڑا بوجھ ہونے کے علاوہ، اس کی وجہ سے انگنت پیچیدگیوں اور مشکلات کا سامنا یقینی ہے، اس کے لئے دور جانے کی ضرورت نہیں، سمجھنے کے لئے بنگلا زبان اور لٹریچر ہمارے سامنے ہے۔ یہ ایک اہم موضوع ہے، جس کی تفصیلات پر جانا سر دست ممکن نہیں۔ بہر کیف عربی رسم الخط کے حامی ہمارے ان مفکرین کی اس تعمیری فکر پر ایک سرسری نظر ہی اس بات کے لئے کافی ہے کہ روہنگیا رسم الخط کا عربی میں ہونا کتنا اہم ہے۔ اگر کوئی کج فہم، موٹی عقل، اور ضدی مزاج کا انسان نہ ہو، تو اس واضح اور تعمیری بات کو سمجھنے کے لئے بڑی امعان نظر اور خاص غور وفکر کی ضرورت نہیں ہوگی۔

(ب) ادھر اور ایک نقطۂ نظر سے سوچا جائے تو ایک کھلی ہوئی بات حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے کہ امت مسلمہ کے زوال واضمحلال کا بنیادی سبب ہی اسلامی تعلیمات سے روگردانی ہے، مسلمان ایک قوم ہے، عالمی قوم، ایک مسلمان جس ملک یا جس خطے میں ہو، اس کا جینا مرنا اس تصور پر مبنی ہونا چاہئے کہ وہ عالمی مسلم برادری کا ایک فرد ہے، اس حوالے سے شاعر مشرق کا کہنا ہے کہ:

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

مسلمان ایک عالمی قوم ہے، تو ایک عالمی قوم کے لئے ایک عالمی تہذیب وثقافت کے ساتھ پوری یک جہتی اور مکمل ہم آہنگی ایک لازمی امر ہے۔ اور رسم الخط کا جہاں تک تعلق ہے، یہ ایک تہذیب اور

ایک ثقافت کے لئے سب سے بڑا اور بنیادی عنصر ہوتا ہے، تو ایک مسلم قوم اپنی اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینی اقدار وروایات سے بچھڑنا چاہتی ہے تو اس کے لئے کافی ہے کہ اسلامی رسم الخط کو چھوڑ کر دوسرے کسی رسم الخط کو اپنا لیا جائے۔ زبان ورسم الخط کے حوالے سے اسلامی ثقافت اور دینی روایات کا کامل مدار وانحصار ہی قرآنی رسم الخط پر ہے۔ ادھر جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو اس عالمی مذہبی زبان اور عالمی قرآنی رسم الخط سے فارغ کر کے دوسرے رسم الخطوں کی طرف ابھارلانے کی ایک عالمی سازش بین الاقوامی سطح پر چلی اور اب بھی چل رہی ہے، اب کیا ہم سوچے سمجھے اور شعوری طور پر اس عالمی سازش کے شکار ہونے کے لئے تیار ہیں؟ کیا ہم ترکی کی طرح لاطینی اور ہمارے بنگلا باسیوں کی طرح بنگلا رسم الخط (جس کی بنیاد وآساس دیوناگری پر ہے) کو اپنا کر ہمیشہ کے لئے اسلامی رسم الخط سے ناطہ توڑنا چاہتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ میرا اتنا یقین ہے کہ مسلمانان ارکان کتنے ہی مظلوم اور بے کس و بے بس ہی سہی، اس عالمی سازش کے شکار کبھی نہیں ہوں گے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس بلا سے محفوظ رکھے، آمین یارب العالمین۔

(ج) ہمارے بعض حضرات کا دعوی ہے کہ ارکان میں جتنے بنگلا زبان میں طبع آزمائی کرنے والے شعراء اور انشاء پرداز تھے، ان کے سارے دواوین اور تمام تصانیف حالیہ بنگالی رسم الخط ہی میں تھیں، جبکہ ان حضرات کے دعوے کے برخلاف بہت ساری چیزیں بطور دستاویزات کے ایسی بھی پائی گئیں کہ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ان شعراء اور انشاء پردازوں نے عربی رسم الخط میں طبع آزمائی کی اور جولانی قلم دکھائی تھی، اس سلسلے میں سرزمین ارکان کے عظیم شاعر حضرت شاہ علاول، قاضی دولت، سید سلطان سمیت دیگر شعراء وادباء کی تحریریں دریافت ہوگئی ہیں، اب مسلمانان ارکان اپنے تابناک ماضی اور اپنی روشن روایات سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہونا چاہیں تو الگ بات، اگر ان سے رشتہ بحال رکھنا چاہیں تو ان کے لئے ضروری ہے کہ اپنی روایات کی یاد تازہ رکھتے ہوئے عربی رسم الخط کو اپنا کر اپنی قومی وملی روایات کو زندگی بخش دیں۔

(د) یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ روہنگیا زبان میں عربی الفاظ کا بھرمار ہے، ان عربی الفاظ کو عربی رسم الخط میں لکھنے کے بجائے دیگر کسی رسم الخط میں لکھا جائے تو تلفظ کے ساتھ ساتھ ان کی اصلی شکل اور ہیئت بھی بدل

جانے یا کم سے کم غیر واضح ہوجانے کا شدید اندیشہ ہے، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی کسی عربی لفظ اور اس کے مطلب سے بخوبی واقف ہے، مگر یہ لفظ کسی دوسرے رسم الخط میں ہونے کی وجہ سے یا یوں کہئے کہ اس لفظ کے تلفظ یا ادائیگی میں افراط وتفریط ہونے کی وجہ سے اس کو پتہ بھی نہیں چل رہا ہوگا کہ یہ وہی عربی لفظ ہے، جس کے معنی ومطلب سے وہ واقف ہے۔ پریشانی کا یہی عالم آج ہم بنگلا زبان میں دیکھ رہے ہیں، عوام تو خیر عوام، حد تو یہ ہے کہ بعض اہل علم ودانش بھی اس قسم کی غلطیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ بہر حال روہنگیا زبان کو عربی کے بغیر کسی دوسرے رسم الخط میں لکھنے کی وجہ سے اور بھی انگنت پریشانیاں لاحق ہوسکتی ہیں۔

پھر بعض حلقوں یا کچھ لوگوں کی طرف سے یہ جو مطالبہ کیا جارہا ہے کہ روہنگیا زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کے لئے ماضی میں جن چند بزرگوں نے کوششیں کیں، اور حال میں بھی چند قابل صد احترام حضرات اور کچھ گروہیں اور جماعتیں اس حوالے سے جد وجہد کر رہی ہیں، اور ہر ایک حضرات اپنے اپنے طرز تعمیر کے کچھ قواعد اور رموز وغیرے سامنے لائے ہیں، ان کو یکجا کر کے غور وفکر کے ساتھ ان میں سے معقول اور کام کی چیزیں منتخب کی جائیں، ورنہ قوم کسے لے گی اور کسے چھوڑے گی؟ ایسا تو ممکن نہیں کہ سب کو لے گی یا سب کو چھوڑ دے گی۔ میرے خیال میں ان کا یہ مطالبہ بڑا وزن رکھتا ہے۔ لیکن ان کے اس مطالبہ پر عرض ہے کہ: کچھ کام دنیا میں ایسے بھی ہوتے ہیں (شاید سارے کام بھی ہوں) کہ جن کے لئے موزون وقت کی ضرورت ہوتی ہے، بعض ضروری اور مفید کام بھی وقت پر نہ ہونے کی وجہ سے ناکامی اور نامرادی کے شکار ہوجاتے ہیں، اور وقت کا جہاں تک تعلق ہے، یہ ماضی، حال، اور مستقبل سبھی پر مبنی ہوسکتا ہے، مطلب یہ ہے کہ جس طرح ماضی اور حال کا کام مستقبل کے لئے ٹالا نہیں جاسکتا، ٹھیک اسی طرح مستقبل کا کام جلد بازی پر مبنی ایک منفعلانہ انداز میں حال میں کرنا وقت سے پہلے ہونے کی وجہ سے مفید نہیں ہوسکتا، بلکہ مضر ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ بطور خاص میرے خیال میں زبان ورسم الخط جیسے کاموں کو اپنی طبیعت پر چلنے دینا چاہئے، خواہ مخواہ وقت سے پہلے بزور قوت کرنے کی آرزو کچھ مفید ہونے کے برعکس مضر ہوسکتی ہے۔ غرض بنیادی طور پر رسم الخط عربی میں ہونا ہی کافی ہے، ہر ایک کو اپنے مطابق کام کرنے دیجئے، اور ان کو اس کام میں تعاون بھی کیا جائے۔ ایک موزون وقت انشاء اللہ آئے گا کہ ان تمام محسنوں کی کوششیں بارآور ثابت ہوں گی

،خلاصے نکل آئیں گے، ان میں سے چھلکے چھوڑے گودے لئے جائیں گے۔ میرے ناقص خیال میں سردست اس حوالے سے جلد بازی کی تھوڑی ضرورت نہیں۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ اب تک قومی سطح پر اس بات کا فیصلہ تو نہیں ہوا ہے کہ روہنگیا زبان کو کس رسم الخط میں لکھا جائے گا۔ تو عربی رسم الخط کے حوالے سے سردست ضرورت اس بات کی ہے کہ:

(۶) کچھ تجاویز:

(۱) روہنگیا زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی جو تحریک ہماری برادری میں پائی جاتی ہے، اسے منصوبہ بندی کے ساتھ تیز سے تیز تر کیا جائے، اور یاد رہے کہ یہ دنیا ایک مسابقہ کی دنیا ہے، یہاں زندگی کے دوڑ میں جو آگے نکل جاتا یا جا سکتا ہے، جیت اسی کی ہوتی ہے، حق و باطل کے اس مقابلے میں کبھی کبھار باطل کی جیت اس لئے بھی ہو جاتی ہے کہ مسابقت کے میدان میں باطل کا دوڑ زیادہ تیز تھا۔

(۲) اسلامی تعلیمات کی گہرائیوں سے واقف، نباض، دور اندیش اور مستعد افراد پر مشتمل ایک قومی سطح کی کمیٹی کی تشکیل دی جائے، جو متعلقہ امور کو بخوبی انجام دے سکے۔

(۳) عربی رسم الخط کے حامیوں پر مشتمل مناسب موقع ومحل میں ایک قومی سطح کی کانفرس بلائی جائے، جس میں متعلقہ مسائل پر غور وخوض کے بعد ایک منصوبہ بندی کے تحت طریقۂ کار اور لائحۂ عمل مرتب ہو۔

بہر بات کہاں سے چلی اور کہاں جا پہنچی ہے، اب کہنا یہی ہے کہ نہ جانے مولانا راغب صاحب کے ذہن رسا میں عربی والی حقیقتیں کیوں نہیں آئیں؟ اور ایک عالم وفاضل ہو کر آپ نے عربی رسم الخط کو کیوں چھوڑا، اور روہنگیا مسلمانوں کے لئے ایک غیر معقول اور نامانوس حرف وضع کرنے پر تل گئے تھے؟ لوگ کہتے ہیں کہ آپ ایک ذہین آدمی تھے، لیکن نہ جانے کس منحوس اور بدبخت کی نظر آپ پر لگ گئی تھی، آپ کی تقریبا ساری سرگرمیاں ناکامی اور نامرادی اور فضولیات سے عبارت ہو چکی ہیں۔

یہاں ایک بات بتاؤں تو کسی کو بری تو نہیں لگے گی؟ کہتے ہیں کہ انسان کی زندگی پر نام کا اثر پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ مولانا کا نام محمد حنیف ہے، جو حنف سے مشتق ہے، عربی میں اس کا معنی ہٹنے، ٹیڑھا ہونے، جھکنے اور موڑنے کے ہیں، اور گستاخی معاف کہ سریانی میں اس کا معنی ’’کافر‘‘ اور عبرانی میں ’’

منافق‘‘ ہے(۱) خدارا کوئی یہ نہ سمجھے کہ آخر الذکر دونوں الفاظ کو میں مولانا حنیف صاحب پر چسپاں کرنا چاہتا ہوں، میں ان کو ایک مسلمان، عالم وفاضل، پکے حنفی المسلک اور دیوبندی المشرب انسان جانتا ہوں، یہاں لفظ کی تحقیق پر دراصل یہ الفاظ آگئے ہیں، اس کے عکس اور کوئی مقصد یہاں کارفرما نہیں، جب کہ ظاہر ہے کہ ہم مسلمان ہیں، ہمیں یہاں سریانی اور عبرانی سے وہ تعلق ہرگز نہیں جو عربی سے ہے۔ یوں عرب کے جو نیک دل شرفاء تھے وہ اس وقت عرب میں پائے جانے والے تمام مذاہب یہودیت، نصرانیت بشمول بت پرستی کے تمام مفاسد سے گھبرا کر کسی صحیح مذہب کی جستجو میں نکلتے تھے، وہ بالآخر اسی آستانۂ حنیف پر آکر اپنے دل کا اطمینان اور تسلی محسوس کرتے تھے۔

عربی زبان میں یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ایک اعتبار سے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر یا مڑ کر یا ہٹ کر دوسری طرف چلا جائے، اگر کسی شخص کو یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر یا اچھے اعمال سے مڑ کر بری بات یا برے اعمال کو اختیار کر لیا تو لفظ حنیف کا معنی ایک منفی معنی ہو جائے گا، جب کہ اس کے برخلاف اگر یہ سمجھا جائے کہ بری بات اور برے اعمال کو ترک کر کے اس نے اچھی بات یا اچھے اعمال کو پسند کر لیا تو اس کا معنی وہی مفہوم ہوگا، جو اہل عرب سمجھتے ہیں، یعنی متدین، خدا پرست اور خدا ترس انسان۔

اس بناء پر اس لفظ کے اچھے برے مفہوم کی تعیین اور موقع استعمال حروف صلہ سے ہوگا، دراصل اس لفظ کا ابتدائی استعمال للہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا، جیسا کہ الحنیف للہ، جس کا معنی ہے خدا کی طرف جھکنے والا، لیکن بعد میں کثرت استعمال اور زبان زدگئ عام سے اس قید کی سرے سے ضرورت نہیں رہی، اور مطلق حنیف کو جھکنے والا سمجھا جانے لگا، چنانچہ قرآن حکیم میں اس لفظ کا دونوں طرح استعمال ہوا ہے، اس حولے سے سورۃ الحج اور سورہ البینۃ ملاحظہ کیجئے۔

دراصل بات یہ ہے کہ قرآن کریم میں تذکرہ شدہ ایک قوم ’’صابی‘‘ میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی، آپ علیہ السلام نے دلائل واعمال سے ان صابیوں کے مذہب کی تردید کی تھی، باطل پرستیوں سے سخت تنفر کا اظہار کر کے خدائے برحق پر اپنے ایمان کامل کا برملا اعلان کیا تھا، آپ علیہ

---

(۱) ملاحظہ ہو: مارگولیوتھ کی تصنیف: لائف آف محمد، ص:۱۱۶۔

السلام نے بذاتِ خود یا بعد میں آپ پر ایمان لانے والوں نے اپنا لقب ''حنیف'' اختیار کیا تھا، یعنی باطل پرستیوں سے مڑ کر خدائے وحدہ لاشریک لہ پرستی طرف آنے والا، چنانچہ اس دعوی کی صحت قرآن کریم کی اس آیت سے پائی جاتی ہے:

''قال یا قومی انی بری مما تشرکون ، انی وجهت وجهی للذی فطر السماوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین (سورة الانعام)

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا یہ اعلان دین ابراہیمی کا پہلا واقعہ ہے، جس کی یہ عبارت ہے کہ'' میں ہر طرف سے منہ موڑ کر خالق ارض وسماء کی طرف منہ کرتا ہوں، اور اس کے بعد یہ کہنا کہ'' حنیف بن کر'' جس کا صاف وشفاف معنی ومطلب ''**انی وجهت وجهی للذی فطر السماوات والارض**'' ہے قرآن کریم کے بہت سارے مقامات میں یہ لفظ آیا ہے، اور وہی مؤخر الذکر معنی مراد لیا گیا ہے، اور ان آیتوں سے یہی بات ثابت ہوتی ہے کہ یہ مذہب ابراہیمی کا نام تھا، اور انہی کی یادگار کے بطور ظہور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد باقی رہ گئی تھی، اور ظہور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہود ونصاری کہتے تھے کہ برحق تو یہودیت یا نصرانیت ہے، ابھی یہ کون سا تیسرا مذہب ہے، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہیں سکھا رہے ہیں؟ تو قرآن کریم نے اس کا جواب یوں دیا ہے کہ:

{قل بل ملة ابراهيم حنيفا، وما كان من المشركين} (البقرة)

اسی طرح سورۂ آل عمران میں آیا ہے کہ:

{ما كان ابراهيم يهوديا ولا نصرانيا، ولكن كان حنيفامسلما، وما كان من المشركين} (آل عمران)

آغاز اسلام میں حق پسند نیک لوگوں کے نام ''حنفاء'' کے لقب سے لئے جاتے تھے، اگرچہ وہ خود اپنے مذہب سے واقف نہیں تھے، تاہم حق کے متلاشی ضرور تھے، جن میں قس بن ساعدہ، ورقہ بن نوفل، عثمان بن حویرث، امیہ بن صلت، زید بن عمرو بن نفیل، قیس بن نشبہ اور عبداللہ بن جحش وغیرہ تھے، جو عربوں کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حق کی راہ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ایک روایت کے

مطابق عیسائی ہو گئے تھے۔

لفظ حنیف پر اتنی تفصیلی بات سے میرا مدعا یہی ہے کہ جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ عربی میں یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنوں میں مستعمل ہے، تو ظاہر ہے کہ مولانا محمد حنیف صاحب ایک عالم تھے، بالطبع ان سے عربی رسم الخط کی حمایت کی امید تھی، اور امید کی جا سکتی تھی، لیکن انہوں نے غیر متوقع طور پر ایک رسم الخط نما چیز سامنے لا کر ہماری امیدوں پر نہ صرف پانی پھیر دیا، بلکہ مسلمانان ارکان کو ایک بڑے فتنے میں ڈال دیا ہے، اب فیصلہ ناظرین وقارئین کرام کے ہاتھ میں ہے، آیا اس رسم الخط کے حوالے سے مولانا نے بھلائی سے برائی کی طرف مڑنے اور جھکنے کو پسند کیا تھا یا برائی سے بھلائی طرف؟

ادھر طرفہ دیکھئے کہ مولانا حنیف صاحب کے برعکس ماسٹر محمد سلطان نلبنوی اور ان کے رفقائے کار اٹھے، جنہوں نے روہنگیا زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کو ضروری سمجھا، اور اس حوالے سے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے، انہوں نے روہنگیا مسلمانوں کی زبان کو اسلام اور ماضی سے جڑ نے کی بساط بھر کوشش کی، بہت ساری ضروری کتابیں اور رسائل کا ترجمہ کروایا، جن میں امام نووی کی ''اربعین'' قابل ذکر ہے، جو'' والڈ ایسوسی ایشن فار مسلم یوتھ'' (WAMY) کے مالی تعاون سے چھپ کر منظر عام پر آ چکی ہے، اس سلسلے میں ہمارے قابل قدر عالم دین حضرت مولانا ولایت حسین صاحب ارکانی اور ان جیسے دیگر علمائے کرام اور دانشوران عظام بھی شکر و سپاس کے مستحق ہیں، جنہوں نے ماسٹر سلطان احمد نلبنوی کی طرح اس حوالے سے نمایاں خدمات انجام دیں، اور اپنے دینی وثقافتی فریضے سے عہدہ برآ ہوئے۔

بہر حال جس طرح پچھلی سطور میں عرض کی گئی ہے کہ مولانا محمد حنیف راغب صاحب حجاز مقدس سے ۱۹۸۴ء میں بنگلا دیش پہنچے، اور سافرانگ ٹیکناف کے مقام پر'' دار التربیۃ الاسلامیہ'' کے نام سے ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی۔ راقم سطور کے خیال میں یہ ان کے لئے ایک اچھا، موزون اور برمحل کام تھا، لیکن سال دو سال گزرتے نہ گزرتے آپ نے اسے چھوڑ چھاڑ کر میدان سیاست وقیادت کی راہ لی، میرے خیال میں یہ ضرورت تھی کہ مولانا دار التربیہ الاسلامیہ میں بیٹھ کر افرادی قوت کی تیاری میں

مگن رہتے، جو آئندہ جا کر کام کے لئے پتے کی ہوتی، لیکن افسوس ہے کہ آپ نے بڑے جذباتی انداز میں اور وقت سے پہلے کسی بھی بنیادی تیاری کے بغیر ''اتحاد المجاہدین'' نامی تنظیم کا اعلان کر دیا، اس حوالے سے ہمارے سیاسی اور انقلابی ماحول میں کافی چہ میگوئیاں ہوئیں، چنانچہ مولانا حافظ محمد صدیق صاحب اس اتحاد المجاہدین کی تاسیس اور ان کے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

''بہر حال اسی مقصد کے تحت حرکۃ الجہاد الاسلامی العالمی کے مرکزی امیر محترم مولانا قاری سیف اللہ اختر ۱۹۸۷ء کے اوائل میں بنگلا دیش گئے اور اس کے بعد مولانا عبد الصمد سیال گئے، صلاح ومشورہ اور اتفاق رائے سے مولانا محمد حنیف راغب کو ممکنہ متوقع جماعت کے امیر بنانے کا فیصلہ ہو گیا اور مولانا بھی تیار ہو گئے۔

مولانا موصوف کو ایک وقت دیا گیا کہ آپ وقت کے اندر اندر پاکستان تشریف لے آئیں، لیکن مولانا وقت مقررہ پر نہ پہنچ سکے، اس لئے حرکۃ الجہاد الاسلامی العالمی کے قائدین نے مشورہ کے بعد حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان (برما) کے نام سے ایک جماعت کی تشکیل کر دی، جس کے امیر مولانا عبد القدوس صاحب کو چنا گیا۔

مولانا عبد القدوس مجاہد کو امیر چنے جانے کی وجہ سے مولانا حنیف اور مولانا عبد القدوس کے درمیان کشیدگی شروع ہو گئی تھی، فاصلہ بڑھتا رہا، بالآخر انہوں نے تنظیم المجاہدین کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد ڈالی، جسے بعد میں اتحاد المجاہدین کا نام دیا گیا۔ غالباً ۱۹۸۸ء میں اس کی بنیاد پڑی''۔

اتحاد المجاہدین کے اعلان کے بعد مولانا راغب صاحب قدرے حساس اور فعال دیکھے گئے، لیکن ان کے ساتھ کام کرنے والے لوگوں میں مستعد، قابل اور برمحل رجال کی بڑی شدت سے کمی دیکھی گئی تھی، جس کا خمیازہ نہ صرف آپ کو بلکہ ان کی تنظیم کی شکل میں علمائے ارکان کو بھی بھگتنا پڑا۔

مولانا راغب صاحب نے اعلان کیا تھا کہ مذکورہ ان کی تنظیم کے وہ امیر نہیں، بلکہ آپ نائب کی حیثیت سے کام کرتے ہیں، جب کہ امارت عظمی ارکان کے اس زمانے کے چار معتبر علماء دین کے ہاتھ میں ہے، جنہیں وہ یا ان کے حواریوں نے مشائخ اربع کا نام دیا تھا۔

مولانا نے شونا فارہ کوکس بازار کے مقام پر ایک معسکر کی بنیاد بھی رکھی تھی، جس میں جہادی تربیتی پروگرام بھی ہوا کرتے تھے، لیکن افسوس ہے کہ اس معسکر کے قیام کے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے اس پر محترم نور الاسلام صاحب کی قیادت میں چلنے والی تنظیم ''ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کے چند مجاہدین نے حملہ کر دیا، اور اتحاد المجاہدین کے سارے سروسامان اٹھا کر لے گئے، اس میں ایک قابل ذکر بات یہی ہے کہ جہاں تک بعد میں معلوم ہوا کہ مذکورہ حملہ محترم نور الاسلام صاحب کے انجانے میں ہوا تھا، دراں حالیکہ آپ سعودی عرب کے دورے پر تھے، ان کی لاعلمی اور غیر موجودگی میں رشید بامونگ شیل گھاٹوی اور محمد ایوب خائندہ فاروی کی سرکردگی میں اتحا المجاہدین کے معسکر پر حملہ کیا گیا تھا، جس کا بین ثبوت یہ ہے کہ نور الاسلام صاحب نے اس دورے سے واپسی کے فوراً بعد اتحاد کے جملہ سروسامان واپس کر دیا، اور بذات خود چند احباب اور رفقائے کار سمیت اتحاد کے معسکر کی زیارت کی، جہاں انہوں نے مولانا راغب کی موجودگی میں ایک معذرتی تقریر بھی کی تھی۔

اس کے چند مہینے گزرتے نہ گزرتے اتحاد المجاہدین کے تقریباً سارے مجاہدین مولانا راغب صاحب سے بگڑ کر روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) میں شامل ہو گئے، دراں حالیکہ مؤخر الذکر اس تنظیم کی قیادت درج ذیل حضرات کر رہے تھے:

۔ الحاج سلیم احمد صاحب خیر فاروی، منگڈوی۔

۲۔ مولانا محمد کبیر صاحب خواندنگی، بوسیدنگی۔

۳۔ مولانا حسین احمد ابو الفضل صاحب لمبابیلوی، بوسیدنگی۔

۴۔ الحاج جناب محمد اسلام صاحب اکیابی۔

۵۔ الحاج جناب انعام اللہ صاحب کیلادنگی، منگڈوی۔

بعد میں ارایل او والوں نے اتحاد المجاہدین کے سارے سروسامان پر مکمل قبضہ کر کے اس کے تمام مجاہدین کو ان کی تنظیم سے باہر کر دیا، تاہم یہ ایک الگ بات ہے کہ ارایل او کے تقریباً تمام مجاہدین نے برمی فوجی حکام کے سامنے ہتھیار ڈال دیا تھا۔

مولانا محمد حنیف صاحب اس مذکورہ حاشہ کے بعد بڑے پریشان حال مارے مارے پھرتے رہے

تھے، اس دوران آپ کو ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ نے بعض الزامات کے تحت گرفتار بھی کرلیا، اس گرفتاری میں مولانا کے ساتھ جناب محمد اقبال صاحب باغگونوی، منگڈوی بھی تھے، جواب ولایات متحدہ امریکہ میں مقیم ہیں، لیکن چند دن کے بعد بعض علمائے ارکان و بنگلادیش (جن میں حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب نا قابل فراموش ہیں) کی کوشش اور سفارش پر ملا نا اور ان کے مذکورہ ساتھی کو رہائی ملی تھی۔

پھر اگلے چند سال کے بعد حرکۃ الجہاد الاسلامی ارکان سے مل کر مولانا راغب صاحب نے اور ایک تنظیم ''جنود الاسلام'' کی بھی بنیاد ڈالی تھی، لیکن آپ وہیں بھی نہیں رہ سکے، اور اس جنود الاسلام سے بھی علیحدگی کے ساتھ آپ کی جہادی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد ارکان کے مسائل کے حوالے سے مولانا نے دو مختصر رسالے لکھے، جن پر تبصرہ کسی دوسرے موقع پر انشاءاللہ ضرور کیا جائے گا۔

مولانا راغب صاحب کے اس کے بعد کے حالات پر مشتمل مولانا حافظ محمد صدیق صاحب کے مندرجہ اقتباس سے کچھ باتیں ملاحظہ کیجئے کہ:

''اس امر کا ذکر ضروری ہے کہ مولانا موصوف ارکان کے ایک ممتاز عالم دین، صاحب بصیرت فرد، ذہانت وفطانت کے مالک شخص، سیاسی وحرکی انسان، ماہر مدرس ومعلم اور معقولات پر عبور رکھنے والے فاضل ہیں، یہ جب ۲۰۰۵ء کے لگ بھگ سعودی عرب کے دورے پر گئے، تو وہاں کے طلباء اور نام نہاد علماء کو قریب سے دیکھا، جو سلفی، نام نہاد اہل حدیث اور غیر مقلد بن گئے تھے۔

یہ لوگ صبح وشام امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ، دیوبندی علماء واکابرین، ارکان برما اور ہندو پاک کے فضلاء کو بے حد برا بھلا کہتے ہیں، تقلید کو حرام قرار دیتے ہیں، دیوبندی علماء اور عوام کو مشرک کہتے ہیں، فقہ کو نجس قرار دیتے ہیں، رفع یدین، آمین بالجہر اور امام کے پیچھے قرآت سورۂ فاتحہ کو ضروری قرار دیتے ہیں، مغرب کی آذان کے فوراً بعد دو رکعت نفل نماز کو لابدی قرار دیتے ہیں، جمعہ کے دن عربی خطبے کے دوران دو رکعت نفل کو دین کا حصہ قرار دیتے ہیں، حنفی نماز وتر (تین رکعتیں) کو

خلاف شرع کہتے ہیں، دیوبندی اور تبلیغی جماعت کو اہل سنت والجماعت سے خارج قرار دیتے ہیں، اور امریکہ واسرائیل اور یہود ونصاری کو چھوڑ کر حنفی علماء، دیوبندی اکابرین اور مقلدین کے خلاف جہاد کو فرض قرار دیتے ہیں۔

یہ کوئی افسانہ نہیں ہے بلکہ اظہار حقیقت ہے، کیوں کہ راقم الحروف ۱۹۹۹ء میں چار ماہ اور ۲۰۱۲ء میں ایک ماہ حجاز مقدس میں رہ چکا ہے، چوں کہ یہ لوگ علم دین سے عاری، فقہ فی الدین کے کورے، اور قرآن وحدیث سے ناواقف ہیں، اس لئے مذکورہ بالا غلط نظریات وافکار کے حامل وقائل دوسروں کو کافر، مشرک کہہ رہے ہیں۔

بہر حال مولانا راغب نے جب یہ گمراہی دیکھی تو اردو میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام ''اظہار حقیقت'' ہے، صفحات ۱۶۰/ ہیں، سن تالیف ربیع لاثانی ۱۴۱۶ھ ۔مئی/ ۲۰۰۵ء ہے، اس کتاب میں مؤلف نے دلائل و براہین اور نصوص سے مذکورہ بالا غلط افکار کی تردید کی، اور حنفیت، دیوبندیت اور تقلید شخصی کو ثابت کیا۔ چوں کہ فریق مخالف کے پاس اس کا جواب نہ تھا، اس لئے انہوں نے سعودی حکومت کے پاس مولانا کے خلاف ناروا شکایتیں کیں، اور غلط الزامات عائد کئے، جس پر سعودی حکومت نے ۲۰۰۵ء میں مولانا کو گرفتار کیا، اور جیل میں ڈال دیا۔

اس وقت فروری/ ۲۰۱۲ء تک مولانا جیل میں رہے، اور فروری/ ۲۰۱۲ء میں رہا ہوکر بنگلادیش چلے گئے، اور اب (مئی ۲۰۱۲ء) جامعہ دار السنہ نہلا کاکس بازار کے استاد حدیث ہیں، اس طویل اسیری کی زندگی میں مولانا کے ساتھ کیا کچھ ہوا، اور مولانا کے اہل وعیال پر کیا کچھ بیتا وہ صاحب البیت ہی بتا سکتے ہیں''۔

مولانا محمد حنیف راغبؔ صاحب جامعہ اسلامیہ دار السنہ نہلا کوکس بازار میں حدیث کے مدرس تھے، آپ کا انتقال بروزِ جمعہ ۱۰ نومبر ۲۰۲۳ء بمطابق ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۴۵ھ کو بمقام مدرسہ دار السنہ نہلا ہوا، اللہ تعالی آپ کے درجات بلند فرمائے، آمین یارب العالمین۔

مولانا سیف اللہ صاحب گدوسراوی، منگڈوی:

مولانا سیف اللہ بن حضرت مولانا عبدالغفار بن حافظ سید علی کی پیدائش جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی گدوسرا میں ہوئی، آپ کے دادیہال کا تعلق گدوسرا جب کہ نانیہال کا تعلق شاہ بیل، چکریا کوکس بازار، بنگلادیش سے ہے۔

مولانا کے والد گرامی حضرت مولانا عبدالغفار صاحب ایک جید عالم دین، مایۂ ناز خوش نویس اور ایک باشعور بزرگ تھے، اور والدہ مرحومہ بھی ایک نیک سیرت اور علماء وطلباء دوست خاتون تھی۔

مولانا کی ولادت چکریا کوکس بازار میں ۱۹۵۲ء میں ہوئی، نانیہال میں آپ کی ولادت کی وجہ یہی بتائی جاتی ہے کہ آپ کی والدہ کو کسی ناقابل بیان وجہ کی بنیاد پر میکے میں بند رکھا گیا تھا، جہاں آپ کی ولادت ہوئی، اور آپ کی عمر ابھی پانچ سال کی تھی کہ آپ اپنی والدہ کے ساتھ گدوسرا آگئے۔

آپ نے اپنی والدہ سے قرآن کریم کا ناظرہ پڑھا، کہتے ہیں کہ آپ کی والدہ کی ناظرہ خوانی بڑی اچھی تھی، ویسے آپ کی ناظرہ خوانی بھی بڑی اچھی ہو پائی ہ۔ اس کے بعد درسیات کی مبادیات اپنے قابل فخر والد گرامی سے پڑھیں، ان مبادیات کی تعلیم میں آپ کے بڑے بھائی مولانا نور محمد صاحب بھی آپ کے شریک تھے، دونوں بھائیوں نے اپنے والد گرامی سے میزان منشعب جیسی کتابیں پڑھیں، کچھ بڑے ہوئے تو علاقے کی معروف دینی درس گاہ مدرسہ اشرف العلوم نور اللہ فارہ میں ۱۹۵۹ء داخلہ لیا، جہاں آپ نے جماعت چہارم تک تعلیم پائی، یہاں آپ کے اساتذہ یہ ہیں:

۱۔ حضرت مولانا سلطان احمد صاحب فقیرہ فاروی، منگڈویؒ۔

۲۔ حضرت مولانا مستفیض الرحمن صاحب باغگونوی، منگڈویؒ۔

۳۔ حضرت مولانا نور احمد صاحب گدوسراوی، منگڈویؒ۔

۴۔ حضرت مولانا منیر اللہ صاحب گدوسراوی، منگڈویؒ۔

۵۔ حضرت مولانا قاری محمد قاسم صاحب باغگونوی، منگڈویؒ۔

۶۔ حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ صاحب سنبنوی، منگڈویؒ۔

۷۔ حضرت مولانا بشیر الدین صاحب نور اللہ فاروی، منگڈویؒ۔

۸۔ حضرت مولانا مظہر الاسلام صاحب گدوسراوی، منگڈویؒ۔

۹۔ حضرت مولانا نور محمد صاحب قادربیلوی، منگڈویؒ۔

۱۰۔ حضرت مولانا کلیم اللہ صاحب شاعرہ فاروی، منگڈویؒ۔

۱۱۔ حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب باغگونوی، منگڈویؒ۔

۱۲۔ حضرت مولانا حافظ محمد صاحب قادربیلوی، منگڈویؒ۔

۱۳۔ حضرت مولانا فیض الحق صاحب رحمانی کیلادنگی، منگڈویؒ۔

۱۴۔ حضرت مولانا نجم الدین صاحب نلبنوی، منگڈویؒ۔

۱۵۔ جناب ماسٹر اظہار حسین صاحب نور اللہ فاروی، منگڈوی مرحوم۔

مولانا سیف اللہ صاحب نے ۱۹۶۷ء میں جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں داخلہ لیا، یہاں آپ نے جماعت سیوم، دوم، اور اولی اور فنونات کی تعلیم حاصل کی، جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں آپ کے اساتذۂ کرام جن سے آپ نے استفادہ کیا یہ تھے:

۱۔ خطیب اعظم حضرت مولانا صدیق احمد صاحب چکریاویؒ۔

۲۔ حضرت مولانا مفتی محمد ابراہیم صاحب چنتویؒ۔

۳۔ حضرت مولانا محمد دانش صاحب ساتکانویؒ۔

۴۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب ساتکانویؒ۔

۵۔ حضرت مولانا عبدالمنان صاحب فٹکچرویؒ۔

۶۔ حضرت مولانا محمد یوسف صاحب انواریؒ۔

۷۔ حضرت مولانا حاجی محمد یونس صاحب ہاٹہزارویؒ۔

۸۔ حضرت مولانا امیر حسین صاحب معروف بہ میر سنؒ انواروی۔

۹۔ حضرت مولانا علی احمد صاحب معروف بہ بوعلی صاحب حضورؒ۔

۱۰۔ حضرت مولانا احمد صاحب معروف بہ امام صاحب حضور مہرویؒ۔

۱۱۔ حضرت مولانا انور العظیم صاحب انوارویؒ۔

۱۲۔حضرت مولانا نورالاسلام صاحبؒ (قدیم) جیروی۔

۱۳۔حضرت مولانا نورالاسلام صاحبؒ (جدید) فکیچروی۔

۱۴۔حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی صاحب مہیش خالوی۔

۱۵۔حضرت مولانا مظفراحمد صاحب مہیش خالویؒ۔

۱۶۔حضرت مولانا مفتی عبدالرحمن صاحبؒ ہاٹھزاروی۔

مولانا سیف اللہ صاحب ابھی جماعت اولی کے طالب علم تھے کہ مشرقی پاکستان (حالیہ بنگلا دیش) میں حریت کے حوالے سے انقلاب شروع ہوگیا تھا، اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ بند ہوگیا تو آپ نے دورۂ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جامعہ اسلامیہ معین الاسلام ہاٹھزاری میں داخلہ لیا، یہاں ایک سال ۱۹۷۲ء میں پڑھ کر امتیازی نمبرات کے ساتھ سند فراغت حاصل کی۔یہاں آپ نے دورۂ حدیث کی کتابیں جن بڑے بڑے نامور حضرات علمائے کرام سے پڑھیں وہ یہ تھے:

۱۔بخاری شریف: حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب گوہروی سے۔

۲۔مسلم شریف: حضرت مولانا مفتی احمدالحق صاحب سے۔

۳۔ابوداؤد شریف: حضرت مولانا حامد حسین صاحب سے۔

۴۔ترمذی شریف: حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب سے۔

۵۔نسائی شریف: حضرت مولانا ابوالحسین صاحب سے۔

۶۔مؤطاامام مالک: حضرت مولانا نذیراحمد صاحب سے۔

۷۔مؤطاامام محمد: حضرت مولانا مفتی احمد شفیع صاحب سے۔

مولانا سیف اللہ صاحب ایک ذہین وفطین طالب علم تھے، آپ کے ساتھیوں کے مطابق آپ جہاں بھی پڑھتے تھے جملہ اساتذہ سے قریبی تعلقات رکھتے تھے، اور پڑھائی میں بھی نہایت انہماک اور درک بینی سے کام لیا کرتے تھے، جس کی وجہ سے اساتذۂ کرام آپ کو بڑی شفقت بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔

فراغت کے معابعد آپ اپنے وطن واپس گئے، اور مدرسہ عالیہ شقدارفارہ منگڈو میں مدرس ہونے

کے ساتھ ناظم برائے امور تعلیمات مقرر ہوئے، ابھی ذیل میں ایک خاکہ پیش کیا جارہا ہے کہ جس سے اندازہ ہوجائے گا کہ ارکان کے یہ قابل قدر عالم دین قومی وملی خدمات کے ساتھ ساتھ تعلیمی وتدریسی خدمات کے ساتھ کس قدر انہماک رکھتے تھے:

۱۔۱۹۷۳ء ۔۱۹۷۶ء ۔مدرسہ عالیہ شقدارفارہ میں ناظم برائے امور تعلیم۔

۲۔۱۹۷۶ء ۔۱۹۷۸ء۔مدرسہ امدادالعلوم شجاع فارہ میں ناظم برائے امور تعلیم۔

۳۔۱۹۷۸ء۔۱۹۷۹ء۔مدرسہ خدام الاسلام جیمنگ خالی میں صدرالمدرسین۔

۴۔۱۹۷۹ء ۔۱۹۸۳ء۔جامعہ اسلامیہ ٹیکناف میں ناظم برائے امور تعلیم۔

۵۔۱۹۸۳ء ۔۱۹۸۴ء۔جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں مدرس۔

۶۔۱۹۸۴ء ۔۱۹۸۶ء۔جامعہ عالیہ شقدارفارہ میں مدرس وصدرالمدرسین۔

۷۔۱۹۸۹ء۔ ۱۹۹۰ء۔مدرسہ اعزاز العلوم گدوسرا میں خادم اور صدرالمدرسین۔

مولانا سیف اللہ صاحب نے ۱۹۹۰ء کے دوران مدرسہ اعزاز العلوم گدوسرا کی طرف سے ملائشیا کا دورہ کیا، جہاں آپ نے اس مدرسہ کے لئے چندہ فراہمی کے ساتھ قومی وملی خدمات کے بطور وہاں کے چیدہ علمائے عظام، وزراء اور بعض بڑے بڑے اعیان سے ملاقاتیں کیں، جن میں ریاست کلنتان کے وزیراعظم حضرت مولانا نیک عزیز صاحبؒ ناقابل فراموش ہیں۔

مولانا سیف اللہ صاحب مدتوں تک جمعیت علمائے اسلام منگڈو کے مرکزی سکریٹری جنرل کے عہدہ پر فائز رہے تھے، اس علماء تنظیم کے سائے تلے آپ نے انگنت دینی وملی اور قومی ووطنی خدمات انجام دیں، مولانا ایک صاحب بصیرت عالم دین ہیں، یوں آپ نے مذکورہ علماء تنظیم کے زیرسائے کچھ ایسی خدمات بھی انجام دیں جو عام علمائے کرام اور دانشوران کے بس کی بات نہیں تھیں، اس حوالے سے آپ نہایت اچھے الفاظ سے سراہئے گئے تھے۔۔

مولانا سیف اللہ صاحب جامعہ اسلامیہ ٹیکناف کے مدرس ومنتظم اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے مدرس تھے، اس دوران ۱۹۸۲ء کی بات تھی کہ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی بنیاد پڑرہی تھی، جس میں آپ نے بھرپور حصہ لیا تھا، یوں اس تنظیم کے مؤسسین میں آپ کے نام گرامی بھی

شامل ہے۔ پھر ۱۹۹۸ کے بعد اس مؤخر الذکر تنظیم نے جماعت اسلامی کے ساتھ رشتہ جوڑا تو آپ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

۲۷ / ۱۲ / ۱۹۹۲ء میں چاٹگام کے معروف ہوٹل یوئیٹڈ میں روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا ایک اعلیٰ سطحی اجلاس منعقد ہوا تو مولانا سیف اللہ صاحب کو مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب نے اس میں شرکت کی دعوت دی، جس میں آپ شریک ہوئے تھے، جس میں دیگر حضرات لیڈران کے ساتھ راقم بھی شریک تھا، اور جس کی تفصیلات اپنی جگہ پر موجود ہیں، اس اجلاس میں مولانا سیف اللہ صاحب کی اولوالعزمی، سیاسی بصیرت اور دور بینی فکری دقیقہ سنجی بڑی حد تک نظر آئی تھی، آپ نے یہاں اپنی لائق اور قابل قدر آراء سے مجلس اور تنظیم کو کافی حد تک فائدہ پہنچایا تھا، اس جلسہ اور بعد میں آپ کی دیگر سرگرمی اور کردار سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ آپ ایک ذی استعداد عالم ہونے کے ساتھ ایک صاحب بصیرت سیاسی اور فکری رہنما بھی ہیں۔

اس مذکورہ اجلاس میں مولانا سیف اللہ صاحب کو روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کی مرکزی مجلس عاملہ میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد ۱۹۹۳ء میں آپ نے مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کی ہم راہ مؤخر الذکر اس تنظیم کی جانب سے سعودی عرب کا سفر کیا، جہاں آپ نے کافی سرگرمیاں دکھائی تھیں، لیکن افسوس ہے کہ آپ اس سفر سے آج تک واپس نہیں آئے، یا نہ آسکے، یہاں اس کی تفصیلات کو جانا مناسب نہیں، اور تادم تحریر سعودی عرب کے معروف شہر جدہ میں مع اہلیہ مقیم ہیں، راقم سطور سے مولانا کے دیرینہ کے تعلقات تھے اور اب بھی ہیں، اور وہاں سعودی عرب میں راقم جتنے سال رہا، آپ کے قریب ہی رہا تھا، آپ بڑے نیک، مخلص اور باوفاء انسان ہیں، ۱۹۹۴ء سے لے کر اب تک وہاں کے مختلف دینی مدارس میں پڑھاتے رہے ہیں، راقم کی جتنی بھی دینی، فکری اور سیاسی سرگرمیاں وہیں تھیں، آپ نے اس کے ساتھ دینے میں کسی قسم کی کسر نہیں چھوی، اور بہر صورت آپ اپنے نیک اور مخلصانہ مشوروں سے اسے محظوظ کرتے رہے تھے، اور ساتھ ہی ساتھ کسی بھی خطرات سے آگاہ کرتے رہے تھے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اپنے فضل وکرم سے آپ کی حیات میں برکت عطا کرے، آمین۔

مولانا شبیر احمد صاحب منگالوی، منگڈوی:

نامور عالم دین، میدان تعلیم وتربیت اور درس وتدریس کے شہ سوار شیخ الحدیث مولانا مفتی شبیر احمد کی ولادت ۱۳۷۱ھ میں شمالی منگڈو کی بستی منگالہ میں ہوئی، مولانا کا سلسلہ نسب یوں ہے کہ: شبیر احمد بن محمد علی، بن عبدالسبحان بن صورت علی، بن حیدر علی بن حسین۔

مولانا کے والد ماجد مرحوم محمد علی بڑے نیک صفات، علماء اور اولیاء دوست انسان تھے، اور آپ کے دادا مرحوم عبدالسبحان صاحب اپنے گاؤں کے سردار بھی تھے اور نیک صفات عالم دوست بھی۔ علاوہ ازیں مولانا کا خاندان بڑے بڑے جید علمائے کرام کا خاندان ہے، جن میں سے چند ناموروں کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) حضرت العلامہ مولانا عبدالستار صاحب رحمۃ اللہ علیہ، فاضل مدرسہ عالیہ کلکتہ، مغربی بنگال، انڈیا۔
(۲) حضرت العلامہ مولانا محمد سعید صاحبؒ، فاضل دارالعلوم دیوبند۔ یوپی، انڈیا۔
(۳) حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ، فاضل مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور، یوپی، انڈیا۔
(۴) حضرت مولانا فوز الکبیر صاحبؒ، فاضل مدرسہ شاہی مراد آباد، یوپی، انڈیا۔
(۵) حضرت العلامہ مولانا ارشاد علی صاحبؒ، فاضل جامعہ شاہ جہان پور، انڈیا۔
(۶) حضرت مولانا حسین علی صاحبؒ، فاضل جامعہ مدنیہ، لاہور، پاکستان۔
(۷) شیخ الحدیث حضرت مولانا نور محمد صاحب، فاضل جامعہ اسلامیہ پٹیہ، بنگلہ دیش۔
(۸) حضرت مولانا محمد ہاشم صاحب، فاضل جامعہ اسلامیہ پٹیہ، بنگلہ دیش۔
(۹) مولانا نور محمد صاحب، فاضل جامعہ شجاع ڈیا، منگڈو، ارکان۔
(۱۰) مولانا احمد اللہ صاحب، فاضل جامعہ محمدیہ فرانفورو، منگڈو، ارکان۔
(۱۱) مولانا محمد حسین صاحب (واعظ) فاضل جامعہ محمدیہ فرانفورو، منگڈو، ارکان۔
(۱۲) مولانا حسین احمد صاحب، مقیم حال مکہ المکرمہ۔ سعودی عرب۔
(۱۳) مولانا ولی اللہ صاحب، فاضل جامعہ مفتاح العلوم، حیدرآباد، پاکستان۔
(۱۴) مولانا نبیہ حسین صاحب، فاضل جامعہ مفتاح العلوم، حیدرآباد، پاکستان۔
(۱۵) مولانا عبدالعزیز صاحب، فاضل مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری، چاٹگام۔

(۱۶) الشیخ خالد بن کبیر احمد، مقیم حال جروال، مکۃ المکرمہ، سعودی عرب۔

مولانا نے ابتدائی تعلیم کا آغاز مدرسہ اسلامیہ بڑا گوجربیل سے کیا، یہ مدرسہ بعد میں کھولا ربیل منتقل ہوا تو آپ بھی وہیں منتقل ہوگئے، اور جماعت ہفتم تک وہیں تعلیم حاصل کی۔ اگلے سال جماعت ششم مدرسہ محمدیہ پرانفورو میں پڑھی، ان حالات کے متعلق مولانا لکھتے ہیں:

''چھ سال عمر میں ناظرۂ قرآن مجید اور الف با کی کتاب عم محترم حضرت مولانا فوز الکبیر صاحب رحمۃ اللہ علیہ (فاضل مدرسہ شاہی مرادآباد، یوپی، ہند) کے یہاں پڑھی، اس کے بعد میرا حقیقی چچا حضرت مولانا حسین علی صاحب جو اس زمانے میں مدرسہ اسلامیہ بڑا گوجربیل میں زیر تعلیم تھے جماعت چہارم میں پڑھتے تھے، انہوں نے مجھے وہاں لے گیا اور جماعت دہم میں داخل کرادیا۔ دراں حالیکہ حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب چالی پرانگی اس مدرسہ کا مہتمم تھے، اس مدرسہ میں میں نے جماعت دہم، نہم اور ہشتم کی تعلیم پائی، اس کے بعد یہ مدرسہ بڑا گوجر سے کھولا ربیل منتقل ہوا تو میں بھی وہاں منتقل ہوگیا، اور میری جماعت ہفتم کی تعلیم اسی منتقل شدہ مدرسہ میں ہوئی، اس کے اگلے سال میں نے مدرسہ محمدیہ پرامپورو میں داخلہ لیا، یوں ایک سال یہاں جماعت ششم کی تعلیم حاصل کی تھی''۔

سرزمین ارکان بس ان دونوں مدرسوں میں آپ نے ابتدائی تعلیم حاصل کی، اب مناسب معلوم ہوتا ہے، وطن عزیز میں حضرت کے اساتذۂ کرام کے نام لئے جائیں:

(۱) شیخ المشائخ حضرت مولانا عبدالجلیل صاحب چالی پرانگیؒ۔

(۲) خطیب ارکان حضرت مولانا محمد اعلی صاحب کھولا ربیلیؒ۔

(۳) حضرت مولانا، محدث وقاری بدرالاسلام صاحب کھولا ربیلیؒ۔

(۴) حضرت مولانا، محدث وقاری عبدالکریم منگنماویؒ، فاضل جامعہ اشرفیہ لاہور، مدفون جنت المعلی۔

(۵) حضرت مولانا عبدالسلام صاحب پرامپوریؒ، فاضل جامعہ ٹنڈولہ یار، حیدرآباد، پاکستان۔

مولانا جس زمانے میں اپنے وطن میں تعلیم حاصل کررہے تھے، اسی زمانے میں فاضل گرامی حضرت العلامہ مولانا احمد اللہ صاحب بن حضرت شیخ المشائخ مولانا سراج الحق رامپور بیلوی اپنے وطن میں

تھے بعد میں مولانا حجاز مقدس کی سرزمین اقدس مکہ مکرمۃ چلے گئے، مولانا شبیر احمد صاحب کی اگرچہ ان سے ملاقاتیں رہیں، مگر باضابطہ استفادے کا موقع نہیں ہوا، البتہ انہوں نے مولانا شبیر صاحب سے ایک طرح کی ایک پتے کی بات کہی، جو مولانا کی زبانی سنئے، مولانا شبیر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''حضرت گرامی قدر مولانا احمد اللہ صاحبؒ بن مولانا سراج الحق صاحب رامیور بیلوی اس زمانے میں جامعہ خیر المدارس ملتان سے سند فراغت حاصل کرکے وطن پہنچے تھے، مولانا موصوف نہایت خلیق، لائق وفائق، ادیب اورنحو وصرف کے ماہر تھے، اور حضرت مولانا اپنے طور پر چند طلباء کو خصوصی تعلیم دیتے تھے، مولانا ہماری قریبی بستی کے باشندہ ہونے کی وجہ سے آمدورفت میں میرا تعارف ہوا، انہوں نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا کہ ''پاکستان کی تعلیم اور ارکان کی تعلیم میں زمین وآسمان کا فرق ہے، اور بالخصوص خیر المدارس ملتان کا نظم ونسق اور تعلیم کا معیار بہت بلند ہے'' حضرت کی یہ بات میرے دل میں چسپاں ہوگئی تھی، مولانا سے شرف تلمذ تو حاصل نہ کرسکا، مگر جہاں تک میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھے بہت محبت کرتے تھے، مولانا کی مذکورہ بات کہ جس طرح عرض کی گئی کہ میرے دل میں جاگزین ہوگئی، اور فکر لاحق ہوچکی تھی کہ میں کسی بھی قیمت میں پاکستان پڑھنے جاؤں گا، اور جامعہ ملتان میں جاکر تعلیم حاصل کروں گا، اس وقت حالیہ بنگلہ دیش مشرقی پاکستان تھا، اور سرزمین ارکان سے طلبائے علوم دینیہ جوق در جوق حصول علم کے لئے پاکستان جایا کرتے تھے، میں نے اپنے دادا محترم عبد السبحان سے عرض کی کہ مجھے پڑھنے کے لئے پاکستان جانے کی اجازت دی جائے، دراں حالیکہ میری عمر پندرہ سال کی تھی۔ میری عمر کے لحاظ کرتے ہوئے دادا جان شروع شروع میں اجازت دینے سے انکار کرتے رہے تھے۔''

بعد میں مولانا پاکستان جانے کے لئے مصر ہوگئے، ان کا شوق دیکھ کر بعد میں دادا جان بھی راضی ہوگئے، ان حالات کے متعلق مولانا خود رقم طراز ہیں کہ:

''دادا جان جناب مرحوم عبدالسبحان صاحب ہماری بستی کے بڑے سرکردہ اور

سردار آدمی تھے ، صاحب رائے بزرگ تھے ، انہی میرا شوق اور علمی پیاس کا احساس تھا۔ایک دن میں نے داداجان سے بطور حجت کہا کہ کیا میرے چچا حسین علی صاحب گئے سال پاکستان نہیں گئے؟ وہ جاسکتے ہیں تو میں کیوں نہیں جاسکتا، میرے جوب میں داداجان نے فرمایا کہ تو تو ابھی بہت چھوٹا ہے، پردیس میں اکیلا نہیں رہ سکتا، پھر بھی میں مصر تھا تو داداجان میرے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ ٹھیک ہے میں تجھے اللہ کا حوالہ کروں گا، گویا ابھی بھی میں دیکھ رہا ہوں کہ ان الفاظ کے ساتھ داداجان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہا تھا۔

اس زمانے میں ہمارے ایک رشتہ دار مولانا حسین احمد صاحب منگالوی پاکستان جارہے تھے، مجھے ان کی ہمراہ کردیا، مولانا حسین احمد صاحب مدرسہ مفتاح العلوم گھاس مارکیٹ حیدرآباد پاکستان کے فاضل تھے ان کے ساتھ چاٹگام پہنچا، یہاں سے بحری جہاز الشمش کا ٹکٹ ۸۴ روپیہ سے خریدا اور بسلامت کراچی شہر جا پہنچا ۔ کراچی پہنچتے ہی ’’دارالعلوم کراچی‘‘ میں داخلہ لیا، داخلہ امتحان مولانا شمس الدین صاحب نے لیا، مطلوبہ نمبر ملا تو جماعت پنجم میں داخلہ مل گیا تھا، یہاں ایک سال پڑھا، چوں کہ جامعہ بنوری ٹاون کی شہرت عام تھی، وہ اس حیثیت سے بھی تھی وہاں کا نظم ونسق دیگر مدارس کی نسبت سے اچھا تھا، یوں اگلے سال وہاں داخلہ لیا گیا، داخلہ امتحان مولانا حامد میاں صاحب نے لیا، مطلوبہ نمبر مل گیا تو داخلہ بھی مل گیا، یوں یہاں دوسال یعنی جماعت چہارم اور جماعت سوم کی تعلیم حاصل کی گئی تھی‘‘۔

چوں کہ مولانا کے دل میں خیر المدارس ملتان والی بات تازہ تھی، دارالعلوم کراچی اور جامعہ بنوریہ میں تین سال پڑھنے کے بعد دورۂ حدیث شریف سے پہلے فنونات عالیہ کی کتابیں پڑھنے کا ارادہ کیا، یوں مولانا عبدالحی مومن شاہی (بنگلہ دیش) کے ہم راہ ملتان پہنچے، جہاں آپ نے مسلسل تین سال تعلیم حاصل کی۔ان احوال کے متعلق مولانا خود لکھتے ہیں کہ:

’’میرے دل میں ملتان والی بات رہ گئی تھی، دورۂ حدیث سے پہلے فنونات عالیہ کی کتابیں پڑھنے کی نیت سے مولانا عبدالحی مومن شاہی کی ہم راہ بذریعۂ ریل

ملتان پہنچا، اور خیر المدارس کبیر والا میں داخلہ لیا، مولانا عبدالحی صاحب تو فنونات عالیہ کی کتابیں ایک سال پڑھ کے دہلی گیٹ کے قریب ملتان کی ایک جامع مسجد میں امام مقرر ہوئے، مگر میں نے اپنا تعلیمی سلسلہ بدستور جاری رکھا۔اس زمانے میں دارالعلوم خیر المدارس عیدگاہ کبیر والا ملتان کے مہتمم صاحب حضرت مولانا منظور الحق صاحب نور اللہ تعالی مرقدہ تھے ، وہاں فنونات کی اکثر کتابیں شیخ المعقولات حضرت مولانا فیض علی شاہ صاحب ہزاروی پڑھایا کرتے تھے، جنہوں نے اس سے پہلے دارالعلوم دیوبند میں سالوں تعلیم دی تھی، مولانا کبھی کبھار منتظمین مدرسہ سے نالاں ہوکر فرمایا کرتے تھے کہ میں نے الحمد للہ مدرسہ میں تعلیم دی ، یہاں پاکستان کا مدرسہ تو مدرسہ نہیں بلکہ مدیرسہ (مصغر) ہے۔

بہرحال میں نے یہاں مسلسل تین سال تعلیم حاصل کی، فنونات کی اکیس کتابیں میں نے مولانا ہزاروی کے علاوہ دیگر اساتذہ کرام سے پڑھیں ، یہاں تین سال نہایت شفقت ومحبت بھرے ماحول میں گزرے، توضیح ، تلویح ، مسلم الثبوت نامی کتابیں حضرت مولانا شیخ الحدیث علی محمد صاحب کبیر والا سے پڑھیں ، بیضاوی شریف اور ہدایہ ثالث نامی کتابیں مہتمم صاحب سے پھر جماعت اولی بھی ان تینوں بزرگ اساتذہ کی خواہش پر یہاں پڑھی گئی۔

اگلے سال دورۂ حدیث کا سال تھا، ارادہ کیا تھا کہ دورۂ حدیث کی کتابیں حضرت العلامہ محمد یوسف صاحب بنوری سے پڑھوں گا، آخر اس ارادہ سے کراچی پہنچا تو معلوم ہوا کہ ۱۹۷۱ء کے حوالے سے پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان لوگوں کا تبادلہ ہورہا ہے، زمانہ فتنہ وفسادات کا تھا، آخر مجھے بھی بنگلہ دیش چلے آنے کا ارادہ کرنا پڑا،، یوں میں حضرت مولانا علامہ محمد لقمان کونچی بنگی (مدرس جامعہ اسلامیہ پٹیہ) کا بیٹا سچ کر بنگلہ دیش چلا آیا۔مولانا لقمان صاحب نے اپنے رسوخ استعمال کرکے جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں داخل کروادیا، یوں اسی جامعہ میں دورۂ حدیث شریف پڑھا، اور سالانہ امتحان میں شریک ہوکر سند فراغت حاصل کی۔یاد رہے کہ

دورۂ حدیث نصف سال تک جامعہ بنوریہ میں پڑھا تھا،۔

مولانا محترم نے اپنی خودنوشتہ تحریر میں ان کے پاکستانی اساتذۂ کرام کی فہرست درج کردی ہے، جودرج ذیل ہے۔

جامعہ دارالعلوم کراچی کے اساتذۂ کرام:

(۲) حضرت مولانا عبدالاحد صاحب.

(۳) حضرت مولانا افتخار حسین صاحب۔

(۴) حضرت الشیخ العلامہ مولانا غلام محمد صاحب۔

(۵) حضرت مولانا شمس الدین صاحب۔

جامعہ بنّوریہ نیوٹاون (سابق بنوری ٹاؤن) کے اساتذۂ کرام:

(۱) شیخ العرب والعجم حضرت العلامہ محمد یوسف بنوری نوراللہ مرقدہ۔

(۲) شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکیؒ۔

(۳) شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد ادریس صاحب میرٹھی صاحبؒ .

(۴) حضرت مولانا محمد صاحبؒ .

(۵) حضرت مولانا مصباح الرحمن صاحبؒ .

(۶) حضرت مولانا عبدالرزاق صاحبؒ

(۷) حضرت مولانا عبدالقیوم صاحب گلگتی ؒ

(۸) حضرت مولانا حامد میاں صاحبؒ۔

دارالعلوم کبیروالا ملتان کے اساتذۂ کرام :

(۱) شیخ المعقولات حضرت مولانا فیض علی شاہ صاحبؒ ۔

(۲) شیخ الحدیث حضرت مولانا علی محمد صاحبؒ ۔

(۳) علامۃ الدہر حضرت مولانا منظورالحق صاحبؒ۔

(۴) علامۃ حضرت مولانا ظہورالحق صاحبؒ ۔

(۵) حضرت علامۃ مولانا عبدالمجید صاحب خطیب لائلپوریؒ۔

(۶) حضرت مولانا احسان الحق صاحب تونسویؒ۔

(۷) حضرت مولانا محمد امین صاحبؒ.

جامعہ اسلامیہ پٹیہ کے اساتذۂ کرام :

(۱) شیخ الحدیث حضرت العلامہ مولانا میر احمد صاحبؒ ۔

(۲) حضرت العلامہ مولانا احمد (امام صاحب حضور) صاحبؒ

(۳) حضرت العلامہ مولانا عبدالرحمن صاحبؒ ۔

(۴) پیر طریقت حضرت مولان علی احمد بوالوی صاحبؒ ۔

(۵) حضرت مولانا نورالاسلام (قدیم صاحب) رحمہ اللہ۔

ان مذکورہ اساتذہ کرام کے علاوہ مولانا نے چند مہینے غالبا چھٹی کے دوران حضرت حافظ الحدیث مولانا علامۃ عبداللہ صاحب درخواستی سے بھی استفادہ کیا تھا۔ جو خان پور پنجاب پاکستان میں تھے، اسی طرح کچھ دن سکھر صوبہ سندھ پاکستان کے رہنے والا مولانا صوفی عبداللہ صاحب سے بھی دورۂ نحو وصرف کے حوالے سے استفادہ کیا تھا۔

تعلیم کے مذکورہ تمام مراحل حسن وخوبی کے ساتھ طے کرنے کے بعد مولانا صحیح وسلامت وطن پہنچے، یہاں پہنچتے ہی ان کے اساتذۂ جن میں حضرت مولانا محمد علی کھولار بیلی اور حضرت مولانا قاری بدر الاسلام کھولار بیلی نا قابل فراموش ہیں نے مولانا کو ہاتھوں ہاتھ لیا، اور جامعہ اسلامیہ کھولار بیل کا مدرس مقرر کردیا۔ اس کے بعد کے حالات پر مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

’’ ۱۳۹۵ھ میں خاتم المحدثین حضرت مولانا سید الامین صاحبؒ نے نہایت محبت وشفقت سے اپنی پہلی صاحب زادی عزیزہ شوکت آراء سے میری شادی کا رشتہ قائم کردیا، میں شادی کے سال جامعہ محمدیہ پرامپورو میں مدرس مقرر رہا، اسی مدرسہ میں متواتر تین سال تدریسی خدمات انجام دیں، ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء کے سال ارکان میں افراتفری کا عالم تھا، مسلمانوں کی ایک بھاری تعداد نے ارکان سے بنگلہ دیش کی طرف ہجرت کی، میں جامعہ اسلامیہ پرامپورو میں تین سال خدمات انجام دینے کے بعد حجاز مقدس چلا گیا، یوں مذکورہ افراتفری کے دوران حضرت شیخ

الحدیث نے میری اہلیہ شوکت آراء کو مع میری صاحب زادی مکہ المکرمہ پہنچادیا تھا، حجاز مقدس میں میں نے مسلسل پانچ سال گزارے، اس کے بعد ایک سال جامعہ محمدیہ پرامپورو میں اور پانچ سال جامعہ اسلامیہ کھولا ربیل میں پڑھایا، موخر الذکر جامعہ میں میں ناظم برائے امور تعلیمات بھی رہا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ جامعہ محمدیہ پرامپورو چلا آیا، جہاں بڑے بڑوں کے ساتھ تدریسی خدمات انجام دیں، یہاں میں نے بڑے بڑوں کے ساتھ ترمذی شریف اورنسائی شریف جیسی کتابیں پڑھائیں، جامعہ محمدیہ میں میری کل مدت تدریس آٹھ سال تھے۔ اس کے بعد جامعہ توحیدیہ منگنما کی تاسیس ہوئی، جہاں میں بھی مدرس مقرر ہوا، یہاں میں نے بڑے بڑوں کے ساتھ بخاری شریف ثانی، ترمذی کامل اور مسلم شریف جیسی کتابیں پڑھائیں، یہاں کل مدت تدریس دس سال رہی۔

اس کے بعد فاضل گرامی نوجوان عالم دین مولانا شفیق الرحمن صاحب، مولانا رشید احمد صاحب کچھر بیلوی اور مولانا نور العالم مرحوم (سابق ناظم تعلیمات جامعہ حقانیہ نکھورہ کے شوق اور اصرار کو دیکھتے ہوئے، مؤخر الذکر جامعہ میں چلا گیا، جہاں میں نے چار سالوں تک تعلیم دی، یہاں میرے حصے میں دیگر کتابوں کی تدریس کے ساتھ بخاری شریف کامل اور ترمذی شریف ثانی جیسی کتابیں تھیں۔ یہاں ایک طرف میں شیخ الحدیث بھی تھا، دوسری طرف صدر المدرسین بھی۔ اس کے بعد جامعہ امدادیہ شجاع ڈیا آیا، جہاں حضرت مولانا ابوالحسین صاحب عرب شاہ فارویؒ کے ساتھ تعلیمی فریضہ انجام دیا، جب تک مولانا زندہ تھے تب تک بخاری شریف اوّل آپ کے حصہ میں تھی، ان کے انتقال کے بعد بخاری شریف اوّل میرے حصّے میں آئی، اس سے پہلے بخاری ثانی میرے ذمے تھی۔ یہاں ایک طرف شیخ الحدیث اور دوسری طرف عہدۂ صدر المدرسین میں متمکن رہا، ویسے یہاں سات سال پڑھا تا رہا تھا۔ اس کے بعد جامعہ عالیہ شقدار فارہ چلا گیا، جہاں میں نے بخاری کامل پڑھائی، اور ساتھ ساتھ صدر المدرسین بھی رہا، دو سال یہاں گزرے تو ۲۰۱۲ء کا قومی حادثہ پیش آیا، جس کی وجہ سے سارے مدارس و مساجد بند کر دیئے گئے، ارکان اور اس کی اطراف کے سارے علاقے افراتفری کے عالم میں ڈوبے ہوئے ہیں، تو ایسے حالات میں میں نے اپنے بعض احباب اور

یہاں کے چند معتبر علماء سے مشورہ کر کے عرب شاہ فارہ بستی میں بڑے خفیہ طریقے سے ''المعهد الاسلامی لاحیاء العلوم والسنۃ'' کے نام سے ایک دینی ادارہ کی تاسیس کی، جہاں بخاری شریف تک کی تعلیم ہوتی ہے، یہاں میں صدر المدرسین کے منصب پر فائز ہوں، اور بخاری کامل میرے حصے میں ہے، آج ۱۲۳۸ھ کا سال ہے، اللہ تعالی کا کرم ہے کہ ہم کسی طرح محفوظ ہیں :

مولانا پاکستان کے دوران تحصیل علوم بیعت وارادت کا رسم بھی ادا کیا، انہوں نے پیر طریقت مناظر اسلام حضرت العلامۃ مولانا دوست محمد قریشی نور اللہ مرقدہ کے ہاتھ میں بیعت کی، جہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اپنے مرشد برحق قریشی صاحب سے بہت ہی متأثر تھے اور ہیں۔ اللہ تعالی مولانا قریشی صاحب کے درجات بلند کرے، بڑے مناظر تھے، اہل بدعت، تشیع اور عیسائیوں کے خلاف مناظرہ میں آپ بڑے باکمال انسان تھے۔ مولانا قریشی صدر تنظیم اہل السنت والجماعت تھے۔ جو تحصیل کوٹ ادّو ضلع مظفر گڑھ پنجاب کے رہنے والے تھے۔

ذیل میں مولانا شبیر احمد صاحب کی تدریسی خدمات کا ایک گوشوارہ پیش کیا جاتا ہے، تاکہ ناظرین کرام کو ایک ہی نظر میں ان کی تدریسی خدمات کے متعلّق معلومات فراہم ہوسکیں۔

	مقامات خدمات	سال
۱	جامعہ اسلامیہ کھولا ربیل میں کل مدت تدریس	۶
۲	جامعہ محمدیہ، پرامپورو، میں کل مدت تدریس	۸
۳	جامعہ توحیدیہ، منگنما میں	۱۰
۴	جامعہ حقانیہ نکھورہ میں	۴
۵	جامعہ دار العلوم شجاع ڈیا میں	۷
۶	جامعہ اسلامیہ عالیہ، شقدار فارہ میں	۲
۷	المعهد الاسلامی، گرجنڈیا، عرب شاہ فارہ میں	۴
۸	سال رواں پرائوٹ طور پر، شجاع ڈیا میں	۱
۹	کل مدت تدریس	۴۴

مولانا محترم جس طرح درس وتدریس کے میدان کے شہ سوار ہیں اسی طرح فقہ وفتاوی کے بھی ماہر ہیں ۔آپ ایک عرصہ تک منگڈو ٹاون شپ جمعیۃ علمائے اسلام کے صدر نشین بھی رہے،عیدگاہ سجانے کے حوالے سے ان کا ایک معرکۃ الآراء فتوی تھا،جس پر قدرے تفصیلات زیر نظر تالیف میں لکھی جاچکی ہیں،البتہ ہزار کوشش کے باوجود مولانا کے اس فتوی کی کاپی حاصل نہ کی جاسکی،ورنہ اس پر تبصرہ ہوسکتا۔

غرض مولانا ایک زندہ دل،خلیق اور خاصی استعداد ولیاقت کے حامل عالم دین ہیں۔مولانا نے راقم سطور کو ''تذکرۂ علامہ سید الامین'' کی تالیف کے حوالے سے خاصی مدد اور بہت ہی مفید تعاون کیا ہے، چوں کہ آپ حضرت مولانا سید الامین صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ کے بڑے داماد بھی ہیں پھر علمی وتدریسی زندگی کے کہنہ مشق دیرینہ ساتھی بھی،اسی لئے مولانا مرحوم کے متعلق ان کے معلومات وسیع ہیں۔یوں راقم سطور مولانا محترم کا بے حد مشکور اور ممنون ہے۔اللہ تعالی ان کو جزائے خیر دے،آمین۔

محترم مولانا کی گیارہ اولاد ہیں،الحمد للہ سب کے سب حیات سے ہیں۔ان کے حالات کے متعلق اجمال کچھ یوں ہے:

(۱) عبدالحی:انہوں نے مٹرک تک تعلیم حاصل کی،شادی شدہ ایک لڑکے کا باپ ہے، ملائشیا میں مقیم ہے۔

(۲) مولوی حافظ عبدالواحد:مقیم حال انڈونیشیا،شادی شدہ ہے۔تین بچوں کا باپ ہے ۔

(۳) مولوی عبدالحلیم:مقیم حال ارکان،فارغ التحصیل جامعہ اسلامیہ معین الاسلام ہاٹھزاری، درس وتدریس کی خدمات انجام دے رہا ہے۔

(۴) عبداللہ:جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں زیر تعلیم ہے،جماعت چہارم کا طالب علم ہے۔

(۵) عبدالرؤوف،:زیر تعلیم ہے،دینی وعصری علوم حاصل کررہا ہے۔

(۶) صفیہ،:شادی شدہ ہے،رسید احمد کھلادبیلی اس کا شوہر ہے۔

(۷) لطیفہ،:زوجہ مولوی نور حسین صاحب ہے۔

(۸) صالح:زوجہ مولوی نورالبشر حاجی فاروی ہے۔

(۹) شگوف:زوجہ مولوی حافظ عبدالناصر شجاع فاروی ہے۔

(۱۰) عصمت آراء:زوجہ مولوی حافظ فیض احمد منگنماوی ہے۔

(۱۱) زینب:اس کی شادی مولوی حافظ فیاض اللہ بن علی حسین صاحب (معروف امیر تبلیغ منگڈو) سے ہوئی ہے۔اللہ تعالی مولانا کی تمام اولاد کی حیات دراز کرے،اور علم وعمل کی توفیق دے۔

مولوی ابوطاہر صاحب باغگونوی، بوسیدنگیؒ:

مولوی ابوطاہر بن ابوطیب کی پیدائش بستی باغگونہ بوسیدنگ میں ۱۹۵۹ء میں ہوئی،کھاتے پیتے گھرانے کے لاڈلے فرزند ارجمند تھے،والدین نہایت فراخ دل اور علماء وصلحاء کے بڑے قدردان تھے،شاید گھر میں کسی چیز کی کمی تھی،ویسے مولوی صاحب کا نشوونما اور تعلیم شاندار طریقے سے ہوئی تھی۔

مولوی ابوطاہر صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مکتب اور سرکاری پرائمری اسکول میں پا کر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا،یہیں سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کی،نستعلیقی کیفیت کے طالب علم تقریباً ہر ایک اساتذۂ کرام کے کافی منظور نظر تھے،مولوی صاحب حضرت مولانا حسین احمد ابوالفضل صاحب کے عزیز وقریب ترین ساتھیوں میں سے تھے،اس حوالے سے خاصی تفصیلات ہیں،جن سے قطع نظر اس عجالہ میں اتنی سی بات عرض ہے کہ مولوی صاحب نے وقت وقت پر مولانا حسین احمد کی خدمت کی،ان کی خدمت میں کبھی بھی کسی قسم کی کوتاہی شاید ہوئی ہوگی۔

مولوی صاحب کے دوستوں میں علاقے کے اور چند حضرات علمائے کرام بڑے قابل تذکرہ ہیں،جن میں سے مولوی محمد شفیع صاحب ہولی مرنگی،مولوی شفیع الرحمن صاحب پانچکری بیلی،مولوی عبیدالحق صاحب پانچکری بیلی اور مولوی روح الامین صاحب لمبابیلی ناقابل فراموش ہیں،ایک تو یہ سب ہم سبق تھے،پھر اس پر مستزاد ہم آئے دن دیکھتے تھے کہ یہ حضرات جہاں کہیں بھی جاتے یک ساتھ جایا کرتے تھے،اور جہاں تک دیکھا کہ یہ حضرات بھی مولانا حسین احمد صاحب کے نہایت قدردان اور خاصے مدح سرا اور حضرات راقم سطور کے بھی بڑے خیرخواہ تھے۔

مولوی ابوطاہر صاحب بڑے سلیقے کے نہایت باذوق انسان تھے،کافی خوب صورت بھی تھے اور نہایت خوب سیرت بھی،عنفوان شباب میں راقم سطور نے پہلی مرتبہ مولانا حسین احمد صاحب کا تذکرہ بڑے بلند وبالا الفاظ میں انہی کی زبانی سنا،اور جہاں تک اندازہ ہوا کہ آپ مولانا محترم کے بڑے قدردان اور راقم سطور کے بھی بڑے خیرخواہ تھے،مشورہ بڑا صائب دیا کرتے تھے۔آپ نے غالباً ۱۹۹۷ء میں بھرپور جوانی کے عالم میں انتقال کیا،اور خاک باغگونہ میں مدفون ہیں،سچ میں مولوی صاحب کے لئے دل بہت جلتا ہے،اللہ تعالی مرحوم کو غریق رحمت کرے،آمین یارب العالمین۔

مولوی محمد جلیل ابوالفضل صاحب لمبابیلی، بوسیدنگی:

مولوی محمد جلیل ابوالفضل صاحب اپنی آبائی بستی لمبابیل، بوسیدنگ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بستی کے مکتب اور سرکاری اسکول کے علاوہ اپنے والد بزرگوار سے پائی، کچھ بڑے ہوئے تو جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں جہاں آپ کے والد صاحب شیخ الحدیث تھے میں داخلہ لیا، جہاں سے درسیات کی ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم پاکر اعلی دینی تعلیم کے لئے بنگلا دیش کا سفر کیا، اور جامعہ اسلامیہ ضمیریہ قاسم العلوم پٹیہ میں داخلہ لیا، یہاں جماعتِ اولی کے علاوہ دیگر فنونات کی تعلیم پاکر پاکستان پہنچے، اور جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن میں پڑھ کر سندِ فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ وطن واپس آئے، اور تمنگ چنگ والی ایک نیک سیرت اور دین دار خاتون سے شادی کی، اس کے بعد آپ حجاز مقدس پہنچے، چند سال وہیں گزار کر پھر وطن آئے، اور کچھ دن کے بعد اپنے اہل خانہ سمیت ترک وطن کر کے چاٹگام میں رہائش پذیر ہو گئے تھے۔

مولوی محمد جلیل صاحب سے راقم کی طول طویل ملاقات رہی ہے، ۱۹۸۵ء کے دوران ان کے بڑے بھائی مولانا حسین احمد صاحب جس زمانے میں خطیبر ہاٹ، چاٹگام میں رہائش پذیر تھے، مولوی محمد جلیل صاحب بھی مع اہل خانہ اپنے بھائی کے ساتھ رہتے تھے، دراں حالیکہ راقم دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام میں طالب علم تھا، اور میرا اس رہائش گاہ میں سدا آنا جانا رہتا تھا، وہاں مولوی محمد جلیل صاحب سے کبھی اکیلے میں اور کبھی مولانا حسین احمد صاحب کی شمولیت میں طول طویل باتیں ہوتی تھیں، خاص طور پر علمی، فکری، ثقافتی اور روحانی مذاکرات ہوا کرتے تھے، اسی طرح رہ رہ کر حالات کے پیش نظر سیاسی اور انقلابی امور میں بھی گفتگو چھڑ جاتی تھی، لیکن مولوی محمد جلیل صاحب انقلابی اور سیاسی گفتگو میں بہت کم دل چسپی لیتے تھے، تاہم فکری اور ثقافتی موضوعات میں خاص دل چسپی لیا کرتے تھے، قومی اور ملکی حالات پر کافی فکر مند ہونے کے باوجود ان موضوعات پر گفتگو کرنے کا جہاں تک سوال ہے، آپ کا ان امور کی طرف ذہنی رجحان بہت کم دیکھا گیا، خاص طور پر مولانا حسین احمد صاحب کی موجودگی میں آپ ان موضوعات میں دخل نہیں دیا کرتے تھے۔

مولوی محمد جلیل صاحب بڑے ذہین وفطین اور بڑے زیرک عالم دین ہیں، لیکن میرے ناقص خیال میں فراغتِ تعلیم کے بعد ان کو ایک عالم دین کی شایانِ شان مطالعہ کرنے کی نوبت بہت کم ملی، ورنہ ان کی شخصیت اور کمالات میں چار چاند لگ گئے ہوتے۔

طالب علمی کے زمانے میں مولوی محمد جلیل صاحب کو مولانا حسین احمد صاحب ایک جید طالب علم کی حیثیت سے نہیں دیکھتے تھے، مولانا حسین احمد صاحب کے بیان کے مطابق وہ ان کے معیار میں نہیں اترتے تھے، لیکن بعد میں مولانا حسین احمد کی رائے میں کافی تبدیلی آئی، اس حوالے سے ایک واقعہ خود مولانا حسین احمد صاحب کی زبانی سنئے کہ:

> ''جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں حضرت مولانا انور العظیم صاحب میرے اور محمد جلیل کے استاد تھے، محمد جلیل کی لیاقت واستعداد کے متعلق میں مطمئن نہیں تھا، نہ جانے کیسے کہ مولانا انور العظیم صاحب میرے اس خیال سے مطلع ہو گئے تھے، ایک روز آپ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ حسین احمد! تم محمد جلیل کی لیاقت واستعداد پر اپنی رائے میں نظر ثانی کرلو، کیوں کہ فنونات پڑھنے کے بعد وہ کافی مستعد ہو چکا ہے، حضرت کی اس تصدیق کے بعد مجھے محمد جلیل پر کچھ اطمینان ہوا''۔

۱۹۸۵ء کی بات تھی کہ مولوی محمد جلیل صاحب چاٹگام میں تقریباً ایک سال گزار کر دوبارہ سعودی عرب گئے، بعد میں اپنے اہل خانہ کو بھی وہیں منتقل کرلیا، جدہ میں نجی کاروبار شروع کی، اللہ تعالی نے ان کی تجارت میں کافی برکت دی، تا حال کسی قدر خوش حال ہیں۔

مولوی نور محمد صاحب خیر مورہ فاروی، بوسیدنگی:

الحاج مولانا نور محمد بن علیم الدین بن عبدالحمید بن علیم اللہ شاہ صاحب کی ولادت ۱۹۶۰ء میں جنوبی بوسیدنگ کی معروف ومردم خیز بستی خیر مورہ فارہ میں ہوئی، مکتب نشینی آپ کی آبائی بستی میں ہوئی، پھر یازدہم سے لے کر جماعتِ سیوم تک کی تعلیم جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں ہوئی، اس کے بعد اگلی تعلیم کے سلسلے میں ۱۹۷۷ء میں بنگلا دیش کا سفر کیا، اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں داخل ہوئے، یہاں دو سال پڑھ کر ۱۹۷۹ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔

جہاں تک اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا نور محمد صاحب جس زمانے میں جامعہ اسلامیہ عالیہ میں پڑھ رہے تھے، اسی زمانے میں آپ کے بڑے بھائی حضرت مولانا ولی احمد صاحب (مرحوم ومدفون مکہ مکرمہ) اسی جامعہ کے مدرس تھے، جنھوں نے اپنے عزیز بھائی کی اپنی نگرانی میں تعلیم دلائی تھی۔

فراغتِ تعلیم کے بعد آپ وطن واپس لوٹے، اور حضرت مولانا مفتی ابوالفضل صاحب لمبابیلی بوسیدنگی کی لاڈلی اور پڑھی لکھی بیٹی ساجدہ بیگم سے شادی کی۔ مولانا نور محمد صاحب نے ۱۹۸۲ء میں وطن سے ہجرت کی، اور مکہ مکرمہ میں رہائش پذیر ہوگئے، بعد میں اپنی اہلیہ کو بھی وہاں بلا لیا، آپ ابھی مدینہ منورہ میں مع اہل خانہ مقیم ہیں۔

مولانا نور محمد نے سالہا سال تک سرزمین مقدس میں مساجد کی امامت کے ساتھ ہی ساتھ دینی مدارس کی خدمات بڑی خوش اسلوبی سے نبھائیں، پھر کبھی کبھار جوارِ حرم پاک میں کچھ نجی تجارت سے بھی دل چسپی لی، جس میں اللہ تعالی نے خاصی برکت دی تھی۔

مولانا کی نو اولاد ہیں، جن میں سے چھ صاحب زادیاں اور تین صاحب زادے ہیں، صاحب زادیوں میں سے تین حافظۃ القرآن اور درجۂ متوسطہ تک کی تعلیم یافتہ ہیں، جب کہ صاحب زادے تمام کے تمام حافظ القرآن اور درجۂ ثانویہ تک کی تعلیم یافتہ ہیں، اللہ تعالی ان سب کی حیات دراز کرے۔

مولانا سے راقم سطور کی ملاقات مکہ مکرمہ میں ہوئی، جب کہ آپ کا تذکرہ عنفوانِ شباب سے مولانا حسین احمد صاحب کی زبانی سنتا آ رہا تھا، اتنے دنوں تک جہاں تک سنا تھا ملاقات کے بعد آپ کو اس سے بھی بڑھ کر پایا، اور اندازہ ہوا کہ آپ اپنے بڑے بھائی حضرت مولانا ولی احمد صاحب کے عزیز بھائی کہلانے کے مستحق ہیں، بڑے خوش اخلاق، متواضع اور ایک متقی عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ

سرزمین ارکان اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کے حوالے سے کافی فکرمند انسان ہیں، اور بڑے دل دردمند بھی۔

مولانا حسین احمد صاحب اور ان کی بلند وبالا شخصیت اور قوم وملت کے حوالے سے ان کے کردار پر مولانا نور محمد صاحب کو کافی مطمئن دیکھا گیا تھا، اور جہاں تک اندازہ ہوا کہ زندگی میں آپ نے مولانا حسین احمد صاحب کی مقدور بھر خدمات کی ہیں۔

مولانا نور محمد صاحب ملاقات کے دوران راقم سطور سے بھی شفقت اور محبت سے پیش آئے تھے، تا دم تحریر بھی آپ سے رابطے بحال ہیں، دعائیں دیتے بھی ہیں اور دعائیں چاہتے بھی، راقم کو آپ کے ہر انداز وادا میں اخلاص وللّٰہیت دکھائی دیتی ہے، اللہ تعالی آپ کی حیات میں برکت دے، اور آپ کی شفقت ومحبت کا سایہ ہم پر تا دیر باقی رکھے، آمین۔

مولوی نورالہدیٰ صاحب ندویؒ تلبنیہ وی، منگڈوی:

صدیق مکرم مولوی نورالہدیٰ بن مولانا فیاض احمد کی پیدائش تلبنیہ منگڈو میں ہوئی، لڑکپن میں والدین کے ساتھ پہلے متحدہ عرب امارات پھر سعودی عرب پہنچے، ابتدائی اور متوسطہ کی تعلیم وہیں پاکر بنگلا دیش آئے اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں جماعتِ اولیٰ تک تعلیم پائی، اس کے بعد ہندوستان کا سفر کیا، اور دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث پڑھ کر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں مسلسل دوسال پڑھ کر ۱۹۹۱ء میں کلیۃ الادب العربی سے سندِ فراغت حاصل کی، یادرہے کہ مولوی نورالہدیٰ صاحب طالب علمی کے زمانے میں ''رابطۃ الطلاب الروہانجیین'' کے لیڈر ہے، اس تنظیم کی قیادت کرتے ہوئے اس وقت ہندوستان میں زیر تعلیم روہنگیا طلباء کی بھرپور خدمت کی تھی، اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے۔

فراغت کے معاً بعد مولوی صاحب بنگلا دیش آئے، یہاں دو مہینے گزار کر والدین کے یہاں جدہ پہنچے، ابھی آپ وہاں پہنچے دو چار دن بھی گزرنے نہیں پائے کہ آپ کی شادی خانہ آبادی کی تیاری مکمل ہوگئی۔ لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا کہ رات سونے کی بستر پر کسی کی بھی بے خبری کے عالم میں آپ کا انتقال ہوگیا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا نورالہدیٰ صاحب ندوی کو بنگلا دیشی سرحد میں رہ کر ارکان اور وہاں کے مسلمانوں کی نجات کے لئے کام کرنے کا بہت ہی شوق تھا، اس حوالے سے آپ نے بارہا مجھ ناچیز سے تذکرہ کرتا رہا تھا، ایک دن کہنے لگے کہ ''میں بعض ضرورت کی بنیاد پر سعودی عرب جارہا ہوں، انشاء اللہ بہت قریبی مدت میں واپس لوٹوں گا'' واپس تو آئے نہیں بلکہ افسوس دنیا سے ہی چلے گئے۔

مولانا ایک باشعور، حساس اور بڑے باخبر عالم دین ہونے کے ساتھ ساتھ دل دردمند اور فکر ارجمند کے مالک انسان تھے، رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین ارکان برما کے سرکردہ لیڈر رہ چکے تھے، اس پلیٹ فارم سے ہندوستان میں بھی آپ نے ارکانی طلباء کی کافی خدمات انجام دی تھیں، آپ راقم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے، قومی امور کے حوالے سے آپ کے ساتھ متعدد مرتبہ سفر کا موقع ملا تھا، بڑے با اخلاق، ہنس مکھ اور سنجیدہ اور فعال انسان تھے، اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے والدین کی مغفرت فرمائے، آمین۔

مولانا حافظ عتیق الرحمن صاحب ندوی کوانچی بنگی، منگڈویؒ:

صدیق مکرم مولانا حافظ عتیق الرحمن صاحب ندوی کی پیدائش ۱۹۶۰ء میں شمالی منگڈو کی بنگلا دیش ارکان سرحدی بستی کوانچی بنگ میں ہوئی، آپ کے والد نہایت دین دار اور پرہیزگ بزرگ تھے اور والدہ محترمہ بھی نہایت پاک سیرت واعلیٰ صفات کی خاتون تھی، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

مولانا عتیق الرحمن صاحب نے تحفیظ القرآن الکریم کے ساتھ ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم بستی کے مدرسہ میں پاکر دارالعلوم میانجاپور میں داخلہ لیا، وہیں چند سال پڑھ کر اعلیٰ دینی تعلیم کے حصول کے لئے بنگلا دیش گئے اور مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری چاٹگام میں دوایک سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

مولانا عتیق الرحمن صاحب مدرسہ معین الاسلام ہاٹہزاری سے فراغت کے بعد وطن واپس آکر مختلف مدارس میں تعلیم دیتے رہے تھے، آپ نے جہاں بھی تعلیم دی وہاں آپ کو کافی پذیرائی ملی تھی، پھر اس کے چند سال بعد آپ کو مزید تعلیم کا شوق ہوا تو گھر بار اور درس وتدریس کو چھوڑ کر ہندوستان کے لئے نکلے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء جا داخل ہوئے، یہاں کلیۃ اللغۃ العربیہ میں دوسال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، ساتھ ہی ساتھ ایک خاص استاد سے پڑھ کر انگریزی میں بھی کافی عبور حاصل کرلیا تھا۔

ندوے سے واپسی کے بعد مولانا عتیق الرحمن صاحب ندوی اپنے علاقے کے مختلف مدارس میں چند سال پڑھاتے رہے تھے، لیکن افسوس ہے کہ آپ پر مگھ برمی ظالموں کی بری نظریں لگ گئی تھیں، ویسے آپ کے لئے ارکان کی زمین تنگ ہوگئی تو آپ نے مع اہل وعیال ترک وطن کر کے بنگلا دیش میں پناہ لی، ترک وطن کے بعد آپ علاقۂ چاٹگام کے مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، اور جہاں بھی گئے آپ کی بڑی پذیرائی ہوئی تھی، ماشاء اللہ آپ بڑے ہنس مکھ اور ملنسار انسان تھے، طلباء تو طلباء مدارس کے اساتذہ بھی آپ پر کافی فدا ہوتے تھے۔

مولانا عتیق الرحمن صاحب ندوی ایک جید حافظ القرآن ہونے کے ساتھ ایک بڑے پائے کے عالم دین بھی تھے، تفسیر وحدیث، بلاغت وادب، نحو وصرف اور منطق وفلسفہ کے علاوہ فقہ وفتاویٰ میں ید طولیٰ رکھتے تھے، علاوہ ازیں ایک مبصر دانش ور بھی، آپ نے ۲۰۲۱ء میں مہیش خالی میں انتقال کیا اور وہیں آسودۂ خاک ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے درجات بلند فرمائے۔

مولانا حافظ عبدالسلام صاحب ندوی کونچی بنگی، منگڈویؒ:

مولانا حافظ عبدالسلام صاحب کی پیدائش ۱۹۶۲ء میں شمالی منگڈو کی بستی کونچی بنگ میں ہوئی، تحفیظ القرآن الکریم کے ساتھ ابتدائی تعلیم اپنی آبائی بستی کے مدرسہ میں پا کر جامعہ اسلامیہ ضمیریہ پٹیہ میں داخلہ لیا، جہاں سے آپ نے دورہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد ہندوستان گئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دو سال پڑھ کر کلیۃ الادب العربی سے بھی سند حاصل کی۔

شاید حافظ صاحب زمیندار یا باثروت گھرانے کے چشم و چراغ رہے ہوں، ماشاءاللہ آپ کی تعلیمی زندگی بڑی شان وشوکت سے گزری، کافی سخی اور فراغ دل تھے، خود بھی کھاتے پیتے اور دوسروں کو بھی کھلایا پلایا کرتے تھے، میں نے آپ کے چہرے میں کبھی بھی کسی قسم کی الجھن نہیں دیکھی، بڑے ہنس مکھ اور کافی ملنسار مدبر قسم کے انسان تھے، بولتے تو دل کھول کر بولتے ورنہ خاموش رہتے تھے، آپ کی خاموشی میں بھی شاید ڈھیر سارے راز چھپے ہوئے رہتے تھے۔

دوران تعلیم مولانا عبد السلام ندوی ہماری ایک معروف طلبہ تنظیم ''رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین'' کے سرگرم لیڈر رہے، اس پلیٹ فارم سے آپ نے پاکستان کا بھی دورہ کیا تھا، ویسے آپ نے روہنگیا طلباء کی قابل قدر خدمات کی تھیں، اللہ تعالی آپ کو جزائے خیر دے، آمین۔

فراغت کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب ندوی متحدہ عرب امارات پہنچے اور وہیں مختلف مساجد کی امامت اور خطابت کے فریضے انجام دیتے رہے تھے، آپ مولانا نور الہدی ندوی اور مولانا محمد امین ندوی اور راقم سطور کے بھی قریبی ساتھیوں میں سے تھے، علاوہ ازیں مولانا حافظ عتیق الرحمن صاحب ندوی کے قریبی رشتے دار اور ان کو بہت ہی چاہنے والے تھے۔

مولانا عبدالسلام صاحب ندوی ماشاءاللہ ایک جید حافظ القرآن، بلند پایہ کے عالم دین ہونے کے ساتھ ایک دین دار اور ملت وقوم کے ہمدرد وخیر خواہ انسان تھے، ملت وقوم کی فلاح اور بہبودی کے لئے مختلف انجمنوں اور تنظیموں میں سرگرم کارکن رہے، جہاں بھی رہے بھر پور خدمت کرتے رہے تھے، اللہ تعالی کو منظور تھا کہ آپ نے ۲۰۲۱ء میں عرب امارات میں انتقال کیا اور وہیں مدفون ہیں۔

مولانا محمد امین صاحب ندویؒ نلبنیہ وی، منگڈوی:

صدیق مکرم مولانا محمد امین صاحب ندوی کی پیدائش جنوبی منگڈو کی معروف اور مردم خیز بستی نلبنیہ میں ہوئی، بچپن ہی میں اپنے والدین کے ساتھ ترکِ وطن کر کے متحدہ عرب امارات میں جا مقیم ہوئے، وہیں آپ کی ابتدائی تعلیم ہوئی، اس کے بعد حصول تعلیم کے لئے بنگلا دیش آئے اور جامعہ اسلامیہ ضمیریہ پٹیہ، چاٹگام میں چند سال پڑھ کر ہندوستان پہنچے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے کلیہ اور ماجستر کر کے سند فراغت حاصل کی۔

دوران تعلیم مولانا محمد امین ندوی رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین کے سرکردہ وسرگرم عمل لیڈر رہے، اس میں رہ کر آپ نے روہنگیا طلباء کی قابل قدر اور ناقابل فراموش خدمات انجام دی تھیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ندوی صاحب متحدہ عرب امارات میں جا کر قوم وملت کی بڑی بڑی خدمات انجام دیتے رہے تھے، مولانا موصوف بحیثیت ایک جلیل القدر عالم دین اور ذہن رساء کے مالک دانشور، اسلامی مفکر، قومی وبین الاقوامی سطح کے سیاست دان اور قابل قدر مؤلف ومصنف ہونے کے ہماری علمی، فکری، سیاسی، ثقافتی اور سماجی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہیں، مختلف خطابات کے علی الرغم آپ کے جاندار اور شاندار قلم سے آج تک لاتعداد رسالے اور مقالات منظر عام پر آ چکے ہیں، اور چند گرانمایہ تصانیف منظر عام پر آ کر کافی مقبول بھی ہوئی ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

۱۔ تاریخ ارکان کا ایک گمشدہ باب: مولانا نے تاریخ ارکان کے حوالے سے اس میں دریا کو کوزے میں بھر دیا ہے، شک نہیں ہے کہ آپ کی یہ مایۂ ناز تصنیف ارکان اور وہاں کی مسلم تاریخ کے حوالے سے ام المصادر کا درجہ رکھتی ہے، میرے خیال میں روہنگیا مسلمانوں کی اگلی نسلیں ہمیشہ اس کتاب کی محتاج رہیں گی۔

۲۔ مولانا کی دوسری ضخیم تصنیف ''حیات میر'' بھی ایک قابل قدر اور گنج گرانمایہ ہے، میرے خیال میں اس کتاب کو تصنیف کر کے مولانا نے خود پر بھی اور روہنگیا قوم کی اگلی نسلوں پر بھی بھاری احسان کیا ہے۔

مولانا محمد امین ندوی صاحب پروفیسر ڈاکٹر مولانا ابو رضا محمد نظام الدین صاحب ایم پی کے قریبی دوستوں اور ساتھیوں میں سے ہیں، آپ آج کل انٹرنیشنل اسلامی یونیورسیٹی چاٹگام بنگلا دیش کے پروفیسر اور خادم ہیں، اللہ تعالی آپ کی حیات اور صحت میں برکت دے۔ آمین۔

خاکسار محمد طاہر جمال ندوی باغگونوی، بوسیدنگی:

خاکسار محمد طاہر جمال ندوی کی ولادت ۵ / ۵ /۱۹۶۶ء میں جنوبی بوسیدنگ کی مردم خیز بستی باغگونہ (علی چنگ) میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنی بستی کے مکتب (فرقانیہ) اور سرکاری پرائمری اسکول سے پا کر جامعہ اسلامیہ عالیہ بوسیدنگ میں داخلہ لیا، یہاں سے اس نے ثانویہ تک تعلیم پا کر دارالمعارف الاسلامیہ چاٹگام میں ایک سال حضرت مولانا محمد سلطان ذوقؔ ندوی اور حضرت مولانا فرقان اللہ خلیل صاحب سے پڑھا، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ پٹیہ میں پڑھ کر ہندوستان گیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا، یہاں سے کلیۃ الادب العربی سے ماجستر کر کے ۱۹۹۱ء میں سند فراغت حاصل کی۔

خاکسار فراغت تعلیم کے معا بعد بنگلا دیش آیا اور یہاں کے مختلف مدارس میں پڑھاتا رہا تھا، جن میں جامعہ اسلامیہ حیلد رانو اہرہ اور دارالانصار چاٹگام قابل ذکر اور ناقابل فراموش درسگاہیں ہیں، پھر چند سال اس نے بعد حجاز مقدس کا سفر کیا، جہاں اس نے چند سال گزارے، اس کے بعد دوبارہ بنگلا دیش آیا ہوا ہے، حالیا تصنیف و تالیف میں مصروف اور سرگرم عمل ہے، الحمد للہ خاکسار کی چند گرانمایہ تصانیف منظر عام پر آئیں اور کافی مقبول بھی ہوئیں۔

خاکسار کے متعلق ایک قریبی ساتھی نے یوں لکھا ہے کہ:

> ’’مولانا محمد طاہر جمال ندوی (فاضل جامعہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، ہند، وتلمیذ خاص مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ) کی شخصیت ہمارے علمی اور ثقافتی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں، آپ ایک جلیل القدر عالم دین، معروف ادیب وقلم کار ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ایک نامور مورخ بھی ہیں، جن کی چند تصانیف ماشاء اللہ چھپ کر منظر عام پر آ چکیں، اور بہت ساری تصانیف اب زیر نظر بھی ہیں، مولانا کی ان تصانیف میں سے ایک مقبول ترین شاہ کار تصنیف ’’سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں‘‘ کا پہلا ایڈیشن دسمبر ۱۹۹۹ء اور دوسرا ایڈیشن ۲۰۲۳ء میں مرتبہ چھپ کر منظر عام پر آئی، جسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، اور ہر ایک ایڈیشن چند مہینے گزرتے نہ گزرتے سارے کے

> سارے ختم ہو گئے تھے، تو ہر طرف سے آواز اٹھی تھی کہ اس گرانمایہ تصنیف کا تیسرا ایڈیشن بھی کیا جائے، لیکن مصنف کی بعض مجبوری اور معذوری، دیگر مصروفیات اور اسفار کے علاوہ حالات کی کچھ ناقابل بیان دباؤ کی وجہ سے ہزار مانگ اور وطلب کے باوجود اس کا تیسرا ایڈیشن اب تک نہ ہو سکا تھا‘‘۔ اس شاہکار تصنیف کے حوالے سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد گرامی ملاحظہ ہو کہ:

> ’’راقم کو عزیز گرامی مولوی محمد طاہر جمال ندوی زاداللہ توفیقا کی کتاب ’’سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی پس منظر میں‘‘ کو دیکھ کر مسرت ہوئی، ایسے بہت سے اسلامی ممالک اور قطعات زمین جہاں آزادی کی جنگ لڑی گئی یا بلند نیک مقاصد کے لئے طویل جدوجہد ہوئی اور قربانیاں دی گئیں، لیکن ان موقف اور کارناموں کی تاریخ پورے طور پر قلم بند نہیں ہوئی، حالانکہ کم سے کم ان علاقوں اور جدید نسل کو معلوم ہونے کی ضرورت تھی کہ ان کے اسلاف نے جنگ آزادی کی کیا قیمت ادا کی، کیا قربانیاں دیں اور کس طرح اس کا استحقاق پیدا کیا اور بیرون ممالک کے تاریخ نویسوں اور تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو ہونا چاہئے کہ اس ملک اور علاقہ کا ماضی میں کیا کردار رہا ہے اور اس نے کیا قربانیاں دیں اور آزادی اور وقار وعزت کی کیا قیمت ادا کی۔
>
> فاضل عزیز مولوی محمد طاہر جمال ندوی شکر اور سپاس کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بڑی محنت اور مطالعہ اور لیاقت کے ساتھ اس فرض کو انجام دیا، اپنے وطن کا حق ادا کیا اور تاریخ کے خلا کو پر کیا جو عرصہ سے پایا جاتا تھا‘‘۔

اور حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی رئیس تحریر البعث الاسلامی وصدر شعبہ ادب عربی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ لکھتے ہیں کہ:

> ’’ہمارے عزیز دوست مولانا محمد طاہر جمال ندوی نے تاریخی پس منظر میں سرزمین

ارکان کی تحریک آزادی پر کتاب لکھ کر نہ صرف دعوتی اور تحریکی، اسلام پسند طبقے پر احسان کیا ہے، بلکہ مسلمانوں کے کارناموں، ان کی جدوجہد، دعوتی اور فکری کوششوں سے تعلق رکھنے والے حلقے کے لئے معلومات کا ایک خزانہ پیش کردیا ہے- میں مولف کو اس کامیاب کوشش پر دلی مبارکباد دیتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس کتاب کو قبول عام عطا فرمائیں اور ہر طرح سے مفید بنائیں، واللہ ولی التوفیق''۔

اور دور حاضر کے عظیم زعیم ومفکر اور مسلم ہندوستان کے قابل قدر لیڈر ورہنما حضرت مولانا سید سلمان الحسینی ندوی سابق صدر شعبۂ علوم اسلامیہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، وصدر جمعیۃ شباب اسلام انڈیا نے اس کتاب کے متعلق لکھا ہے کہ:

'' تاریخ کے یہ سرخ صفحات بھولے بسرے ہوئے جاتے تھے، برادرم محمد طاہر جمال ندوی شکریہ اور داد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے تاریخ کے اوراق کو کھنگالا، بکھرے ہوئے مواد کو اکھٹا کیا، معلومات کا گلدستہ تیار کیا، ارکان کے مسلمانوں کو ان کا عہد رفتہ یاد دلایا اور پوری امت اسلامیہ کو بیداری کا ایک پیام دے دیا، کہ جاگتے رہو اور گذشتہ تجربات سے سبق حاصل کرتے رہو، جدوجہد آزادی سے کبھی غفلت نہ برتنا، اور اسلام کی حقیقی دعوت کو کبھی فراموش نہ کرنا- اللہ تعالیٰ اس نوخیز مصنف کو جزائے خیر دے اور اس کوشش کو بارآور فرمائے آمین-

اور مایۂ ناز عالم دین وادیب اریب حضرت مولانا نذر الحفیظ ندوی، ازہریؒ استاد علوم اسلامیہ وادب عربی دارالعلوم ندوۃ العلماء نے یہ لکھا ہے کہ:

'' عزیز گرامی قدر مولوی طاہر جمال ندوی نے ارکان میں تحریک آزادی کی جدوجہد اور وہاں کی مختلف شخصیات نے اس میں جو حصہ لیا ان پر ایک مفصل اور مستند کتاب تیار کی ہے، ہم نے جا بجا سے کتاب دیکھی ہے، زبان اردو ہے لیکن ادیبانہ اسلوب اور مورخانہ انداز مصنف نے اختیار کیا ہے، یہ کتاب دعوتی اور تربیتی

کام کرنے والوں کے لئے بڑی مفید اور چشم کشا ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اشاعت کی کوئی سبیل پیدا فرماوے، اگر عربی میں کتاب منتقل ہوجائے تو عرب دنیا کے دعوتی اور تربیتی حلقوں کے لئے بڑی مفید ثابت ہوگی''۔

اور حضرت مولانا اڈووکٹ شفیق احمد صاحب تنگ بازاری بوسیدنگیؒ بی، اے، ایم، اے، ایم، ایل، ایل، بی، سابق اڈووکٹ بنگلا دیش سپریم کورٹ کی تحریر خاکسار کی اس تصنیف کے حوالے سے ملاحظہ ہو، چنانچہ آپ نے لکھا ہے کہ:

'' عزیز کی یہی شاہکار تصنیف اپنی جلو میں اہم اور خاصی دستاویزات رکھتی ہے، ساتھ ساتھ انداز ترتیب میں بھی جوفنی جوہر اور جدت کا مظاہرہ کیا وہ آں عزیز ہی کا حصہ ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ کام بڑا کٹھن تھا جسے نبھانے کے لئے کم از کم ایک علمی اور تحقیقی مجلس 'ایکاڈیمی) کی ضرورت تھی، مگر عزیز موصوف کے یہ صبر وتحمل، سلامت طبع اور دقت فکر ونظر کا ثمرہ تھا کہ انہوں ایسے پر کٹھن کام کو بڑی حسن اسلوبی سے انجام تک پہنچایا، آفریں بر آفریں بریں ہمت یکتائے تو کہنے کے سوا مجھ سا بے مایہ سے اور کیا ہوسکتا ہے؟ میری نظر میں عزیز موصوف کی یہ کاوش نہ صرف سرزمین ارکان کی ایک اچھی خاصی دستاویز ہے بلکہ دنیائے تاریخ میں ایک قابل تحسین اضافہ بھی، باشندگان ارکان اور خطۂ زمین سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کے لئے یہ نادر تصنیف ایک گراں مایہ تحفہ ہے، دربار رب العزت میں خاص دلی دعا ہے کہ وہ اس غیر معمولی شاہکار کو قبول فرمائیں اور مصنف عزیز کو اسلام اور انسانیت کی مزید خدمات کی توفیق سے نوازیں، وما توفیقی الا باللہ''۔

اور عظیم نامور دانشور، فلسفی مورخ ڈاکٹر معین الدین احمد خان، پروفیسر اسلامی تاریخ وثقافت، چاٹگام یونیورسیٹی، بنگلا دیش نے اس کتاب کے مقدمہ لکھنے کے دوران ایک جگہ پر یوں لکھا ہے کہ:

'' میں اسے ارکان اور روہنگیا مسلمانوں کے مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں اور دنیا کی سچی تاریخ ڈھونڈھنے والوں کے استفادہ کے لئے اشاعت اور اسے قارئین

کرام کے مابین وسیع پیمانے پر توزیع وتقسیم کرنے کو ضروری سمجھتا ہوں، آخر میں میری عرض اور تمنا یہی رہے گی کہ اسے دوسری زبانوں، خصوصا عربی، بنگلا، انگریزی، برمیز، ملایو میں ترجمہ کیا جائے، تاکہ اس کی افادیت میں وسعت آئے“۔

پروفیسر صاحب آگے لکھتے ہیں کہ:

”یہ حسین وجمیل گلدستہ اور زندہ ومنہجی کاوش (METHODOLOGY) ایک عالمانہ وفاضلانہ، ادیبانہ ومبصرانہ، تحلیلانہ ومحققانہ کوشش ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر قابل اخذ مصادر ومراجع، نایاب دستاویزات اور تحقیقی اخبارات بھی رکھتی ہے، اور مصنف نے اسے اخذ کر کے موزون اور برمحل موقع پر کام میں لانے میں جس دوراندیشی ودوربینی کا مظاہرہ کیا وہ ان کا امتیازی حصہ ہے۔ بلاشبہ مصنف کی یہ کاوش ارکان اور روہنگیا مسلمانوں کی تاریخ کے متعلق ضروری اور کام آنے والی اخبارات واطلاعات اٹھانے والی بتائی جاسکتی ہے، یہ پوری دنیا کے ان پڑھنے والوں کے لئے جو تاریخ انسان وانسانیت کی راز جوئی کے لئے کوشاں اور سرگرداں ہیں، بڑی موزون اور کام آنے والی دستاویز ہے“۔

خاکسار کی انمول اور شاہکار تصنیف ”تذکرۂ علامہ سید الامینؒ“ سن ۲۰۲۰ء میں دار البحوث والمناصرة الاسلامیہ چاٹگام، بنگلا دیش نے طباعت کر کے منظر عام پر لائی، جو بھی بہت مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہے، اس تصنیف کے بارے میں بہتوں اہل نظر نے بہت کچھ کہا اور لکھا ہے، جن میں سے استادِ محترم حضرت مولانا فرقان اللہ خلیل صاحب نے کی کچھ تحریر ملاحظہ ہو کہ:

”عزیز مصنف کی تعلیم وتربیت کے مراحل جن علمی وفکری درس گاہوں میں طے ہوئے، اور جن جید اساتذہ اور معروف صاحبانِ علم وعمل وفکر وفراست کی صحبتیں انہیں میسر آئیں، ان سب نے ان کی فطری استعداد میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ میری نظر میں وہ ایک وسیع الاطلاع قلم کار ہیں، اور تاریخ کے حوالے سے ماضی قریب و بعید کے گونا گوں حالات وواقعات سے خاصے واقف، اور ارکان کے عہد حاضر کی

مختلف تحریکوں اور سرگرمیوں اور وہاں کے قومی وملی رجحانات سے بھی بخوبی آگاہ ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں فطرت نے تاریخ وتذکرہ، اور سیرت وسوانح نگاری کے حوالے سے ایک خصوصی ذوق اور اختصاصی مزاج عطا کیا ہے، ماشاء اللہ ان کے ذہن رسا نے انہیں وہ علمی وفکری بصیرت عطا کی ہے، جس کے ذریعے وہ احقاق حق اور ابطال باطل کے لئے اپنے اشہب قلم کو جنبش دیتے اور تحقیق جیسے خارزاروں میں قدم چلاتے رہے ہیں، اور ان کے تیشۂ تحقیق نے بیشۂ علم وفن میں جو جواہر ریزے اور صدف پارے تیار کئے ہیں، ان میں سے کچھ چیزیں قارئین کرام کو زیر نظر کاوش میں مختلف عنوانات کے تحت سینکڑوں صفحات میں پھیلی ہوئی دکھائی دیں گی، ماشاء اللہ بڑی روانی وطغیانی کے تہہ بتہ ان کا قلم شستہ اور پیرایہ شگفتہ ہے، سادگی میں پرکاری کے نقوش ان کی تحریر کا ایک نمایاں خاصہ بھی ہے، ع:

خدا کرے کہ یہی سلسلہ دراز رہے“۔

مولانا فرقان اللہ خلیل صاحب دامت برکاتہم نائب مہتمم جامعہ دار المعارف الاسلامیہ چاٹگام ومدیر ماہنامہ ”الحق“ نے اور ایک جگہ یوں لکھا ہے کہ:

”مصنف عزیز نے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ بہت ساری فکری، تاریخی اور علمی کتابیں لکھی ہیں، مگر ان کے قلم کا اصلی زور اور جوہر پارے سیرت نگاری کے میدان میں کھلتے ہیں، ان کے متنوع علمی اور فکری کارناموں میں سیرت وسوانح نگاری گویا گلِ سرسبد کی حیثیت رکھتی ہے۔ انہوں نے مولانا سید الامین صاحب کی سوانح ”تذکرۂ علامہ سید الامینؒ“ میں ایک ایسا خاکہ اور نقشہ پیش کیا ہے کہ جو عام فہم ہونے کے علاوہ تاریخی اور سوانحی حقائق سے بھی لبریز ہے، جس میں قدم قدم پر وسعت اطلاع، ورق ورق پر حقائق کا انبار، سطر سطر میں حالات کی نقشہ نگاری، لفظ لفظ میں تحقیق وتفتیش، حوالہ جات میں حزم واحتیاط، پیراگرافوں میں استخراجِ نتائج، اور ہر مقام میں اسلوب کی سادگی اور قلم کی کرشمہ سازیوں کا اعجاز دکھائی دیتا ہے۔ اور یہ

بات حقیقت پر مبنی ہے کہ مولف عزیز نے ارکان کی اس عظیم ہستی کے تذکرے کو جس محنت وسلیقے سے جمع کیا ہے، یہ اہل فکر ونظر پر ان کا ایک بھاری احسان کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ پندرہ ابواب پر مشتمل پانچ سو سے زائد صفحات پر پھیلی ہوئی جامع سوانح ہمارے اہل علم وفکر کے لئے بلاشبہ ایک تحقیقی سوغات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس سوانح کے مطالعہ سے ہمارے قارئین کرام ماضی قریب کی ایک عظیم شخصیت کے احوال سے نہ صرف واقف ہوں گے بلکہ ان کو یہ بھی اندازہ ہوگا کہ قحط الرجال کے اس عالم میں فطرت نے حاملان ملت اسلامیہ کی بیداری اور ان کی دینی اقدار کی پاسبانی کے لئے کیسے کیسے مشاہیر کو پیدا کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ تذکرہ دراصل ایک ملی وقومی فریضہ تھا، جسے بحمد اللہ ادا کیا گیا ہے، اور جس محنت، عقیدت اور لگن سے مصنف نے اس فریضہ کی تکمیل کی ہے، وہ بلاشبہ ان کا اپنا حصہ ہے، جو قابلِ داد بھی ہے اور لائقِ صد تحسین بھی۔ اللہ تعالی مصنف عزیز کی حیات دراز کرے، تاکہ وہ اپنے قلم کی جولانیوں سے مزید نقوش مرتب کر سکیں۔

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد''۔

خاکسار کی اور ایک تصنیف ''تذکرہ حضرت مولانا شاہ عبد السلام صاحب ارکانیؒ'' کے جامع مقدمہ لکھنے کے دوران گرامی قدر محترم پروفیسر ابو رضا محمد نظام الدین صاحب ندوی ایم پی (چیرمن ٹرسٹی بورڈ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسیٹی چاٹگام) نے یوں لکھا ہے کہ:

''بہر حال آمدم بر سر مطلب کہ حضرت ارکانی صاحبؒ کی سوانح حیات کو لکھ کر منظر عام پر لانا آپ کے منتسبین ومتعلقین کے سر پر عموما اور خلفائے کرام کے سر پر خصوصا ایک بھاری قرض تھا، لیکن بقول کسے ''دیر آید درست آید'' کہ اللہ تعالی نے اس قرض کو بحسن وخوبی ادا کرنے کے لئے خود ارکانی صاحبؒ کے وطن کے ایک ندوی فاضل عزیز مکرم مولانا محمد طاہر جمال ندوی کو چنا ہے، جنہوں نے ''تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبد السلام ارکانیؒ'' تصنیف کر کے جہاں کمال لیا

قت کے ساتھ اپنی ذمے داری کا حق ادا کیا ہے تو وہاں حضرت کے منتسبین و متعلقین کے علاوہ دنیائے علم عرفان سے وابستگی رکھنے والی اگلی نسل پر ایک بھاری احسان بھی کیا ہے۔

عزیز مصنف نے اپنی تعلیم وتربیت کے آخری مراحل دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ ہند کے عظماء ومشاہیر کے سامنے طے کئے، اللہ تعالی نے ان کو تاریخ وتذکرہ اور سیرت وسوانح نگاری کے لئے ایک خصوصی ذوق اور اختصاصی مزاج بخشا کیا ہے، یوں تو انہوں نے بہت ساری فکری، تاریخی اور علمی کتابیں تصنیف کی ہیں، مگر ان کے قلم کا حقیقی زور اور جوہر پارے سیرت وسوانح نگاری کے میدان میں جا کھلتے ہیں، ماشاء اللہ ہر مقام میں اسلوب کی سادگی کے ساتھ پرکاری اور قلم کی روانی اور جولانی کے ساتھ کرشمہ سازی دکھائی دیتی ہے۔

درحقیقت مصنف نے ارکان کی اس عظیم المرتبت ہستی کی سیرت کو جس محنت، لگن اور سلیقے سے جمع ومرتب کیا ہے، بلاشبہ یہ ایک تحقیقی سوغات کا درجہ رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کے مطالعہ سے قارئین کرام نہ صرف ماضی قریب کے ایک عظیم اور باکمال ہستی کے حالات وکوائف اور ان کے مقام عالی سے واقف ہو کر ان کی تعلیمات سے مستفید ہو سکیں گے، بلکہ ان کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ اللہ تعالی نے حاملان ملت اسلامیہ کے رشد وہدایت واصلاح احوال کے لئے کیسے کیسے عظماء ومشاہیر کو پیدا کیا ہے''۔

خاکسار کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف کا ایک گوشوارہ

☆سرزمین ارکان کی تحریک آزادی تاریخی	☆سازش کا طوفان عقلیت ومادیت کے روپ میں
☆روہنگیا مسلمانوں کے جانگسل المیے	☆تذکرۂ علامہ سید الامینؒ
☆تذکرۂ حضرت مولانا شاہ عبد السلام ارکانی	☆روہنگیا مسلمان اور ان کی ہجرت کے اسباب
☆ارکان کے عظیم شاعر علاول، حیات وکارنامے	☆ارکان روہنگیا یونین، ماضی اور حال کے تناظر میں

☆روہنگیا چیخ وپکار اور مطالبات (ترجمہ)	☆حیاتِ نور
☆وادئ پرخار کے گمنام مسافر	☆سالارِ کارواں محمد جعفر حبیبؒ
☆سرخیل کارواں	☆جمعیت علمائے اسلام ارکان
☆روہنگیا رسم الخط کا ایک علمی اور فکری جائزہ	☆روداد سخن
☆نقوش خیال	☆حیاتِ ڈاکٹر محمد یونس
☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱)	☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۲)
☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۳)	☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۴)
☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۵)	☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۶)
☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۷)	☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۸)
☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۹)	☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱۰)
☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱۱)	☆ تاریخ ارکان کے درخشان ستارے، جلد (۱۲)
☆برما میں خانہ جنگی کا دور دورہ	☆ارکان کا جغرافیہ

خاکسار ہندوستان کی تعلیم کے دوران ''رابطۃ الطلاب المسلمین الروہنجیین کا سرگرم رکن تھا، ۱۹۹۸ء میں ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی اسٹنڈنگ کمیٹی (NSC) کا ممبر پھر ۲۰۰۰ء میں اس تنظیم کی مجلس عاملہ (CEC) کے ممبر ہونے کے ساتھ شریعہ کونسل کا صدر بھی رہا، پھر وہ اپنے سعودی عرب کے سفر کے دوران وہاں اس مذکورہ تنظیم کی جانب سے مندوب بھی رہ چکا تھا، علاوہ ازیں حال میں تشکیل پانے والی قومی تنظیم ''ارکان روہنگیا نیشنل الائنس (ARNA) کا اراین سی (RNC) ممبر بھی ہے۔

خاکسار محمد طاہر جمال ندوی مقیم حال چاٹگام ہر ایک بھائیوں اور خیر اندیشوں سے دعا کی درخواست کرتا ہے کہ اللہ تعالی اپنے فضل وکرم سے اسے خیر وعافیت سے رکھتے ہوئے ملت وقوم کی خدمات کی مزید توفیق عنایت کرے۔

مولوی عبدالرحمن صاحب ندوی سندی فرانگی، بوسیدنگی:

مولوی عبدالرحمن ندوی قاسمی صاحب کی پیدائش جنوبی بوسیدنگ کی مردم خیز بستی سندی فرانگ میں تقریبا ۱۹۷۰ء میں ہوئی، ابتدائی اور متوسطہ کی دینی تعلیم اپنی آبائی بستی کی معروف درسگاہ ''مدرسہ اشاعت العلوم سندی فرانگ'' میں پائی، اس کے بعد مدرسہ محمدیہ فرانفورومنگڈو میں داخلہ لیا، یہاں چند سال حضرت مولانا سید الامین صاحبؒ وغیرہ سے پڑھ کر ہندوستان کا سفر کیا اور دارالعلوم دیوبند میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی، اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں دوسال پڑھ کر کلیہ اللغۃ العربیۃ کی سند حاصل کی اور بنگلا دیش چلے آئے، مولوی صاحب نے راقم سطور کے ساتھ ''مدرسہ دار الانصار چاٹگام'' میں چند سال تعلیم دی، اس کے بعد وطن جا کر شادی خانہ آبادی کی سنت ادا کی۔

مولوی عبدالرحمن ندوی صاحب کے سسر حضرت مولانا مفتی یوسف جلال صاحب رائی شنگ فاروی، سندی فرانگیؒ میرے استاد رہ چکے ہیں، مفتی صاحب ٹنڈ الہ یار کے فارغ التحصیل تھے، بہت بڑے عالم دین اور منجھے ہوئے مدرس ہونے کے ساتھ بڑے بہادر، غیور اور خود دار بھی تھے۔

مولوی عبدالرحمن ندوی صاحب نے ''دار الانصار'' چاٹگام میں چند سال تعلیم دے کر وطن عزیز ارکان کا رخ کیا، وہیں مختلف مدارس میں پڑھاتے رہے تھے، لیکن ظالم مگھ اور برمی دہشت گردوں نے آپ کو وطن میں جینے نہیں دیا، آپ پر ان وحشی دہشت گردوں نے ایسے ایسے مظالم ڈھائے جنہیں سن کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے اور آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں، ویسے آپ دوبارہ مع اہل خانہ چاٹگام چلے آئے، اور چاٹگام کے جنوبی علاقہ پدوا میں مقیم وہاں ایک مدرسہ کے مدرس ہیں۔

مولوی عبدالرحمن صاحب ندوی قاسمی ماشاءاللہ بڑے جید عالم دین ہیں، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، ادب وبلاغت، نحو وصرف، منطق وفلسفہ غرض ہر فن کے مولی ہونے کے ساتھ ماشاءاللہ بڑے قابل قدر مدرس ومعلم بھی ہیں۔

شنید ہے کہ مولوی عبدالرحمن صاحب نے حال ہی میں ایک کتاب بھی تصنیف کی ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالی اس کتاب کی اشاعت کی کوئی راہ پیدا کر دے، ماشاءاللہ لکھاری ہونے ساتھ دین اور علم دین کی خدمات میں مصروف عمل ہیں، اللہ تعالی ان کی حیات دراز کرے، آمین۔

مولوی محمد ایوب صاحب ندوی ہولا پوی، بوسیدنگی:

مولوی محمد ایوب ندوی کی پیدائش جنوبی سیدنگ کی معروف بستی ہولا پے میں ہوئی، ابتدائی تعلیم علاقے کے مکتب و مدارس میں ہوئی، اس کے بعد بنگلا دیش کے مختلف مدارس میں تعلیم پا کر ہندوستان پہنچے اور دارالعلوم ندوے میں چند سال پڑھ کر سند فراغت حاصل کی۔

مولوی صاحب کے بڑے بھائی مولوی محمد یونس صاحب شہید کبھی راقم کے ہم جھولی رہ چکے تھے، بڑے بلند اخلاق کے طالب علم اور عالم دین مدرسہ مظاہر العلوم سرسکتائی چاٹگام کے فارغ التحصیل تھے، انہوں نے اپنی تعلیمی زندگی کے آغاز میں ''روہنگیا فدائینِ محاذ (RPF)'' میں شامل ہو کر عسکری تربیت لی، محاذ کی طرف سے لیبیا میں بھی عسکری تربیت پائی، ہمارے قومی قائد محمد جعفر حبیب کے نہایت قریبی اور عزیز ترین ساتھیوں میں ان کا شمار تھا، بڑے وفا شناس مجاہد تھے، قائد کے انتقال کے بعد مولوی محمد یونس صاحب روہنگیا سالیڈ ریٹی آرگنائزیشن میں شامل ہو کر ۱۹۹۴ء کے جہاد میں جنوبی منگڈو گئے، ایک قابلِ قدر مجاہد فی سبیل اللہ تھے، جہاں انہوں نے ظالم برمی فوج سے لڑتے لڑتے جام شہادت نوش کیا، اللہ تعالی ان کے درجات بلند فرمائے۔

مولوی محمد ایوب دار العلوم ندوۃ العلماء سے فراغت کے بعد بنگلا دیش آ کر دین وملت اور وطن عزیز کی خدمات انجاد یتے رہے ہیں، مولوی محمد ایوب صاحب ہمارے ایک مکرم دوست مولانا ڈاکٹر مظفر حسین ندوی (لکچرر انٹرنیشنل اسلامی یونیورسیٹی چاٹگام) کے قریبی عزیزوں میں سے ہیں، ماضی قریب میں ڈاکٹر صاحب کے زیر اہتمام چلنے والے ایک مدرسہ کے خادم یا مدرس بھی رہ چکے ہیں۔

مولوی محمد ایوب صاحب آج کل جنوبی چاٹگام کی ایک درسگاہ میں مدرسی کے فریضے انجام دے رہے ہیں، انٹرنیشنل اسلامی یونیورسیٹی چاٹگام کے بعض ضروری پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں، ویسے رہ رہ کر راقم کے ساتھ ان کی ملاقاتیں ہوتی رہتی ہیں، نہایت خلیق اور کریم النفس انسان ہیں۔

مولانا محمد ایوب صاحب جس طرح عرض کی گئی ہے کہ مولوی محمد یونس جہادی شہید ہولا پوی کے حقیقی بھائی نہایت کم گو اور بڑے خلیق عالم دین ہیں، الحمد للہ دین اور تعلیم دین کی خدمات میں بڑی یکسوئی کے ساتھ مصروفِ عمل ہیں، اللہ تعالی مولانا محمد ایوب کی حیات درازی کے ساتھ ان کی تمام خدمات کو شرف قبولیت بخشے، آمین۔

مولانا حسین احمد صاحب کوار بیلی، منگڈوی:

مولانا حسین احمد صاحب بن مولانا مقبول حسین صاحب شمالی منگڈو کی معروف بستی کوار بیل میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد حضرت مولانا مقبول حسین صاحب ایک جید عالم دین درویش صفت انسان ہونے کے ساتھ بڑے خادم ملک وملّت بزرگ تھے، دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے، کہتے ہیں کہ آپ ہی نے دارالعلوم سے فراغت تعلیم سے واپسی کے دوران حضرت العلامۃ محمد ابراہیم صاحب قطنی رحمۃ اللہ علیہ کو ارکان لایا تھا، اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ:

> ''مولانا مقبول حسین صاحب مرحوم سرزمین ارکان کی وہ مبارک ہستی تھے، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند سے حضرت مولانا ابراہیم قطنی رحمۃ اللہ علیہ کو ساتھ لا کر سرزمین ارکان کو رونق بخشا تھا''۔

مولانا حسین احمد صاحب سرزمین ارکان کے جیّد علمائے دین کی فہرست میں شامل ہیں، طالب علمی کے زمانے سے آپ کی شہرت چار دانگ عالم میں ہوگئی تھی، علم دین کے ساتھ ساتھ عصری علوم میں بھی درک رکھتے ہیں، آپ نے مکتب نشینی کے تہ بتہ چوتھی جماعت تک برمیز کی تعلیم بھی حاصل کی، آپ کے والد گرامی نے اپنے ہونہار بچہ کی تعلیم میں خاصی نظر رکھی تھی، والد گرامی کے علاوہ آپ کا نانا مرحوم ماسٹر عمر حمزہ پرامپوروی نے اپنے نواسہ کی اچھی تعلیم کے لئے بڑی عرق ریزی سے کام لیا تھا، مولانا حسین احمد صاحب کی تعلیمی زندگی کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب رقم طراز ہیں کہ :

> ''مولانا حسین احمد صاحب بچپن میں چار کلاس تک برمیز کی تعلیم حاصل کی، آپ کے برمیز کے استاد ماسٹر مختار احمد صاحب کوار بیلی ایک ماہر استاد کی حیثیت سے علاقے بھر میں معروف تھے، انہوں نے دوران تعلیم آپ پر خاص توجہ مبذول کر رکھی تھی، یوں تو مولانا نے چار جماعت تک برمیز کی تعلیم حاصل کی، مگر آپ نے اپنی خداداد ذہانت کی زور سے برمیز میں اتنی لیاقت حاصل کر لی کہ آپ کے سامنے میٹرک پاس کرنے والے لوگ بھی برمیز زبان کے حوالے سے کچھ کہنے لکھنے کی ہمت نہیں کرتے ہیں، مولانا نے بہت کم مدّت میں مکتب کی تعلیم حاصل کر کے

مدرسہ محمدیہ پرمپورو میں داخلہ لیا، یہاں سے آپ نے باضابطہ تعلیم کا آغاز کیا، اور یہاں سے فراغت حاصل کی، پرامپورو آپ کے نانہال کی بستی ہے، موصوف کا نانا جان مرحوم ماسٹر عمر حمزہ صاحب بڑے حاذق دماغ شخصیت تھے، جنہوں نے آپ کی تعلیم پر خاص نظر رکھی تھی ۔ مولانا موصوف ذہن وذکاوت، شکل وصورت اور قدوقامت کے اعتبار سے بھی اس علاقہ کی بے مثال شخصیت ہیں، ذہن وحافظہ کے اعتبار سے بھی آپ کا مرتبہ نہایت اعلی ہے، آپ نے اس درس گاہ میں بڑی محنت اورعرق ریزی سے تعلیم حاصل کی، آپ کی آواز نہایت پرکشش ہے، ویسے شعبۂ قرأت میں بھی آپ نے بڑا نام کی پایا تھا، آپ کوعلوم عقلیہ ونقلیہ میں بڑی مہارت حاصل ہے، آپ کی جماعت میں یوں تو شروع ہی سے ذہین اور محنتی طالب علم کی کمی نہیں تھی، خاص طور پر جماعت سوم سے دورۂ حدیث تک چند ذہین اور فطین طالب علم شامل تھے، جن میں جنوبی منگڈو کے معروف عالم دین ومحدث مولانا مشتاق احمد صاحب ناقابل فراموش ہیں ۔ ان کے علاوہ بھی اور چند ایسے طالب علم تھے، جن کا شمار سرزمین ارکان کے حالیہ دور میں جیّد الفکر علماء میں ہوتا ہے، حضرت العلاّمہ مولانا سید الامین صاحب مرحوم نے ان کی ذہانت فطانت کو دیکھ کر اس درس گاہ میں فنونات عالیہ کا درجہ کھولا، یوں مولانا نے حضرت مولانا سید الامین اور دیگر علمائے کرام سے فنونات عالیہ کی کتابیں پڑھیں، جن میں قاضی، حمد اللہ، صدرا، میرزاہد امور عامہ، شمس بازغہ، میرزاہد جلال، اقلیدس، شرح چغمنی، حجۃ اللہ البالغہ للشاہ ولی اللہ الدہلوی، رسالہ عبد الغفور، ملاّ جلال جیسی کتابیں شامل ہیں، یہ وہ زمانہ تھا، جس میں جامعہ اسلامیہ پرامپورو میں حضرت مولانا سید الامین رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ وقت کے اور بھی چند جید علمائے دین درس دیا کرتے تھے، جن میں حضرت العلامہ مولانا ابوالحسین صاب عرب شا فاروی، شیخ الحدیث حضرت مولانا عبد الحکیم خوار بیلیؒ، حضرت مولانا محمد امین صاحب ناری بیلیؒ، حضرت مولانا قاری محمد یوسف صاحب رامیور بیلیؒ، حضرت مولانا منیر احمد صاحب رامیور بیلیؒ،

ناچیز راقم الحروف (مولانا شبیر احمد صاحب) حضرت مولانا سید حسین صاحب عرب شاہ فاروی شامل تھے، دراں حالیکہ جامعہ اسلامیہ پرامپورو کی خطہ ارکان میں اتنی شہرت ہو چکی تھی کہ اسے بعض جید طلبہ جامعہ اسلامیہ ہاٹہزاری اور جامعہ اسلامیہ پٹیہ سے بھی تعلیمی اعتبار سے برتر قرار دینے پر تلے ہوئے تھے، اسی زمانے میں حضرت قاری القراء، جامع المعقول والمنقول عبد الکریم صاحب منگنماوی بھی اس جامعہ میں تعلیم دیتے تھے، مگر حضرت نے بعد میں وطن سے ہجرت کی، اور آپ سرزمین مقدس مکہ مکرمۃ میں چند سال گزار کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اور جنت المعلی میں سپرد خاک ہوئے۔

مولانا حسین احمد صاحب طالب علمی کے زمانے سے آج تک اس علاقہ کا درخشاں ستارہ ہیں، دوران تعلیم آپ کو تمام اساتذہ بڑی محبت اور پیار بھری نظروں سے دیکھتے رہے تھے، آپ پر حضرت مولانا سید الامین کی خاص نظر تھی، چنانچہ فراغت تعلیم کے بعد اپنی منجلی بیٹی سنجیدہ کی شادی ان سے کرادی۔

مولانا حسین احمد نے تعلیم سے فراغت کے بعد ہی اسی جامعہ سے تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔ نحو، صرف، منطق اور فلسفہ وادب کا درس دینا شروع کیا، ان سارے فنون کی مختلف کتابیں ذوق وشوق سے پڑھاتے رہے، بعد میں جب اپنے سسرال کی بستی منگنما میں مدرسہ توحیدیہ قائم ہوا تو اپنے لائق سسر حضرت مولانا سید الامین صاحب کے ساتھ اس مدرسہ میں منتقل ہو گئے، یہاں بھی آپ نے بڑی محنت اور ذوق وشوق سے تعلیم دی۔

مولانا حسین احمد صاحب اپنے لائق وفائق سسر حضرت مولانا سید الامین صاحبؒ کی خلوت وجلوت کے ساتھی رہے، زندگی کے ایک طویل عرصے ان کے ساتھ گزارے، حضرت کی ہر مشکلات ومعضلات میں ساتھ دیتے رہے، حضرت مولانا مرحوم کے ساتھ اکیاب، چوکپرو، رنگون کے علاوہ انگنت مقامات کا سفر کیا، مولانا نے اپنے سفر کے ہر مرحلے میں تعاون کیا، مولانا سید الامین صاحب چوں کہ برمی

زبان سے ناواقف تھے، یوں برما میں آپ جہاں بھی گئے وہاں مولانا حسین احمد صاحب آپ کے ترجمان رہے تھے، علاوہ ازیں حضرت مولانا مرحوم جہاں جہاں بھی دینی خدمات انجام دیتے رہے، مولانا حسین احمد صاحب بھی حضرت کا ساتھ دیتے رہے تھے، جامعہ پرامپورو، جامعہ توحیدیہ کے علاوہ جامعہ اسلامیہ نکھورہ میں بھی آپ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہ چکے تھے، جامعہ توحیدیہ منگنما میں آپ صدرالمدرسین کے عہدہ پر فائز تھے، غرض تعلیمی، تدریسی، علمی وفکری حوالے سے آپ کی خدمات بہت زیادہ ہیں۔

۲۰۱۲ھ کے دوران ملک میں فسادات ہوئے اور ملکی حالات دگرگوں ہوگئے تو ناچار ہوکر آپ کو گھر میں عزت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا، آج کال ذکر وعبادات، تزکیہ واحسان میں مگن ہیں، چوں کہ ظالم حکومت کی آپ پر کڑی نظر ہے اس لئے آپ کو اپنا قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑ رہا ہے، الامان والحفیظ''۔

مولانا حسین احمد کو حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ کا شرف بھی حاصل ہوا ہے، شادی کے کچھ سال بعد آپ نے حجاز مقدس کا سفر کیا، حجاز میں چند سال رہے، اس مبارک سفر سے پہلے آپ کا بیٹا عنایت الرّحمن پیدا ہوا تھا، لیکن آپ ابھی سفر میں تھے کہ اس کا انتقال ہوگیا، چنانچہ اس حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''مولانا حسین احمد صاحب سعودی عرب بھی گئے تھے، حجاز مقدس کے معروف شہر جدہ کیلو اربعۃ عشر میں مقیم تھے، ابھی آپ سعودی عرب میں تھے کہ ان کے بیٹا عنایت الرحمن کا انتقال ہوگیا، وفات کی خبر بھی حضرت مولانا سیدالامین صاحبؒ نے بذریعۂ خط پہنچائی، خبرسن کر آپ بے ہوش ہوگئے تھے، اور مولانا شریعت اللہ صاحب جو مولانا کے دیرینہ ساتھی ہیں نے بتایا کہ ''میں نے آپ کے سر پر پانی ڈالا تو آپ ہوش میں آئے''۔ بعدازاں آپ وطن واپس ہوئے، اور اپنے لائق سسر کے ساتھ پھر سے تعلیمی وتدریسی حلقے میں شامل ہوگئے''۔

مولانا حسین احمد صاحب سے راقم الحروف کی خاص ملاقاتیں رہیں، جس وقت راقم دارالانصار

چاٹگام میں تدریسی خدمات انجام دے رہا تھا، اسی دوران مولانا سے چندمرتبہ تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں، جہاں تک راقم کا اندازہ ہے کہ مولانا ایک ذہن وفطین انسان ہونے کے علاوہ ملکی حالات پر خاصی نظر رکھنے والے عالم دین ہیں۔ اللہ تعالی آپ کی عمر دراز کرے، اور آئے دن قوم پر ان کا سایہ دیر تک باقی رکھے، آمین۔

مولوی احمد شاہ بانگونوی، منگڈوی:

مولوی احمد شاہ بن جناب صوفی عبدالکریم (درزی) جنوبی منگڈو کی مردم خیز بستی بانگونہ میں پیدا ہوئے، اس کا خاندان اسی علاقے میں بڑی شہرت کا حامل ہے، ان کے والد گرامی صوفی عبدالکریم صاحب نہایت پاک باز اور علم وعلماء دولت انسان ہیں۔

مولوی صاحب نے مکتب نشینی کے ساتھ ساتھ برمیز کی تعلیم حاصل کی، گاؤں کے اسکول سے چوتھی جماعت تک تعلیم حاصل کر کے منگڈو ہائی اسکول سے ساتویں تک تعلیم مکمل کی، بعد میں اسی علاقہ کی معروف درس گاہ مدرسہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں داخلہ لیا، جہاں سے اس نے جماعت سوم تک تعلیم پا کر حضرت مولانا سیدالامین سے لولگا لیا، چنانچہ اگلی تعلیم کے حوالے سے مولانا شبیر احمد صاحب کا بیان ملاحظہ کیجئے:

> ''مولوی احمد شاہ نے مکتب نشینی کے بعد ساتویں جماعت تک برمیز کی تعلیم حاصل کی، پھر جامعہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ منگڈو سے جماعت سوم تک نہایت حسن وخوبی اور بڑی محنت سے تعلیم حاصل کر کے اپنے شفیق استاد مولانا عبدالمنان صاحب سے مشورہ کیا کہ اعلیٰ تعلیم بالخصوص منطق، فلسفہ، تفسیر وحدیث کی تعلیم کے لئے کون سا شیخ اختیار کرنا چاہیئے؟ تو مولانا عبدالمنان صاحب نے اس کو مشورہ دیا کہ اس حوالے سے سیدھا منگنما جاؤ اور حضرت مولانا سیدالامین صاحب سے لولگا لو، وہاں ساری امیدیں پوری ہوسکتی ہیں، چنانچہ وہ حسب مشورہ منگنما آیا اور جامعہ اسلامیہ توحیدیہ میں داخل ہوگیا، اس نے حضرت مولانا سیدالامین صاحب سے تفسیر میں بیضاوی شریف اور حدیث میں بخاری شریف جیسی کتابیں پڑھیں، علاوہ ازیں سلم العلوم، ملا حسن، میبذی کا درس لیا، اور راقم الحروف سے ہدایہ ثالث، مشکوۃ شریف اوّل اور ترمذی شریف کامل جیسی کتابیں پڑھیں، مولوی احمد شاہ ایک خلیق، مودّب اور غیرت مند انسان ہونے کے ساتھ ایک جید عالم دین ہے، کم سخن، کشادہ چہرہ اور خوب رو بھی ہے، اساتذۂ کرام آپ کو بہت پیار کرتے رہے تھے''۔

مولوی احمد شاہ تعلیم سے فارغ ہوا تو حضرت مولانا سیدالامین صاحب نے اپنی لاڈلی اور پیاری

بیٹی محترمہ عائشہ سلمہا اللہ کا نکاح مولوی احمد شاہ سے دیا، اس شادی کے حوالے سے ایک دل چسپ قصہ ملاحظہ کیجئے، جسے مولانا شبیر احمد صاحب نے بڑی خوبی سے لکھا ہے:

> ''حضرت مولانا سیدالامین صاحب کی صاحب زادی عزیزہ عائشہ سلمہا اللہ تعالیٰ کو شادی دینے کی بات چلی تو بہت سے گھرانوں سے پیغامات آرہے تھے، مگر بعض جزئیات کے اعتبار سے کوئی گھرانہ بھی مناسب نہ ٹھہرا، بالآخر راقم السطور نے مشورہ دیا تھا کہ ہمارے شاگردوں میں ایک ہونہار، قابل اور مناسب شخص موجود ہے، جو ہر اعتبار سے موزون بھی، تو راقم نے مولوی احمد شاہ کا نام پیش کیا، یوں پورے گھرانے کے ہر ایک افراد نے لبیک وسعدیک سے نوازا، مولانا حسین احمد صاحب نے بڑی سعی جمیل سے اس شادی کی تمام کاروائیوں کو حسن وخوبی سے اتمام تک پہنچایا تھا''۔

مولوی احمد شاہ صاحب جید عالم دین ہے، اس نے اپنے سسر حضرت مولانا سیدالامین کے ساتھ جامعہ اسلامیہ پرامپورو میں چند سال تدریسی خدمات انجام دیں، اس کے بعد جامعہ اسلامیہ عالیہ شقدارفارہ اور جامعہ اسلامیہ اشرف العلوم نوراللہ فارہ میں درس دیتے رہے، اب کئی سال ہوگئے کہ اپنی آبائی بستی بانگونہ سے منتقل ہوکر شقدارفارہ آگیا ہے، جامعہ شقدارفارہ میں ترمذی شریف کے علاوہ دیگر کتابوں کا درس دیتا رہا ہے، اس کے تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی حیات میں برکت دے ۔آمین یارب العالمین۔

مولوی محمد عمران منگنماوی، منگڈوی:

صاحب زادۂ گرامی مولوی محمد عمران کی پیدائش اس کی آبائی بستی منگنما میں ہوئی، اس کا بچپن اور لڑکپن اور ابتدائی عمر بڑی ناز پروردگی سے گزری، کچھ بڑے ہوئے تو مکتب نشینی ہوئی اور ساتھ ساتھ سرکاری پرائمری اسکول میں بھی بھرتی کرایا گیا، اس کے بعد اپنے نامور والد کے سایۂ عاطفت میں باضابطہ دینی تعلیم کا آغاز کیا، ان سارے حالات پر مشتمل اس کے لائق بہنوی حضرت مولانا شبیر احمد صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حضرت شیخ مولانا سید الامین صاحب نور اللہ مرقدہ کا تیسرا صاحب زادہ مولوی محمد عمران کی پرورش بڑی ناز ونعمت میں ہوئی، اس نے مکتب میں ابتدائی دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ برمیز کی چوتھی جماعت تک پڑھی، اور بڑی قلیل مدت میں مکتب کی تعلیم سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد اپنے والد بزرگوار کے سایۂ لطف و عاطفت میں باضابطہ دینی تعلیم کا آغاز کیا، اس کی ذہانت وفطانت کا شہرہ بچپن سے ہو چکا تھا، اس کی آواز بڑی دل کش اور بے مثال تھی، اس کو بچپن سے نعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ترنم سے پڑھنے کا ذوق تھا، مجمع میں جبھی نعت رسول ﷺ پڑھتا، لوگ اس کی دل کش آواز سے مسحور ومخمور ہو جاتے تھے، ہر طرف سے واہ واہ اور شاباش شاباش کی آواز بلند ہو جاتی تھی، اس نے اپنے والد بزرگوار کے سایۂ عاطفت میں مشکوۃ وجلالین یعنی جماعت اولی تک کی تعلیم پائی تھی، اپنی جماعت میں کتابوں کی تکرار وہ کرتا تھا اور ہر سال امتحان میں درجۂ اول کے نمبرات حاصل کرتا تھا، اس نے اپنے علاقے کے جید علماء اور جلیل القدر اساتذۂ کرام کی ترتیب حاصل کی، اس کے ہر ایک اساتذہ اور رفقاء اس سے خوش تھے، سارے کے سارے اس کی سنجیدگی، خوش باشی اور ملنساری کی تعریف کیا کرتے تھے''۔

جماعت اولی تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد مولوی عمران نے اپنے والد گرامی کے ساتھ رنگون کا سفر کیا، اس کے والد بزرگوار تو رنگون سے واپس وطن لوٹ آئے، لیکن اس نے مدرسہ صوفیہ رنگون میں داخلہ لیا، یوں اس علمی اور ثقافتی دار العلوم سے اس نے دورۂ حدیث کی جملہ کتابیں جید علماء سے

پڑھ کر سند فراغت حاصل کر لی، یہ ساری تفصیلات بھی مولانا شبیر احمد کی تحریر میں ملاحظہ کیجئے:

''حضرت مولانا سید الامین صاحب کو ایک قومی مسئلہ کے حوالے سے رنگون جانا پڑا تو حضرت نے اپنے ساتھ مولوی عمران کو بھی لے گیا، اس زمانے میں جامعہ صوفیہ رنگون میں حضرت مولانا شمش الضحی صاحب مظاہری اور حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد زکریا بڑاگو جربیلی ارکانی (حضرت مولانا زکریا صاحب کے تلمیذ خاص) بھی جامعہ صوفیہ میں تھے۔ مولانا زکریا صاحب نے صاحب زادۂ گرامی مولوی محمد عمران کی شائستگی، سلیقہ، ذہانت وفطانت سے خوش ہو کر حضرت مولانا سید الامین صاحب سے فرمایا کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ آپ مولوی محمد عمران کو ہمارے حوالے کر دیں، وہ یہاں جامعہ صوفیہ سے دورۂ حدیث پڑھ کر سند فراغت حاصل کرے گا تو یہ ہمارے لئے باعث فخر ہوگا، اس سے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ برمیز ماحول میں رہنے کی وجہ سے اسے ملکی زبان ''برمیز'' پر قدرت حاصل ہو جائے گی، جو وقت کی ایک اہم ضرورت بھی ہے، یوں حضرت مولانا سید الامین صاحب نے مولانا محمد زکریا صاحب کی عرض قبول کر لی، اور مولوی محمد عمران کو رنگون چھوڑ کر آپ وطن واپس آ گئے تھے۔ یوں مولوی عمران نے جامعہ صوفیہ سے سند فراغت حاصل کر لی''۔

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب مولوی محمد عمران کی خوش نوائی کی بہت کھل کر تعریف کی ہے، اور ساتھ ساتھ علم التجوید والقرأت، علم المنطق والحکمت میں اس کی مہارت کی بڑے بلند الفاظ کے ذریعے تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

''مولوی محمد عمران کو علم التجوید والقرآت کا خاص ذوق اور خاصا ملکہ حاصل تھا، یوں وہ اچھا قاری القرآن بھی ہے، ذہین وفطین اور عقل رسا کا مالک ہے، شروع ہی سے اس کو علم المنطق والحکمت سے خاصی دلچسپی رہی تھی، پڑھائی کے دوران وہ بڑی قلیل مدت میں قاری القرآن اور ایک منطقی وفلسفی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔

فراغت تعلیم کے بعد مولوی عمران ابھی بھی رنگون میں تھا کہ اس زمانے میں مصر میں

ایک محفل قرآت منعقد ہونے جا رہا تھا، جس میں عالم اسلام سمیت دنیا کے دیگر علاقوں اور خطوں سے قراء حاضر ہو رہے تھے، رنگون والوں کی درخواست پر برما سے تین قراء کی شمولیت کی منظوری ہوئی تو رنگون والوں نے رنگون کے علاوہ برما کے دیگر علاقوں سے (جن میں منڈلائی، مولمین اور مکٹیلا وغیرہ مقامات قابل ذکر ہیں) جید قراء کو رنگون بلایا گیا تھا، اور امتحانات کے ذریعے ان میں سے قراء کا انتخاب مکمل ہوا، جن میں مولوی محمد عمران سرفہرست تھا، یوں اس نے مصر کی مجلس مسابقہ میں شرکت کی، اور داد و انعام حاصل کر کے رنگون واپس آیا۔

مولوی محمد عمران ابھی رنگون میں زیر تعلیم تھا کہ اس زمانے میں اس کا بڑا بھائی ڈاکٹر دین محمد صاحب جامعہ خرطوم (سوڈان) میں زیر تعلیم تھے، جن کی کوشش سے مولوی محمد عمران سوڈان پہنچا، اور جامعہ خرطوم میں داخلہ لیا، جہاں دو سال پڑھ کر ماجسٹر کی سند حاصل کر لی۔

اس کے بعد دونوں بھائی عمرہ کی نیت سے حجاز مقدس پہنچے، ڈاکٹر صاحب تو واپس سوڈان چلے گئے، لیکن مولوی محمد عمران نے سرزمین مقدس مکہ مکرمہ میں سکونت اختیار کر لی، جہاں ان کی شادی خانہ آبادی ہوئی، آج کل بڑے سکون و اطمینان سے یہاں مقیم ہے"۔

ارکان اور اس کے متعلق بعض نمایاں تاریخی واقعات

۲۶۶۶ق م ۔ سے دھنووتی ردھنیاودی پہلے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۸۰۰ق م تک جاری تھا۔

۸۲۵ق م ۔ سے دھنووتی ردھنیاودی دوسرے عہد حکومت، جس کا سلسلہ ۷۸۸ء تک جاری تھا۔

۷۸۸ء ۔ ویسالی دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۰۱۸ء تک جاری تھا۔

۹۵۷ء ۔ ارکانی راجا چولاٹنگ چندرا کے زمانے میں ارکان پر منگولوں کا حملہ، اور ارکان کی تاخت و تاراج۔

۱۰۱۸ء ۔ پن سا پہلے دور حکومت کی ابتداء، جو ۱۱۰۳ء میں اپنی انتہاء کو پہنچی تھی۔

۱۱۰۳ء ۔ پارن دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۶۷ء تک جاری رہا۔

۱۱۶۷ء ۔ کریٹ دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۱۸۰ء تک جاری تھا۔

۱۱۸۰ء ۔ پن سا دوسرے دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۲۳۷ء تک جاری تھا۔

۱۲۳۷ء ۔ لنگریٹ دور حکومت کا آغاز، جس کا سلسلہ ۱۴۰۴ء تک جاری تھا۔

۱۴۰۴ء ۔ برمی غاصب راجا "من کھاؤن" کا ارکان پر حملہ، نرامیخلا کی ارکان کی سلطنت سے بے دخلی۔

۱۴۰۴ء ۔ ارکانی باشاہ نرامیخلا (محمد سلیمان شاہ رمن سامون) کا ترک وطن یا جلا وطن۔

۱۴۳۰ء ۔ سلیمان شاہ کی ارکان واپسی اور مرو کو حکومت کی بنیاد، جس کا سلسلہ ۱۷۸۴ء تک جاری تھا۔

۱۶۶۰ء ۔ بدنصیب مغل شہزادہ شجاع کی ارکان میں آمد، بعد میں اس کا مع اہل و عیال قتل۔

۱۶۶۶ء ۔ مگھ اور پرتگیز لٹیروں کی وجہ سے مختلف آلام و پریشانیاں۔

۱۷۱۰ء ۔ ارکان میں خانہ جنگی، اور وسیع پیمانے میں نقصانات۔

۱۷۸۴ء ۔ برمی غاصب راجا بودھو پھیا کا ارکان پر حملہ و قبضہ، اور اس کی دہشت گردی، اور قتل عام۔

۱۷۹۶ء ۔ تیس ہزار ارکانیوں (مگھ رمسلمانوں) کا ترک وطن اور بنگال میں ان کی پناہ۔

۱۷۹۸ء ۔ جنرل علیہ بائنگ رعلی بھائی (مسلمان) وغیرہ کی برمی غاصبوں سے آزادی کی جدوجہد۔

۱۸۱۱ء ۔ سین فیا (KINGBERING) اور مسلم لیڈروں کی قیادت میں ہونے والے انقلاب کی ناکامی۔

۱۸۲۵ء ۔ پہلی انگلو برمن جنگ۔

۱۸۲۶ ۔ ارکان پر برطانیہ کا قبضہ۔

۱۹۳۰ء ۔ برمی مسلم تاجر" اوباو " کے تعاون سے برما مسلم سوسائٹی کا قیام۔

۱۹۳۰ء ۔ مگھ ڈاکو (بورینگ اونگ) اور اس کے حواریوں کی بربریت اور مسلمانوں کی بڑے پیمانے سے ہجرت۔

۱۹۳۰ء ۔ وسطی، تحتی برما اور ارکان میں مسلمانوں کا قتل عام اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۳۳ء ۔ روہنگیا جمعیت علمائے اسلام ارکان کی بنیاد۔

۱۹۳۶ء ۔ برطانوی ہند سے برما کی انتظامی علیحدگی، اور ملک بھر سے مسلمانوں کا کریک ڈاؤن۔

۱۹۴۲ء ۔ رنگون پر جاپانیوں کا قبضہ۔

۱۹۴۲ء ۔ ارکانی مسلمانوں کا تاریخی قتل عام، اور بڑے پیمانے پر ان کی ہجرت۔

۱۹۴۲ء ۔ منگڈو، بوسیدنگ اور راسیدنگ پر مشتمل تاریخی ''مسلم ریاست'' کا قیام۔

۱۹۴۵ء ۔ ارکان میں برطانویوں کی دوبارہ واپسی۔

۱۹۴۵ء ۔ ''برما مسلم جنرل کونسل'' نامی تنظیم کا قیام۔

۱۹۴۵ء ۔ مسٹر عبدالرزاق کی صدارت میں برما مسلم کانگرس کا قیام۔

۱۹۴۶ء ۔ مسٹر عبدالرزاق کی سربراہی میں پمنا رپیومنا مسلم کانفرس کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء ۔ سازش پر مبنی بدنام زمانہ ''پیلونگ کانفرنس'' کا انعقاد۔

۱۹۴۷ء ۔ برمی قانون ساز اسمبلی کے انتخابات۔ جس میں ارکانی مسلمانوں کو قانونی طور پر نمائندگی ملی تھی۔

۱۹۴۷ء ۔ محمد جعفر حسین قوال کی زیر قیادت ''جہاد کونسل'' کی تشکیل اور ظالموں کے خلاف اعلان جہاد۔

۱۹۴۸ء ۔ برطانیہ سے برما یا برمیوں کو حصول آزادی۔

۱۹۴۸ء ۔ محمد قاسم بن عطاء الدین کی قیادت میں ''مجاہد پارٹی'' کا قیام۔

۱۹۴۹ء ۔ مولانا مظفر احمد کی زیر صدارت انجمن مہاجرین ارکان کا قیام۔

۱۹۵۰ء ۔ بی ٹی ایف کی بربریت، ہزاروں مسلمانوں کی شہادت اور ہزاروں کی ہجرت۔

۱۹۵۰ء ۔ بانیٔ تحریک آزادیٔ ارکان محمد جعفر حسین قوال کی افسوسناک شہادت۔

۱۹۵۱ء ۔ آزاد برما میں قومی اسمبلی کے پہلے عام انتخابات۔

۱۹۵۴ء ۔ ارکان میں بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۵۶ء ۔ برمی قومی اسمبلی کے دوسرے انتخابات۔

۱۹۵۹ء ۔ ارکان میں اور ایک مرتبہ بنگالی مگھوں کا دخول عام، مسلم بستیوں پر قبضہ، مسلمان ترک وطن پر مجبور۔

۱۹۶۰ء ۔ مایو فرنٹیر اڈمنسٹریشن کا نفاذ۔

۱۹۶۱ء ۔ برمی قومی اسمبلی کے تیسرے عام انتخابات۔

۱۹۶۱ء ۔ راغب اللہ مرحوم وغیرہ کی قیادت میں ۲۹۰ سے زائد مجاہدین کا برمی فوجی قیادت کے سامنے سارنڈر۔

۱۹۶۲ء ۔ جمہوری آئین کی معطلی، اور اقتدار پر جنرل نے ون کی قیادت میں برمی فوج کا مکمل قبضہ۔

۱۹۶۲ء ۔ برما میں شوشل ازم کا نفاذ۔

۱۹۶۳ء ۔ نے ون کے نام نہاد قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۶۴ء ۔ روہنگیا انڈیپنڈنٹ فورسس (RIF) کی تشکیل۔

۱۹۶۶ء ۔ مگھ شرپسندوں کی شرپسندی اور برمی بربروں کی بربریت کی وجہ سے مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۶۶ء ۔ محمد جعفر ثانی کی قیادت میں ارکان آزاد فوج (RNLP) کی تشکیل۔

۱۹۷۳ء ۔ نے ون کی قیادت میں برمی فوج اور اس کے لالے پالے غنڈوں کے مظالم، اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۳ء ۔ محمد جعفر حبیب (رحمہ اللہ) کی زیر قیادت روہنگیا فدائین محاذ (RPF) کی تشکیل اور اعلان۔

۱۹۷۵ء ۔ جنرل نے ون کی ایماء پر مسلمانوں کی وسیع پیمانے میں گرفتاریاں اور مسلمانوں کی ہجرت۔

۱۹۷۵ء ۔ ارکان ہسٹریکل سوسائٹی (AHS) کا قیام۔

۱۹۷۷ء ۔ روہنگیا مسلم طلبہ تنظیم ''رابطۃ الطلاب المسلمین الروہانجیین کا قیام۔

۱۹۷۸ء ۔ نے ون کے نام نہاد برمی قومی اسمبلی کے انتخابات۔

۱۹۷۸ء ۔ ناگامن آپریشن، برمیوں اور مگھوں کی غارت گری، مسلمانوں کی عام گرفتاریاں، قتل عام اور ہجرت۔

۱۹۷۹ء ۔ روہنگیا جمعیت علماء (مسلح) کی زیر زمین جد وجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء ۔ روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (RSO) کی تشکیل۔

۱۹۸۲ء ۔ مولانا عبدالقدوس مجاہد کی امارت میں حرکۃ الجہاد الاسلامی نامی تنظیم کی جد وجہد کا آغاز۔

۱۹۸۲ء ۔ نے ون قومی اسمبلی کے اور ایک نام نہاد انتخابات۔

۱۹۸۶ء ۔ ارکان روہنگیا اسلامک فرنٹ (ARIF) کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء ۔ مولانا عبدالحمید مجاہد کی زیر امارت ''روہنگیا اسلامی محاذ'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۶ء ۔ روہنگیا طلبہ تنظیم، اتحاد الطلاب المسلمین ارکان۔ برما۔ (ITM) کی بنیاد۔

۱۹۸۸ء ۔ جنرل نیون کی اقتدار سے ہمیشہ کے لئے چھٹی، اور سین لوین کی گدی نشینی۔

۱۹۸۸ء ۔ ڈاکٹر مونگ مونگ کی چند دنوں والی حکومت۔

۱۹۸۸ء ۔ جنرل سا مونگ کی قیادت میں اقتدار پر فوج کا دوبارہ قبضہ۔

۱۹۸۸ء ۔ مولانا محمد حنیف راغب ارکانی کی قیادت میں ''اتحاد المجاہدین'' نامی تنظیم کی تشکیل۔

۱۹۸۸ء ۔ روہنگیا لیبریشن آرگنائزیشن (RLO) کا اعلان۔

۱۹۹۰ ۔ ارکانیوں کی نمائندہ جماعت ''نیشنل ڈیموکریٹک پارٹی فار ہیومن رائٹ (NDPHR) کا قیام۔

۱۹۹۰ء ۔ نام نہاد انتخابات/اقتدار پر فوج کا قبضہ، جس کا سلسلہ تان شوے سے لے کر اب تا جاری ہے۔

۱۹۹۱ء ۔ روہنگیا مسلمانوں پر مظالم اور ان کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔

۱۹۹۱ ۔ مسلمانوں کا قتل عام، وسیع پیمانے میں مسلمانوں کی گرفتاریاں، اور ان کی بڑے پیمانے پر ہجرت۔

۱۹۹۵ء ۔ روہنگیا نشنل الائنس (RNA) نامی الائنس کی تشکیل۔

۱۹۹۸ء ۔ ارکان روہنگیا نیشنل آرگنائزیشن (ARNO) کی تشکیل اور اعلان۔

۲۰۱۱ء ۔ ارکان روہنگیا یونین (ARU) کی بنیاد اور اعلان۔

۲۰۱۲ء ۔ مسلمانوں کا قتل عام، ہزوروں شہادت، ہزاروں ماں بہنوں کی عصمت دری، اور لاکھوں کی ہجرت۔